فکرِ اقبال

کے بعض اہم پہلو

جگن ناتھ آزاد

شاہین بُک اسٹال اینڈ پبلیشرز
بڈشاہ چوک، سرینگر (کشمیر)

فکرِ اقبال کے

بعض اہم پہلو

جگن ناتھ آزاد

پبلشرز
شاہین بکسٹال اینڈ پبلشرز
امیراکدل سری نگر کشمیر

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں۔

بارِ اوّل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تعداد ایک ہزار

در ماہِ اگست ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۹۸۲ء

قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ساٹھ روپے

کتابت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (ایم۔ خانم)

مطبوعہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کلر پرنٹنگ پریس دہلی

ناشر

شاہین بک اسٹال اینڈ پبلشرز

امیرا کدل، سری نگر کشمیر

ہماری نئی کتابیں

جدید تنقیدی زاویئے
ڈاکٹر عزیز احمد

جدید شاعری کے نئے چراغ
ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

یوپی میں [illegible]
اقبال [illegible]

اردو [illegible]
[illegible]

رابندر ناتھ ٹیگور کا
رومانوی ذہن
ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

زخمی پنچھی
شہناز رشید

طریقہ تعلیم
سوشل سٹڈی
محمد مظفر

شعور اور تنقیدی شعور
ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

اقبال ادیبوں کی نظر میں
ظفر اقبال

طریقہ
تعلیم سائنس
محمد مظفر

ہماری نئی شاعری
[illegible] عزیز احمد

شمع زندگی
شرت
چند

مناظر قدرت کی عکاسی
ڈاکٹر عزیز احمد

ہماری اور قومی انقلابی شاعری
ڈاکٹر عزیز احمد

سول ڈسٹری بیوٹرز
شیخ غلام محمد اینڈ سنز بکسیلرز مائسمہ بازار سرینگر کشمیر

ہماری تازہ مطبوعات

ناٹک کتھا
صاحبزادہ محمد عمر

تاریخ عہد ظفر شاہی
محمد الدین فوق

کشمیر میں آبپاشی
عبدالرحمن میر سرور

تواریخ کشمیر مع جغرافیہ کشمیر

مجموعہ کلام اقبال معہ شرح
تصویر درد و شکوہ جواب شکوہ

علامہ اقبال کے آخری دو سال
عاشق حسین بٹالوی

ہے
چاند اجنبی
ڈاکٹر شکیل الرحمن

غالب ادیبوں کی نظر میں
ظفر اقبال

لا = انسان
ن. م. راشد

نفسیات اور اصول تعلیم

سول ڈسٹری بیوٹرز
شیخ غلام محمد اینڈ سنز بکسیلرز
مائیسمہ بازار سرینگر کشمیر
فون نمبر 72206

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۱	دیباچہ	۹
۲	جشن اقبال	۱۹
۳	اقبال عالمی کانگریس لاہور	۳۲
۴	اقبال بین الاقوامی کانگریس	۴۳
۵	جگن ناتھ آزاد کا سفر پاکستان	۱۰۵
۶	اقبال کی یاد علی سردار جعفری کے سفر پاکستان کے تاثرات	۱۲۲
۷	اقبال اور نسخہ کیمیا	۱۲۵
۸	فکر اقبال کے بنیادی عناصر	۱۲۹

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۹	اقبال اور عشق حسین	۱۶۲
۱۰	اقبال کی اجتہادی کاوشیں	۱۵۵
۱۱	علامہ اقبال کی کتب	۱۶۹
۱۲	علامہ اقبال کے کلام میں نظریہ نظم	۱۷۷
۱۳	اقبال کا سیاسی فلسفہ	۱۸۰
۱۴	جاوید نامہ کے معارف و بصائر	۱۸۸
۱۵	پیغمبری کیا ہے	۱۹۳
۱۶	شوق کیا ہے	۱۹۴
۱۷	چاند کی ایک غارِ عمیق	۱۹۵
۱۸	مسافر کے تاثرات	۱۹۵
۱۹	عارف ہندی یا جہاں دوست سے ملاقات	۱۹۶
۲۰	تصور ریاست اقبال کی نظر میں	۲۱۰
۲۱	اقبال حرکت و عمل کا پیامبر	۲۲۰
۲۲	اقبال اور جمہوریت	۲۲۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۲۳	اقبال کا تصورِ عشق	۲۳۲
۲۴	علامہ اقبال کا نظریۂ قانون	۲۴۱
۲۵	فکرِ اقبال کی روشنی میں	۲۴۶
۲۶	اقبال اور عقلیت پسندی	۲۵۶
۲۷	اقبال کا فلسفہ خودی	۲۸۱
۲۸	علامہ اقبال اور خودی	۲۸۵
۲۹	اقبال کا نظریہ خودی	۲۹۴
۳۰	مسجدِ قرطبہ	۲۹۹
۳۱	اقبال کی ایک نظم	۳۰۵
۳۲	امیر خسرو اور اقبال کی ہم زمین غزلیں	۳۱۱
۳۳	اقبال کا فلسفہ دید و نظر	۳۲۰
۳۴	نقدِ اقبال کا تجزیاتی مطالعہ	۳۵۴
۳۵	مسجدِ قرطبہ	۳۷۳
۳۶	کائنات کا تکوینی نظام	۳۸۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۳۷	مسجد قرطبہ کا جلال و جمال	۳۸۵
۳۸	نظریہ مرد مومن	۳۸۸
۳۹	مسلم ہسپانیہ کی عظمت و شکوہ	۳۸۹
۴۰	فنی تجزیہ	۴۰۰
۴۱	مجموعی قدر و قیمت	۴۱۰

سکولوں اور کالجوں کی کورس کتابیں

لائیبریری کتابیں - اور ہر قسم کی سٹیشنری

کیلئے

سٹی بک سنٹر شاپ نمبر 203

نالہ مار روڈ بازار مسجد بہوری کدل سرینگر

اور

جے۔ کے بک شاپ جمالٹہ چوک

سرینگر پر تشریف لادیں

دیباچہ

ہم ہندوستانیوں کو یہ حقیقت تسلیم کرنے میں تامّل نہ ہونا چاہیئے کہ تقسیمِ ہند کے بعد ہم نے اقبال اور کلامِ اقبال سے خاصی بے اعتنائی برتی۔ جہاں تک میرا خیال ہے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک اقبال کے متعلق صِرف دو یا تین کتابیں ہندوستان میں شائع ہوئیں۔

غالباً یہ بات بھی غلط نہ ہوگی ۱۹۵۲ء سے قبل جب کہ راقم التحریر کو جموں و کشمیر یونیورسٹی سے اقبال پر توسیعی لیکچروں کی دعوت ملی اقبال کے موضوع پر جموں و کشمیر یونیورسٹی میں کوئی توسیعی لیکچر نہیں دیا گیا۔

۱۹۷۱-۷۲ء میں اقبال کی تاریخِ ولادت کا مسئلہ عاشقانِ کلامِ اقبال کے سامنے آیا۔ پاکستان میں وزیرِ اعظم جنابِ ذوالفقار علی بھٹو نے اِس مسئلے کو سُلجھانے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی۔ ہندوستان میں یہ کام انفرادی طور پر شروع ہوا۔ اور اِس کام کا طول و عرض زیادہ تر انگریزی اخبارات میں بحث مباحثے تک محدود رہا۔ ابتداء میں "ہندوستان ٹائمز" (نئی دہلی)

نے اس موضوع پر راقم التحریر کا ایک مقالہ ۸ افروری ۷۳ء کے شمارے میں شائع کیا۔ اس کے بعد یہ بحث ایک پھلجھڑی کی صورت میں چل نکلی۔ لیکن ہندوستان ٹائمز، اسٹیٹسمین، ٹائمز آف انڈیا اور انڈین ایکسپریس میں خطوط کی اشاعت سے آگے نہ بڑھی۔

آخر ۱۴ فروری ۱۹۷۴ء کو پاکستان میں وزیر اعظم پاکستان کی قائم کردہ کمیٹی نے یہ فیصلہ دیا کہ اقبال کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے اور یہ وہی تاریخ تھی جس کی تائید میں ایک برس قبل "ہندوستان ٹائمز" میں راقم التحریر کا مقالہ شائع ہو چکا تھا اور جس تاریخ کا ذکر اس سے قبل مس اینی میری شمل اور فقیر سید وحید الدین کر چکے تھے۔

لیکن اس بحث مباحثے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہندوستان میں ایک بار پھر عوام و خواص کا خیال اقبال کی جانب منتقل ہوا اور اہل قلم حضرات نے ایک بار پھر اقبال کو اپنی توجہ کا مستحق سمجھا۔

دلدادگانِ کلام اقبال تو ایسے موقعے کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ علی سردار جعفری کی کوششوں سے کل ہند اقبال صدی تقاریب کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کل ہند کمیٹی کے تعاون سے ملک کے مختلف حصوں میں ریاستی اور مقامی اقبال کمیٹیاں قائم ہوئیں جن کے زیر اہتمام اقبال پر لیکچروں اور سیمناروں کی ابتدا ہوئی۔ ان کمیٹیوں کے

علاوہ یونی ورسیٹیوں اور دوسرے تہذیبی اداروں نے بھی اِس سلسلے میں خاصا کام کیا اور مُلک میں جا بجا اقبال پر مباحثے، مذاکرے اور سیمینار منعقد ہونے لگے۔ حیدر آباد میں اِس سلسلے میں دو بڑے سیمینار ہوئے ایک اقبال اکیڈیمی کی طرف سے اور دوسرا اقبال کمیٹی کے زیرِ اہتمام۔ علی گڈھ مُسلم یونی ورسٹی، علی گڈھ، کشمیر یونی ورسٹی سری نگر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی نئی دہلی، جموں یونی ورسٹی جموں، میسور یونی ورسٹی میسور، اُتر پردیش اُردو اکیڈیمی، لکھنؤ، اقبال کمیٹی پٹنہ، اقبال کمیٹی لکھنؤ، اقبال کمیٹی ناگپور، اقبال کمیٹی الہ آباد، مدھیہ پردیش اُردو اکیڈیمی بھوپال، اقبال کمیٹی تمل ناڈو مدراس، اقبال کمیٹی کلکتہ، اسلامیہ کالج وشیم باڑی، انجمن ترقی اُردو بیدر اور کرناٹک آرٹس کالج وغیرہ نے بڑے وسیع پیمانے پر اقبال سیمناروں کا انعقاد کیا۔ کلچرل اکیڈیمی جموں و کشمیر نے سری نگر اور جموں میں الگ الگ سیمینار منعقد کیے اور اپنے مجلہ "شیرازہ" کے جو کئی زبانوں میں چھپتا ہے اقبال نمبر نکالے۔ جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی اور اقبال کمیٹی حیدر آباد نے اُن مقالات کے مجموعے بھی کتابی صورت میں شائع کیے جو اِن سیمیناروں میں پڑھے گئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی اور کلچرل اکیڈیمی سری نگر کے مجموعے زیرِ طباعت ہیں۔

جناب اندر کمار گجرال مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات

نے اپنے رفیقِ کار جنابِ انور جمال قدوائی کے ساتھ صلاح و مشورہ کے بعد وزارتِ اطلاعات و نشریات کے ہر شعبے کو اقبال صدی تقاریب کے ساتھ وابستہ کیا۔ اِس ضمن میں وزارت کا پہلا کام اقبال نمائش کا انعقاد تھا جو اس وقت تک سری نگر، دہلی (تین بار)... علی گڑھ (دو بار) حیدر آباد، بھوپال، مدراس، بمبئی، پٹنہ، اجمیر شریف، کوئم بار ٹی جموں، پونہ، چنڈی گڑھ اور متعدد اور شہروں میں دکھائی جا چکی ہے۔

اقبال پر فلم بنانے کا کام فلمز ڈویژن کے سپرد ہوا۔ یہ فلم ہندوستان کے اکثر و بیشتر سینما گھروں میں دکھائی جا چکی ہے۔ اور اس کی ایک کاپی آل انڈیا اقبال صدی تقاریب کمیٹی کی طرف سے پاکستان اقبال صدی تقاریب کمیٹی کو بھی پیش کی جا چکی ہے۔ پبلیکیشنز ڈویژن نے اقبال پر دو کتابیں شائع کرنے کا کام اپنے ذمّے لیا ان میں سے ایک "مرقعِ اقبال" شائع ہو چکی ہے۔ اور دوسری زیرِ طباعت ہے۔ ڈی۔اے۔وی۔پی اور فوٹو ڈویژن اقبال نمائش کو خوب سے خوب تر بنانے میں کوشاں رہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے اقبال پر تقریروں، مباحثوں اور لیکچروں کے کئی سلسلے چلے۔ اطلاعات کے سانگ اینڈ ڈرامہ ڈویژن نے اقبال کے متعلق ایک ساؤنڈ اینڈ لائٹ ڈرامے پر کام شروع کیا ہے یہ ڈرامہ عن قریب مُلک کے مختلف حصّوں میں دکھایا جائے گا۔ اِس ضمن میں حکومتِ جموّں و کشمیر کا ایک کارنامہ تاریخِ ادب میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ اور وہ ہے کشمیر یونی ورسٹی سری نگر

بیں اقبال چیئر کا قیام۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو غالباً دنیا بھر کی یونی ورسٹیوں میں کشمیر یونی ورسٹی سری نگر ہی میں سب سے پہلے اقبال چیئر قائم ہوئی۔ اس چیئر پر اردو کے مشہور نقاد اور ماہرِ اقبالیات پروفیسر آل احمد سرور کا تقرر ہوا۔ جو بڑی باقاعدگی سے یونی ورسٹی میں اقبال سیمینار منعقد کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست کے مختلف کالجوں اور علمی اور ادبی اداروں میں بھی اقبال چیئر کی بدولت اقبالیات کا کام پہلے سے تیز ہو گیا ہے۔

اسی دوران میں کُل ہند اقبال صدی تقاریب کمیٹی کے پہلے صدر جناب درگا پرساد دھر کا انتقال ہو گیا جس سے کمیٹی کے کام کو خاصا دھچکا لگا۔ اس کے بعد کمیٹی کے سرپرست جناب فخر الدین علی احمد صدر جمہوریۂ ہند اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ کمیٹی کے لئے یہ سنگ آمد و سخت آمد والا معاملہ تھا لیکن کمیٹی کی روحِ رواں علی سردار جعفری کے عزم و استقلال میں فرق نہ آیا۔ اِدھر جناب اندر کمار گجرال نے جو اس وقت تک روس میں ہندوستان کے سفیر مقرر ہو چکے تھے ہندوستان آکر ہم لوگوں کے حوصلے بڑھائے اور اقبال کمیٹی کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔

جناب ودیا شنکر آئی سی ایس، ڈاکٹر بھرت رام (دہلی کلاتھ ملز) اور جناب بی بی ساہنی پوری تن دہی کے ساتھ اقبال صدی تقاریب کو کامیاب بنانے میں منہمک رہے چنانچہ وہ خواب جو عاشقانِ اقبال نے کچھ

مُدّت پہلے دیکھا تھا شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آنے لگا۔

گویا ہندوستان میں اقبال پر ۱۹۴۷ء کے بعد کام از سرِ نو شروع ہُوا۔ لیکن پاکستان میں اِس عظیم شاعر اور مفکّر پر مسلسل کام ہوتا رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان رسل و رسائل کی زیادہ آسانیاں موجود نہ ہونے کے باعث ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ پاکستان میں اقبال پر کام کی نوعیت اَور رفتارِ ترقّی کیا ہے۔ غالباً اہلِ پاکستان بھی ہندوستان میں اقبال پر کام کی نوعیت اَور رفتارِ ترقی سے بڑی حد تک بے خبر ہیں۔

۲۱۔ اپریل ۷۷ء کو شائع ہونے والے پاکستان ٹائمز (راولپنڈی) کے علامہ اقبال سپلیمنٹ میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے اپنے ایک گراں قدر مقالے میں اِس بات کا خاص طور سے ذکر کیا کہ اُنھیں اُس کام کا صحیح طور سے علم نہیں ہے جو ہندوستان میں اقبال پر ہو رہا ہے۔

ہندوستان اَور پاکستان کے علمی اور ادبی حلقوں کا ایک دوسرے کے کام سے اَور بالخصوص اقبالیات پر کام سے متعلّق (جو ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ میراث ہے) بے خبر رہنا کوئی مستحسن بات نہیں۔ زیرِ نظر کتاب اِس دو طرفی تصویر کے ایک پہلو کو اُجاگر کرنے کی ایک ابتدائی کوشش ہے۔ اقبال پر پاکستان میں جو کام ہو رہا ہے اس کی ایک جھلک اِس کتاب "فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو" میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں نے اِس جلد کو "جلد اوّل" کا نام دیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اگر ہندوستان

کے شائقینِ کلامِ اقبال نے اِس کام کو پسند کیا اور ناشرین نے تعاون کیا تو میں اِسی موضوع پر اِس کتاب کی دوسری جلد بہت جلد اہلِ نظر حضرات کے سامنے پیش کر سکوں گا۔

یہاں اِس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ ممکن ہے ہم میں سے اکثر حضرات مصنفینِ پاکستان کے اِن مقالات میں مندرج خیالات و افکار سے متفق نہ ہوں لیکن یہ کوئی ایسی وجہ نہیں کہ ہم اِن مصنفین کے افکار پر غور کرنے سے انکار کر دیں۔ اقبال ایک شاعر فلسفی یا فلسفی شاعر تھے۔ اور فلسفے میں اختلافِ نظریات کی ہر قدم پر گنجائش ہوتی ہے۔ اقبال نے خود The Reconstruction of Religious Thought in Islam میں لکھا ہے کہ فلسفے میں قطعیت نام کی کوئی شے نہیں۔

دوسری بات اِس ضمن میں یہ ہے کہ اقبال کے کلام کا خاصا حصہ سیاسیات سے متعلق ہے اور فلسفے کی طرح سیاسیات بھی ہمیشہ سے ایک متنازعٌ فیہ موضوع چلا آ رہا ہے اس لئے اقبال کے کسی سیاسی نظریے کی تاویل میں بھی اِختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ یہ سلسلہ بحث و تمحیص کے ذریعے سے آگے چل سکتا ہے اور ادب میں اِس کی اجازت ہے۔ ہاں جس چیز کی اجازت نہیں ہے وہ کج بحثی ہے اور اقبال یا کسی بھی علمی یا ادبی موضوع پر بات چیت کرتے وقت ہمیں اس سے گریز لازم ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے اِس محفل میں شریک ہونے والے مقالہ نگار حضرات کے بعض خیالات سے مجھے اتفاق ہے اور بعض خیالات سے میں متفق

نہیں ہوں۔ لیکن جن خیالات سے میں متفق نہیں ان کی اہمیت سے مجھے انکار
نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ان کے متعلق بحث و مباحثے کا سلسلہ جاری
رہے اس لیے نہیں کہ اتفاقِ رائے کی صورت نکل سکے بلکہ اس لیے کہ دماغوں کی
کھڑکیاں کھلی رہیں اور فکر و نظر کے قافلے آگے بڑھتے رہیں۔

(۲)

زیرِ نظر کتاب میں جناب مشیر حسین ناظم کا ایک مقالہ شامل ہے جس کا
عنوان ہے "علامہ اقبال کی کتب"۔ ممکن ہے کوئی صاحب یہ اعتراض کریں کہ
کتاب کے عنوان سے اس مقالے کا کیا تعلق۔ میری گذارش یہ ہے کہ فکرِ اقبال
کے مختلف پہلوؤں کو صحیح طور پر سمجھنے اور ان پر بحث کرنے کے لیے یہ ضروری ہے
کہ علامہ مرحوم کی کتب کے صحیح متن ہمارے سامنے ہوں۔ اگر کتاب اغلاط سے
پُر ہے تو اس غلط سلط متن کی موجودگی میں اقبال کے افکار پر بحث و تمحیص کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس صورت میں تو کتاب ہمیں کعبے کے عوض ترکستان
کی طرف لے جائے گی۔ اسی نکتے کی اہمیت کے پیشِ نظر مشیر حسین ناظم کا یہ مقالہ
شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے۔

(۳)

اس وقت یوں تو اقبال صدی تقاریب جو ۱۹۷۷ء میں شروع ہو کے
۱۹۷۸ء تک جاری رہیں ختم ہو چکی ہیں لیکن ہندوستان اور پاکستان
میں یادِ اقبال منانے کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ ان دونوں ملکوں
کے مختلف حصوں میں اقبال سیمیناروں اور اقبال پر ادبی جلسوں کا یہ سلسلہ

ابھی تک چل رہا ہے اور ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے اقبالیات ہندوستان اور پاکستان کی تہذیبی زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ اس وقت جب کہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں اقبال صدی تقاریب کے جن پروگراموں کی اطلاع مجھے مل چکی ہے وہ یہ ہیں۔ یوم اقبال (غالب اکیڈمی نئی دہلی) ۲۱ اپریل ۱۹۷۷ء اقبال سیمینار (دہلی یونی ورسٹی دہلی) ۲۳، ۲۴ اپریل ۱۹۷۷ء اقبال سیمینار (کلکتہ یونی ورسٹی کلکتہ) ۲۸ اپریل ۱۹۷۷ء اور اقبال سیمینار (حکومتِ مغربی بنگال کلکتہ) ۲۹ اپریل ۱۹۷۷ء

اقبال صدی کے سلسلے میں جو تقاریب منائی گئیں یا منائی جا رہی ہیں اُن تمام کے ذکر کے لیے ایک الگ کتاب چاہیے۔ اس لیے ان کا تفصیلی ذکر میں انشاء اللہ کسی اور کتاب میں کروں گا۔ لیکن ان میں دو تقاریب ایسی ہیں جن کے ذکر کے بغیر یہ تمہید نامکمل ہے۔ ایک اقبال کا جشنِ صد سالہ ولادت جو آل انڈیا اقبال صدی تقاریب کمیٹی کی طرف سے اگیان بھون نئی دہلی میں منایا گیا۔ اور دوسرا وہ جشن جو اقبال عالمی کانگرس کے نام سے پاکستان کے دو شہروں لاہور اور سیالکوٹ میں منعقد کیا گیا۔ ان دو تقاریب کے ذکر کے بغیر یہ تمہیدی سطور تشنہ رہیں گی۔ چنانچہ یہ دونوں داستانیں زیرِ نظر کتاب کا حصۂ مقالات شروع ہونے سے قبل سردار جعفری، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، احسن علی مرزا اور جگن ناتھ آزاد کی زبانی سُنائی جا رہی ہیں۔

(۴)

اس کتاب کی اشاعت کے لیے میں اپنے محترم دوست اور اقبال اسکالر

مفتی جلال الدین صاحب کا مرہونِ منت ہوں جن کی بدولت میری یہ کاوش منظرِ عام پر آئی۔ اگر اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں اُن کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو اس کے چھپنے میں بہت تعویق ہوتی۔

اس سلسلے میں اپنے عزیز دوست جناب محمد امین بچھ کا دلی شکریہ ادا نہ کرنا احسان فراموشی ہوگی کہ انہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود اس کتاب کی کتابت شدہ کاپیاں اور پروف پڑھنے کی زحمت گوارا کی اور اس کام کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ "اقبال اور کشمیر" کی اشاعت کے وقت بھی امین بچھ صاحب نے اپنے اس نیاز مند کی یہ ذمہ داری اپنے اوپر لے لی تھی اور زیرِ نظر کتاب کے سلسلے میں بھی اُنہوں نے کاپیاں اور پروف پڑھنے کے لئے اپنا قیمتی وقت دینے سے دریغ نہیں کیا۔ میرا دل اس وقت اُن کے لئے احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہے۔

اِن چند معروضات کے ساتھ میں یہ مجموعۂ مقالات عاشقانِ کلامِ اقبال کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

آخر میں اُن تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا بھی میں اپنا فرض سمجھتا ہوں جن کے مقالے اس کتاب میں شریکِ اشاعت ہیں۔

جگن ناتھ آزاد

شعبۂ اردو
جموں یونی ورسٹی
جموں

۸ اپریل ۷۹ء

جشنِ اقبال

سردار جعفری

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

۱۹۷۷ء کا سب سے بڑا ادبی اور تہذیبی واقعہ علامہ اقبال کا صد سالہ جشنِ ولادت ہے جو ہندوستان اور پاکستان میں نہایت شاندار طریقے سے منایا گیا۔ اس جشن کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

ہمارے ملک میں اقبال تقریبات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک کل ہند صد سالہ جشنِ اقبال کمیٹی چند سال پہلے بنائی گئی اس کے پہلے صدر مرحوم درگا پرشاد دھر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد صدارت کے فرائض اندر گجرال صاحب نے سنبھال لیے جو اس وقت ماسکو میں ہندوستان کے سفیر ہیں۔ اس کمیٹی میں اردو کے تقریباً تمام سربرآوردہ ادیب شریک ہوئے اور ایک مجلس عاملہ کی تشکیل کر کے اقبال تقریبات کا کام اس کے سپرد کر دیا گیا۔

مجلسِ عاملہ کے عہدیدار اور ارکان حسبِ ذیل ہیں!۔

جناب اندر گجرال (صدر) جناب وی شنکر (چیئرمین فائی نانس

اور اکاؤنٹ کمیٹی) پروفیسر سید نور الحسن (نائب صدر) ڈاکٹر بھرت رام (نائب صدر) حکیم عبد الحمید صاحب (نائب صدر) ڈاکٹر نرائن مینن (نائب صدر) پنڈت آنند نرائن ملا (نائب صدر) ڈاکٹر سید عابد حسین (نائب صدر) علی سردار جعفری (جنرل سکریٹری) پروفیسر جگن ناتھ آزاد (جوائنٹ سکریٹری) محمد یوسف ٹینگ (جوائنٹ سکریٹری) ڈاکٹر قمر رئیس (جوائنٹ سکریٹری) جناب مہربان سنگھ دھوپیا (جوائنٹ سکریٹری) مسز امینہ آہوجا (جوائنٹ سکریٹری) جناب بی بی ساہنی (خزانچی) جناب اختر سعید خان (رکن) جناب عابد علی خان (رکن) جناب سہیل عظیم آبادی (رکن) ڈاکٹر زیش (رکن) ڈاکٹر وحید اختر (رکن) جناب اجلر بی (رکن)

عہدیداروں میں جناب فخر الدین علی احمد صاحب، درگا پرشاد دھر اور کرشن چندر بھی شامل تھے۔ لیکن جشن سے چند ماہ پہلے ان تینوں کا انتقال ہو گیا۔

بین الاقوامی سیمینار کے سلسلے میں مجلس عاملہ کا ہاتھ بٹانے کے لئے حسب ذیل حضرات پر مشتمل ایک سیمینار کمیٹی بھی تشکیل دی گئی:۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر مسعود حسین خان۔ ڈاکٹر پربھاکر ماچوے۔ جناب مالک رام۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر رشید الدین خان، ڈاکٹر یونس رضا اور ڈاکٹر ظ۔ انصاری۔ اس کمیٹی کے جلسوں میں دو تین اراکین اپنی مصروفیات کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے۔ لیکن

بحیثیت مجموعی یہ کمیٹی کام کرتی رہی۔ بین الاقوامی سیمینار کے لیے بیرونی ممالک کے مندوبین کی فہرست اس کمیٹی کے مشورے سے مرتب کی گئی۔ چونکہ اقبال کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے اس لیے صد سالہ جشن ولادت کے لیے آخر اکتوبر اور شروع نومبر ۱۹۷۷ء کا ہفتہ تجویز کیا گیا۔ جشن کی فضا پیدا کرنے کے لیے کل ہند جشن اقبال کمیٹی کے تعاون سے مختلف مقامات پر قومی سیمینار منعقد کیے گئے۔ جن میں سب سے زیادہ اہم حیدرآباد، سری نگر (کشمیر)، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی (نئی دہلی) کے سیمینار تھے۔ حیدرآباد کے سیمینار کا افتتاح مرحوم زرگا پرشاد دھر نے کیا اور کشمیر کے سیمینار کا افتتاح شیر کشمیر جناب شیخ محمد عبداللہ نے کیا۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے سیمینار میں پاکستان کے سفیر مرحوم سید فدا حسین صاحب نے پاکستان کی طرف سے تہنیت پیش کی۔ اور ایک خوب صورت مقالہ پڑھا۔ جامعہ ملیہ کے سیمینار میں بھی پاکستانی سفارت خانے کے احباب نے شرکت کی۔ یہ نہایت مبارک صورت حال تھی ۱۹۶۵ء کی بدبخت جنگ کے بعد ان دونوں ملکوں کے درمیان ثقافتی اور ادبی تعلقات کچھ شکستہ ہو گئے تھے لیکن اقبال کے نام کی برکت سے اس تعاون اور اشتراک کی ابتدا ہو رہی ہے۔ ہوئی جو اب ایک حسین شکل اختیار کر رہا ہے۔

ہندوستان کے جشن اقبال کو حکومت ہند کی اخلاقی امداد اور مالی تعاون حاصل تھا۔ جس میں مختلف وزارتوں نے حصہ لیا۔ جشن کی تیاری میں سر

اندرا گاندھی کے کانگریسی راج میں شروع ہوئی تھی لیکن اصل جشن جنتا راج کے زمانے میں منعقد ہوا۔ اس سیاسی تبدیلی سے جشن کی سلسلے تیاریوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

اس جشن کے سلسلے میں سب سے پہلے اندرکجرال صاحب کی رہنمائی میں انفارمیشن اور براڈکاسٹنگ وزارت نے اقبال کی زندگی پر ایک تصویری نمائش ترتیب دی جس کا انتظام اور اہتمام پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کیا۔ اس نمائش کا افتتاح سری نگر میں جناب شیخ محمد عبداللہ نے فرمایا اس کے بعد یہ نمائش ہندوستان کے مختلف شہروں اور علمی و ادبی اداروں میں گھوم رہی ہے۔ جشن کے زمانے میں اس وزارت کے نئے وزیر جناب ایل۔ کے اڈوانی کی عنایت سے نمائش کی تصویروں کو ایک خوب صورت البم کی شکل میں محفوظ کر لیا گیا۔ یہ کام ادارہ "آج کل" کے احباب اور پبلیکیشنز ڈویژن نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

اس وزارت کے ایک اور شعبے "فلمز ڈویژن" نے اقبال کی زندگی شاعری اور فلسفے پر ایک رنگین دستاویزی فلم بنانے کا فیصلہ کیا جس کو خواجہ احمد عباس اور علی سردار جعفری نے مکمل کیا۔ اس فلم کی تکمیل حکومتِ پاکستان کے اشتراک اور تعاون سے ہوئی۔ جس کے لئے حکومت ہند کی وزارت خارجہ اور پاکستانی سفارت خانے نے خاص طور سے کوشش کی۔ فلم کی شوٹنگ بمبئی، دہلی، کشمیر، لاہور اور سیالکوٹ میں ہوئی۔ اس فلم کی خوب صورتی ہیں جن تصویروں نے

اضافہ کیا ہے وہ برِ صغیر کے مشہور و معروف مصور مرحوم عبدالرحمٰن چغتائی اور عہدِ حاضر کے عظیم پاکستانی مصور صادقین کی بنائی ہوئی ہیں۔ ایک تصویروں کو استعمال کرنے کی اجازت ان کے صاحبزادے عارف رحمٰن چغتائی صاحب نے عنایت فرمائی اور صادقین نے انتہائی فراخ دلی سے اپنی وہ ساری تصویریں ہماری نذر کردیں جو انھوں نے پاکستان کے جشن اقبال کے لیے اقبال کی شاعری کو رنگین خط و خال دینے کے لئے بنائی ہیں۔ میرے پاس اُن کی عنایت کی ہوئی ۳۶ ٹرانس پیرینسیز ہیں۔ اس فلم کے لیے اقبال کے صاحبزادے جسٹس جاوید اقبال نے خاص طور سے انٹرویو دیا جو فلم میں شامل ہے اور جس کمرے میں علامہ کا انتقال ہوا تھا اس کی چیزوں کو اسی شکل میں پھر سے ترتیب دے دیا جو ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو صبح پانچ بجے تھی۔ اس کی وجہ سے اِس دستاویزی فلم کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے یہ فلم ۹ اپریل ۱۹۷۸ء میں اقبال کی وفات کی چالیس سالہ برسی کے موقع پر نمائش کے لئے پیش کی جائے گی۔ لیکن اس کی پہلی کاپی وزیرِ خارجہ جناب اٹل بہاری واجپئی نے حکومت ہندوستان کی طرف سے حکومت پاکستان کو تحفے کے طور پر پیش کی ہے۔ اس کی مزید تین کاپیاں جسٹس جاوید اقبال، صادقین اور چغتائی میوزیم کے لئے بھیجی جا رہی ہیں۔ یہ فلم دُنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے بیرونی ممالک کے ہندوستانی سفارت خانوں کو بھی بھیجی جا رہی ہے۔

"ڈاکٹر محمد اقبال" دستاویزی فلم کے سلسلے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو تعاون اور اشتراک کی صورت پیدا ہوئی ہے وہ ہماری تیس سالہ تاریخ کا ایک بڑا واقعہ ہے۔ اور دونوں ملکوں کے مستقبل کے لیے نیک فال ہے اور روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ جشن اقبال کمیٹی کے کاموں کے لیے ہندوستان کی تقریباً تمام ریاستوں نے روپیہ دیا اور بین الاقوامی سیمنار کے لیے حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے مالی امداد دی۔ اسی وزارت کے شعبۂ ثقافت (ڈپارٹمنٹ آف کلچر) نے اقبال کمیٹی کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ شعبے کے اراکین کی دن رات کی محنت نے ہمارے بین الاقوامی سیمنار کی کامیابی میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

جشنِ اقبال کا افتتاح نئی دہلی کے وگیان بھون میں ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۷ء کی رات کو ایک کل ہند مشاعرے کی شکل میں ہوا۔ افتتاح کے فرائض سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بیگ صاحب نے انجام دیے اور صدارت جناب وی شنکر نے فرمائی۔ پاکستان کے سفیر نے افتتاح کی تقریب میں پاکستان کی طرف سے تہنیت دی۔ سامعین میں بیرونی ممالک کے مندوبین شریک تھے۔ وزیرِ خارجہ جناب اٹل بہاری واجپئی اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری جناب راجیشور راؤ مشاعرے کے اختتام تک موجود رہے۔

دوسرے دن ۳۰ اکتوبر کو صبح دس بجے وگیان بھون میں بین الاقوامی

اقبال سیمینار شروع ہوا۔ مندوبین میں ہندوستان کے علاوہ پاکستان، سوویت یونین، ایران، چیکوسلواکیہ، مغربی جرمنی، انگلستان مصر اور عراق کے ادیب و شاعر شامل تھے۔ پاکستان سے اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر معز الدین، مشہور نقّاد اور ادیب ڈاکٹر جمیل جالبی، مشہور نقّاد عبادت بریلوی، پنجاب یونیورسٹی کی آرٹ فیکلٹی کے ڈین اور مشہور دانشور ڈاکٹر وحید قریشی اور کراچی کی ڈاکٹر عالیہ امام تشریف لائی تھیں۔ اس وفد کا استقبال سیمنار میں ہندوستان کی طرف سے ان الفاظ میں کیا گیا۔ "آپ کا آنا ہمارے لئے باعث مسرت ہے۔ سیمنار کے اس کمرے میں جب ہم آپ کا استقبال کر رہے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہو رہا ہے کہ سارا ہندوستان آپ کا استقبال کر رہا ہے۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ آپ بار بار ہمارے ملک میں تشریف لائیں اور غالب کے اس شعر کو نئی معنویت عطا کریں۔

وداع و وصل جداگانہ لذّتے دارد

ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا۔

۱۹۶۵ء کے بعد یہ پہلا ثقافتی وفد تھا جو پاکستان سے ہندوستان آیا تھا۔ ایران سے آنے والے دانشوروں میں جناب محمد علی اسلامی ندوشن، جناب جلال نائینی، ڈاکٹر پرویز، جناب ناتل خانلری، شاعر نادر نادر پور، ڈاکٹر مجتبائی اور ڈاکٹر گنجوی شامل تھے۔ سوویت یونین کی نمائندگی

پروفیسر محمد عاصمی (رئیس فرہنگستان علوم تاجکستان) پروفیسر ای پی چیلی شف (ماسکو) جناب غفاردف (تاجکستان) مسز ایل پی پولن سکایا (ماسکو) اور جناب اے ایس سوچوین نے کی۔ چکوسلواکیہ سے پروفیسر یان ماریک تشریف لائے۔ فیڈرل ری پبلک آف جرمنی (مغربی جرمنی) سے پروفیسر ڈاکٹر انا ماری شمیل نے شرکت کی جو ہارورڈ یونی ورسٹی (امریکہ) میں پروفیسر ہیں۔ انگلستان سے ایڈنبرا یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر ڈاکٹر صابری تبریزی تشریف لائے۔ اقبال کے مترجم اور اسکالر وکٹر کیرنن بھی تشریف لانے والے تھے۔ وہ کسی وجہ سے نہ آسکے لیکن انھوں نے اپنا مقالہ اپنی نمائندگی کے لئے بھیج دیا تھا۔ مصر کی نمائندگی ڈاکٹر السید محمد عبدالوفا طنطرانی نے کی اور عراق کی نمائندگی شاعر لیسین طٰہٰ حافظ نے کی جنھوں نے عربی میں ایک خوب صورت نظم اقبال کی شان میں پڑھی۔

بین الاقوامی سیمینار میں ہندوستان کی طرف سے ۳۶ ہندوبین شریک ہوئے۔ پروفیسر عابدی، ڈاکٹر وحید اختر، جناب وارث علوی، ڈاکٹر ملک راج آنند جناب حیات اللہ انصاری۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر اے ڈبلو۔ اظہر، جناب کرتار سنگھ دوگل۔ جناب اصغر علی انجینئر، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی پروفیسر محمد حسن، علی سردار جعفری، ڈاکٹر اوما شنکر جوشی، جناب عابد علی خاں

پروفیسر ایم، ایچ خان، ڈاکٹر عالم خوندمیری۔ ڈاکٹر پربھاکر ماچوے۔ ڈاکٹر نرائنا مینن۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، جناب کلدیپ نیر۔ پروفیسر پی، این، پشپ۔ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن۔ ڈاکٹر قمر رئیس۔ ڈاکٹر تارا چند رستوگی۔ ڈاکٹر ایس، رحمٰن۔ پروفیسر عطر سنگھ محترمہ زاہدہ زیدی۔ جناب این، ایچ انصاری۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان۔ پروفیسر رشید الدین خاں، جناب سہیل عظیم آبادی۔ جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب اختر سعید خان اور جناب رشید حسن خان، انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر اور کل ہند صد سالہ جشن اقبال کمیٹی کے نائب صدر پنڈت آنند نرائن ملا اور انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری، ڈاکٹر خلیق انجم نے ایک اجلاس میں شرکت کی۔ دونوں حضرات انجمن ترقی اردو کے اردو گھر کی رسم افتتاح کے انتظامات میں مصروف تھے۔ پروفیسر حسرت سہروردی کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکے لیکن موصوف نے اپنا مقالہ ارسال فرما دیا تھا جو سیمینار میں تقسیم کیا گیا۔

بین الاقوامی سیمنار کی مجلس صدارت ڈاکٹر پروفیسر انا ماری شمیل (جرمنی) پروفیسر محمد عاصمی (تاجکستان سویت یونین)، ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری (ایران)، ڈاکٹر معز الدین (پاکستان) ڈاکٹر نرائنا مینن (ہندوستان) ڈاکٹر ملک راج آنند (ہندوستان) ڈاکٹر پربھاکر ماچوے (ہندوستان)، پروفیسر محمد علی خسرو

(ہندوستان) ڈاکٹر مسعود حسین خان (ہندوستان) اور ڈاکٹر محمد حسن (ہندوستان) پر مشتمل تھی۔

سیمینار کا پروگرام اقبال کی ایک نہایت خوب صورت تصویر کے ساتھ شمع: یبلی کیشنز کی طرف سے شائع کیا گیا اور مندوبین کے لیے ایک نفیس فولڈر بیسویں صدی گروپ کی طرف سے پیش کیا گیا اس کے لیے جناب یونس دہلوی اور جناب رحمٰن نیر شکریہ کے مستحق ہیں۔

بین الاقوامی سیمینار کا آغاز اقبال کی دو غزلوں سے ہوا۔

(۱) خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ (۲) جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی۔ (مشاعرے کا آغاز ترانۂ ہندی سے ہوا تھا) اس کے بعد علی سردار جعفری نے جنرل سکریٹری اور سیمینار کے ناظم کی حیثیت سے ابتدائی تقریر کی اور گجراتی عظیم المرتبت شاعر اور دانشور پروفیسر اوماشنکر جوشی نے ایک جامع اور پُر مغز مقالے سے سیمینار کا افتتاح کیا حکومتِ ہند کی وزارتِ اطلاعات اور براڈکاسٹنگ کے وزیر جناب ایل کے اڈوانی نے پبلی کیشنز ڈویژن کی طرف سے شائع ہونے والے اقبال البم یعنی مرقعِ اقبال (مرتبہ جگن ناتھ آزاد) کا اجرا کیا۔ اس کی ایک ایک جلد سیمینار کے مندوبین کو پیش کی گئی۔

ابتدائی صاحب نے اپنی تقریر میں

برصغیر کے عظیم شاعر اور فلسفی کو خراج تہنیت پیش کیا۔ سوویت یونین کے نمائندوں کی طرف سے اقبال پر سوویت تصنیفات پیش کی گئیں سیمینار چار دن جاری رہا اور اس کے آٹھ اجلاسوں میں بیرونی اور ہندوستانی نمائندوں نے ۳۶ مقالات پڑھے۔ زیادہ تر مقالے انگریزی میں تھے۔ کچھ مقالے اردو اور فارسی میں پڑھے گئے اور ایک مقالہ عربی میں۔ ایران کے شاعر نادر نادرپور نے اور عراق کے شاعر لیسین طٰہٰ حافظ نے فارسی اور عربی میں اقبال کی شان میں نظمیں پڑھیں۔

سیمینار نہایت کامیاب تھا۔ مقالات بلند پایہ تھے اور مباحثے کا معیار بھی بہت بلند تھا جس کی تعریف باہر سے آنے والے مندوبین نے خاص طور سے کی۔ وزیر خارجہ جناب اٹل بہاری واجپئی نے اس جشن اور سیمینار کی کامیابی پر کل ہند جشن اقبال کمیٹی کے نام مبارک باد کا خط لکھا اور یہ وعدہ کیا کہ اقبال البم، اقبال فلم اور سیمینار کی مطبوعات کو (جب وہ شائع ہو جائیں گی) ہندوستان کی طرف سے بیرونی ممالک میں بھیجا جائے گا۔

مشاعرے اور سیمینار کے علاوہ دہلی میں کچھ تہذیبی تفریحات بھی منعقد ہوئیں۔ ان میں خاص طور سے قابلِ ذکر محمد مہدی کا ڈرامہ "اقبال" ہے جو بیگم عابدہ فخرالدین علی احمد کے ادارے کی طرف سے جشنِ اقبال کے موقع پر پیش کیا گیا۔ اس کو بہت پسند کیا گیا۔ اس کے علاوہ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نے اقبال کی شاعری پر مبنی

ایک رقص کے پروگرام کا انتظام کیا۔ نئی دہلی کے ایرانی سفارت خانے کی طرف سے سیمنار میں شریک ہونے والوں کو ایک استقبالیہ دیا گیا۔ حکیم عبدالحمید صاحب نے غالب اکیڈمی کی طرف سے مندوبین کی پُر تکلف دعوت کی۔ دعوت سے پہلے ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے غالب پر ایک نہایت عمدہ مقالہ ارشاد فرمایا۔

۲۹ اکتوبر سے ۲ نومبر ۱۹۷۷ء تک ڈی اے وی پی کی طرف سے اقبال کی زندگی پر تصویروں کی نمائش ہوئی۔ یہ وہی نمائش تھی جو جگن ناتھ آزاد نے ترتیب دی تھی یا محمد کے ساتھ امینہ دہلوی نے اقبال کے اشعار کو اپنی بنائی ہوئی تصویروں کے ذریعے سے رنگ اور نور میں تبدیل کر دیا تھا مصوری کے ان خوبصورت نمونوں کی نمائش بھی وگیان بھون میں جاری رہی۔

یہ ساری کامیابیاں مسرت کا باعث ہیں، لیکن ابھی کچھ کام باقی ہیں اور وہ خاصے اہم ہیں۔ نئی دہلی کے بین الاقوامی سیمنار میں ایک تجویز یہ منظور کی گئی کہ یونسکو کے تحت ایک مستقل اقبال کمیشن قائم کیا جائے اور اس کے اراکین وہ ممالک ہوں جو اقبال کے ورثے کو اپنے ادبی اور تہذیبی ورثے کا حصہ سمجھتے ہیں۔ یہ تجویز ہندوستان، پاکستان، ایران اور سوویت یونین کے مندوبین کی طرف سے پیش کی گئی تھی اور متفقہ طور سے منظور ہوئی۔ (ایسی ہی ایک تجویز ذرا مختلف شکل میں لاہور کی بین الاقوامی اقبال کانگریس میں منظور کی گئی) ابھی اس تجویز کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا ہے۔ اس

سلسلے میں حکومتِ ہند کی وزارت تعلیم سے مشورہ کیا جا رہا ہے۔ کُل ہند صد سالہ جشنِ اقبال کمیٹی کی طرف سے ہمارے صدر جناب اندر کمار گجرال نے حکومتِ ہند کی وزارتِ ڈاک و تار سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ جشنِ اقبال کے موقع پر اقبال کی یاد میں ایک ڈاک ٹکٹ جاری کیا جائے اِس شعبے کے وزیر ورما صاحب نے اِس پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن ابھی تک معاملہ زیرِ غور ہے۔

7359

سیمنار میں جو مقالات پیش کئے گئے تھے ان کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ کوشش یہ ہے کہ کتاب انگریزی اردو اور ہندی میں شائع ہو۔ اس کے لئے بھی وزارت تعلیم کے مالی تعاون کی ضرورت ہے۔ ایک اور کتاب زیرِ ترتیب ہے جس میں ۴۲ مضامین ہوں گے جو ہندوستان اور دُنیا کے عظیم شاعروں کے ساتھ اقبال کے تقابلی مطالعے پر مشتمل ہوں گے۔ اس کتاب کی طباعت اور اشاعت کی ذمہ داری ان کا پبلشرز نے لی ہے۔

اس سال کے آخر تک یہ سارے منصوبے پورے ہو جائیں تو بڑا کام ہو جائے گا۔

"گفتگو" بمبئی

(مارچ تا دسمبر ۷۷ء)

اقبال عالمی کانگریس لاہور

(سری نگر ریڈیو سے جگن ناتھ آزاد کی تقریر جس کا مسودہ ٹیپ سے تیار کیا گیا)

یوں تو دُنیا کے اکثر ممالک نے ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی تقاریب منا کر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مشرق کے عظیم شاعر علامہ اقبال کے علمی اور ادبی کمالات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان میں یہ تقریب جس طرح سے منائی گئی وہ اقبال کے لیے صرف خراجِ تحسین یا خراجِ عقیدت کا مظہر ہی نہیں تھی بلکہ اس سے یہ حقیقت بھی نمایاں ہو رہی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے دل میں اپنے اِس فرزندِ جلیل کے لئے کس قدر بے پایاں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

پاکستان نے اِس جشن کے لئے دسمبر کے پہلے ہفتے کی تاریخیں مقرر کی تھیں جن کا انتظار دُنیا کے اکثر حصّوں میں بڑی بے تابی کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ آخر وہ مبارک ساعت آ گئی جب دُنیا کے تقریباً اسّی مندوبین کے ساتھ مجھے بھی یہ موقع ملا کہ میں لاہور جا کر اس بین الاقوامی کانگریس

میں شریک ہو سکوں

مجھے لاہور جانے کا اتفاق بارہ برس کے بعد ہوا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ لاہور ایک ایسی جگہ ہے جہاں میں نے اپنا لڑکپن بسر کیا بلکہ لاہور میرے لئے اور بھی کئی اہمیتیں رکھتا ہے۔ چناں چہ لاہور روانہ ہوتے وقت یہ تمام پہلو میرے سامنے تھے اور اسے میں اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں، کہ بارہ برس بعد مجھے مزار اقبال کی زیارت نصیب ہوئی۔ جاوید منزل کے دیدار سے میں نے اپنی آنکھیں روشن کیں۔ جاوید اور منیرہ کو دیکھا۔ ان سے باتیں کیں۔ اُس یونی ورسٹی میں گیا جہاں میں نے اپنے اساتذہ کے قدموں میں بیٹھ کر بات کرنے کا طریقہ سیکھا تھا۔ ان اساتذہ میں سے ڈاکٹر شیخ محمد اقبال جو میرے زمانے میں اورینٹل کالج لاہور میں وائس پرنسپل تھے، سید عابد علی عابد اور مولانا علم الدین سالک تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ خداوند کریم انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم[1] ہماری اور علم و ادب کی خوش قسمتی سے ہم میں موجود ہیں۔ ان کی قدم بوسی کی دوران اس سفر میں حاصل ہوئی۔ میری دعا ہے کہ ان کا سایہ طویل مدت

---

[1] ۷ فروری ۱۹۷۸ء میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم بھی اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

تک اُردو اور فارسی ادب پر قائم رہے۔

اقبال عالمی کانگرس دراصل اہلِ پاکستان کے ذوق و شوق کا ایک کرشمہ تھی اور حکومتِ پاکستان نے اس ذوق و شوق کو عملی صورت دینے کے لئے کئی کمیٹیاں قائم کیں مثلاً نیشنل کمیٹی، ایگزیکٹو کمیٹی، آرگنائزنگ کمیٹی، استقبالیہ کمیٹی وغیرہ۔ اس کے علاوہ متعدد سب کمیٹیاں بھی مصروفِ کار تھیں۔ جیسے پرنٹنگ اور پبلیکیشن کمیٹی، انتظامِ قیام کمیٹی، سووینیر کمیٹی، قابلِ دید مقامات کمیٹی، پروگرام کمیٹی، رابطہ کمیٹی اور ریسیپشن کمیٹی وغیرہ۔ اور یہ عالمی کانگریس ان تمام کمیٹیوں کے اشتراکِ عمل کا ایک خوب صورت مظہر تھی۔

یہ عالمی کانگریس ایک جلوہ صد رنگ تھا جس کا ہر پہلو ہر اعتبار سے قابلِ تعریف تھا۔ ہم لوگوں نے لاہور کے ہوائی اڈے پر اترنے کے وقت سے لے کر روانگی کے وقت تک کمیٹیوں کے ارکان کو ایک لمحے کے لئے بھی آرام سے بیٹھے نہیں دیکھا۔ انھیں یہی دُھن سوار تھی کہ کانگریس کا پروگرام خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پذیر ہو۔ اور اس کے ساتھ پاکستان اور بیرونِ پاکستان سے آئے ہوئے تمام مہمانوں کو پورا آرام ملے۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ منتظمین کی دونوں آرزوئیں پوری ہوئیں۔ جب کوئی کام جماعتی یا

اجتماعی جذبے سے کیا جائے تو اس میں افراد کا ذکر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن۔ لیکن جماعت بھی تو افراد سے بنتی ہے، اس اس لیے میں محسوس کرتا ہوں کہ کانگریس کی عدیم النظیر کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے بعض حضرات کا ذکر نہ کرنا حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہوگا اور یہ حضرات ہیں ڈاکٹر جرات محمد ابن رسا، ڈاکٹر رفیق احمد، ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر خواجہ غلام صادق، ڈاکٹر بلوچ، ڈاکٹر وحید قریشی پروفیسر ریاض الرحمٰن ڈاکٹر منیر الدین چغتائی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر معز الدین، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر محمد حارث میر اور پروفیسر محمد عثمان۔

یہاں اِس بات کا بھی مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ اِس وقت جلدی میں مجھے تمام نام یاد بھی نہیں آرہے ہیں مثلاً یہ فہرست پیش کرتے ہوئے اپنے عزیز دوستوں فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے نام ہی بھول گیا ہوں۔ جن کی موجودگی ہی اس کانگریس کی چمک دمک میں اضافہ کر رہی تھی۔ اِسی طرح ماہر اقبالیات بشیر احمد ڈار کے نام کو بھول جانا ـــ اور میں اس سہو کا مرتکب ہوا ہوں ـــ ایک کوتاہی سے کم نہیں۔ لیکن چوں کہ میرا مقصد ناموں کی فہرست گنوانا نہیں ہے بلکہ اس امر کی طرف ایک اشارہ کرنا ہے کہ ٹیم اسپرٹ سے کتنا بڑا معجزہ ظہور پذیر ہو سکتا ہے، اس لیئے غالباً ناموں کی کمی بیشی میرے مقصد پر اثر انداز نہیں ہوگی اور میری یہ کوتاہی

قابلِ معافی سمجھی جائے گی۔

میں نے اس اقبال عالمی کانگرس (International Congress on Allama Mohammad Iqbal) کو ایک معجزہ کہا ہے، جی ہاں، یہ ایک معجزہ تھا پاکستان سمیت دُنیا کے تیس ملکوں سے ایک سو اسّی کے قریب مندوبین کو مدعو کرنا اور ایک ہفتے تک انتہائی اونچی علمی و ادبی سطح کی ایک محفل سجانا اور وہ بھی دو شہروں میں ایک معجزے سے کم نہیں تھا۔ جو کچھ میں نے ان سات آٹھ دنوں میں دیکھا اُسے پوری طرح سے بیان کرنے کے لئے شاید مجھے الفاظ نہ مل سکیں۔

جہاں تک اِس کانگرس کے علمی معیار کا تعلق ہے اِس خاکسار کے علاوہ ہر مندوب علم و ادب کی دُنیا میں ایک اونچے مرتبے کا حامل تھا۔ یہ وہ مندوب تھے جن کے اوراقِ زندگی اقبالیات اور اسلامیات پر کیے ہوئے کاموں کی روشنی سے چمک رہے تھے۔ آپ چند نام سُنئے تاکہ آپ خود ہی میرے دعوے کی تصدیق کر سکیں۔ کینیڈا سے شیلا میکڈونو آئی تھیں، چیکوسلواکیہ سے ڈاکٹر یان ماریک، روس سے ڈاکٹر سوخوچوف اور ڈاکٹر غفاراف، مصر سے ڈاکٹر حسین مجیب المصری، فن لینڈ سے جوسی آرو، فرانس سے ایوا میورووچ، ایران سے جلالی متینی، عراق سے عبدالرزاق محی الدین، اٹلی سے الیساندر بسانی، جاپان سے حاجی عبدالکریم سیاٹو، سوڈان سے مبارک مغربی سوئٹزرلینڈ سے ڈاکٹر جے سی بروگل ترکی سے ہیڈم برہان اور عبدالقادر کرہان، انگلستان سے پروفیسر رالف رسل اور ڈاکٹر صابری

تبریزی امریکہ سے ڈاکٹر باربرا میٹکاف، جرمنی سے ڈاکٹر ڈیسٹر اور میری سرزمین ہندوستان سے اِس خاکسار کے علاوہ آل احمد سرور، علی سردار جعفری اور صباح الدین عبدالرحمٰن۔

یہ فہرست بھی مکمل نہیں ہے کیوں کہ یہاں بھی ناموں کی مکمل فہرست گنوانا میرا مقصد نہیں بلکہ محض مشتے نمونہ از خروارے پیش کرنا میرے مدِنظر ہے۔ ظاہر ہے کہ ان علما کے مقالات کا کتنا اونچا معیار رہا ہوگا اور آرگنائزنگ کمیٹی کا کمال یہ ہے کہ ہماری واپسی سے قبل اِن مقالات پر مشتمل چار ضخیم جلدیں انھوں نے ہم تمام مندوبین کے حوالے کردیں۔ دو جلدیں اور ہمیں چند روز تک ملنے والی ہیں گویا مشرق و مغرب کے ماہرینِ اقبالیات کے افکار جو اِس کانگرس میں پیش کیے گئے مکمل طور پر محفوظ کر لئے گئے ہیں اور دنیا کی کوئی لائبریری ان چھ مجموعوں پر فخر کر سکتی ہے۔ اِتنے کم وقت میں اس قدر ضخیم کتابوں کا تیار ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں۔

یہ تو کانگرس کا ایک پہلو تھا۔ کتابوں کے تحائف جو کانگرس کی طرف سے اور کانگریس کے علاوہ پاکستان کے مصنفین اور ناشرین کی طرف سے ہم لوگوں کو ملے اتنا بڑا خزانہ ہے جو اس کانگرس میں شرکت کے بغیر ہمیں حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ تو ہوئی مقالوں اور کتابوں کی بات یعنی بقول اقبال علم با خرد کی بات، اب سنئے عشق کی بات تو جذبۂ عشق محض کتابوں اور مقالات سے کیسے مطمئن ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے جیسا کہ میں ذکر

کرچکا ہوں ایک دوسری دُنیا موجود تھی۔ یعنی ہم لوگوں کی جاوید منزل میں اور مزارِ اقبال پر حاضری۔ جاوید منزل وہ مکان ہے جس میں علامہ اقبال مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری چند برس بسر کیئے تھے۔ آج یہ مکان ایک قومی عجائب گھر کی حیثیت رکھتا ہے جس میں علامہ اقبال کے زیرِ استعمال آنے والا سامان اور مختلف چیزیں وہاں موجود ہیں۔ مثلاً پلنگ، حقہ استعمال کے کپڑے، میز، کرسی، ڈائننگ ٹیبل وغیرہ۔ اور ان سب سے بڑھ کے علامہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے۔ اِن تمام اشیا کی دید سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ یہاں صغیر ہر مٹی کے بنائے ہوئے ان عمارتوں کے ماڈل رکھے ہیں جن کے ساتھ علامہ اقبال کا تعلق رہا۔ جاوید منزل سے قبل ہم لوگوں نے شاہی مسجد کی زیارت کی بعض مندوبین کے لئے اس حسین و جمیل تعمیر کو دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا اس لئے ان کی خاطر ہم وہاں بہت دیر تک رُکے رہے۔

یوں تو میرے لیے اِس سفر کا حاصل سفر کئی پہلوؤں پر مشتمل تھا۔ لیکن مزارِ اقبال کی زیارت اِن تمام پہلوؤں میں ایک بہت ہی اہم پہلو تھا۔ میری نظروں کے سامنے خاک کے نیچے وہ عظیم فن کار خوابیدہ تھا، جس کے نغموں نے مشرق و مغرب کو رموزِ زندگی سے آشنا کیا تھا۔ اس وقت میری زبان پر اسی فن کار ہی کا ایک مصرع تھا۔ ؎

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی

اِس عظیم جشن کا افتتاح لاہور میں ہوا اور اختتام سیالکوٹ میں۔

سیالکوٹ کو اب شہرِ اقبال بھی کہا جاتا ہے۔ وہاں جب ہم مندوبین، کاروں، اور بسوں کے ذریعے سے پہنچے تو ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے ساری آبادی اپنے اپنے گھروں سے باہر سڑکوں پر آگئی۔ قلعے میں ایک عظیم پبلک جلسہ منعقد ہوا جس میں متعدد مندوبین نے کانگرس کے متعلق اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کھانے کے بعد مندوبین اور دوسرے اہلِ قلم پر مشتمل ایک جلوس اقبال کو خراجِ عقیدت ادا کرنے کے لیے قلعے سے چل کر علامہ اقبال کے آبائی مکان پر پہنچا۔ یہ وہی مکان ہے جہاں آج سے سو سال قبل مشرق کے اِس عظیم فن کار نے آنکھیں کھولیں۔ اِس جلوس کی رہنمائی کا شرف اِس خاکسار کو حاصل ہوا۔ یہ صرف ایک اعزاز ہی نہیں تھا بلکہ اس میں منتظمین کا جذبۂ محبت بھی شامل تھا، اس کام کے لیے جو ہندوستان میں اقبال پر ہو رہا ہے اور ہندوستان سے آئے ہوئے مندوبین کے لیے یہ جلوس تمام وقت پھولوں کی بارش میں رواں دواں رہا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اہلِ سیالکوٹ نے جلوس پر منوں کی مقدار میں پھولوں کی پتیاں برسائیں یا ٹنوں کی مقدار میں لیکن مجھ خاکسار کو تین چار فرلانگ پھولوں کی خس بیز سطح پر چلنے کا اتفاق زندگی میں پہلی بار ہوا تھا اور غالباً میرے ساتھ تمام مندوبین کو۔ اس سے قبل ایک اور ہندوستانی مندوب جناب صباح الدین عبدالرحمٰن لاہور میں مقالات کے ایک سیشن کی صدارت بھی کر چکے تھے اسی سیالکوٹ ہی میں اس کانگرس کی آخری تقریب ایک ہند و پاک مشاعرے کی صورت میں ۸ دسمبر کی رات کو شروع ہوئی اور ۹ دسمبر

کی صبح کو ڈھائی بجے کے قریب اختتام پذیر ہوئی۔ اس اختتامی تقریب کی صدارت کا اعزاز بھی اِس فقیر کو حاصل ہوا۔ اس مشاعرے میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، منیر نیازی، تمکین ہوشیار پوری اور دوسرے شعرا نے اپنا اپنا کلام سُنایا۔

اِس آٹھ دنوں کی مدت میں اِس کانگرس سے باہر بھی بعض ادبی اجلاس ہوتے رہے۔ مثلاً پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اُردو اسلامک..... انسائیکلو پیڈیا کے متعلق ایک اجلاس منعقد ہُوا جس کا انتظام استادِ محترم ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے کیا اور جس میں سید نذیر نیازی کو ان کی علمی اور ادبی خدمات کی بنا پر دس ہزار روپے کی تھیلی اور خلعت پیش کی گئی۔

دوسرا اہم اجلاس "نقوش" کے اقبال نمبر (۳) کے اجرا کے سلسلے میں تھا۔ اِن اجلاسوں کی ایک اہمیت یہ بھی تھی کہ یہاں پاکستان کے اکثر ادیبوں، شاعروں اور اپنے نئے پُرانے دوستوں سے ملاقات ہو گئی۔ اوّل الذکر جلسے میں وُلنر ہال کے پیچھے کا دالان اور ثانی الذکر میں شیزان کا ہال ادیبوں کے شاعروں اور فنکاروں سے بھرا ہُوا تھا۔ اور ہاں یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا۔ کہ اقبال پر کتابوں کی نمائش اور کلامِ اقبال مصوری کے نمونوں کی صورت میں اِس کانگرس کے دو بہت اہم شعبے تھے۔ کتابوں کی نمائش کا انتظام ڈاکٹر وحید قریشی اور ان کے رفقائے کار پروفیسر رفیع الدین ہاشمی اور پروفیسر سلیم اختر نے کیا اور مصوری کی نمائش بلو بھی ایشیا کے عظیم مصور عبدالرحمان چغتائی اور

پاکستان کے نامی فن کار صادقین صدیق کی تصاویر دیکھنے کو ملیں
بیگم عبادت بریلوی وہاں ایک گورنمنٹ گرلز کالج کی پرنسپل ہیں۔
انھوں نے اپنے کالج میں ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ جس میں پروفیسر ابولطف رسل
پروفیسر آل احمد سرور اور میں نے شرکت کی میری شرکت دراصل اس جلسے میں
بہت مختصر رہی کیوں کہ اسی تاریخ کو اور قریب قریب اسی وقت ایم۔ اے۔ او
کالج کے اساتذہ وطلبہ چند روز قبل اس فقیر سے بات چیت کرنے کے لیے
پروگرام طے کر چکے تھے۔ اس جلسے کا اہتمام عطاء الحق قاسمی نے کیا تھا اور اس کی
صدارت احمد ندیم قاسمی نے کی۔ اس میں بعض مقررین حضرات نے میرے والد
محترم کا ذکر بڑی محبت سے کیا جس سے میں بہت متاثر ہوا۔

اقبال عالمی کانگریس کے بعد آل احمد سرور، علی سردار جعفری۔۔ اور
صباح الدین عبدالرحمٰن لاہور سے کراچی روانہ ہو گئے۔ جن حضرات نے اس دور
کے پاکستانی جرائد دیکھے ہیں۔ انہیں بخوبی علم ہو گا کہ کراچی میں ان تینوں
حضرات کی کیسی محبت اور خلوص سے پذیرائی کی گئی۔ سردار جعفری کے خاص
انٹرویو نو دسمبر اور جنوری میں کراچی کے اخبارات و جرائد کے صفحۂ اول پر
شائع ہوئے اور انھیں پاکستانی نامہ نگاروں نے SARDAR'S
JAFRI'S SENTIMENTAL JOURNEY کے نام سے
چھاپا۔

سرور صاحب کو پاکستان کے ادبی جلسوں میں استاد الاساتذہ کے
نام سے پکارا گیا۔ لاہور اور کراچی میں یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے ان کے

راستے میں آنکھیں بچھائیں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی حیثیت لاہور،
سیالکوٹ اور کراچی میں ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک ادارے کی رہی۔ "معارف"
کا مدیر، دارالمصنفین اعظم گڑھ کا نمائندہ، سید سلیمان ندوی مرحوم کی یادگار، اور
اقبالیات پر گہری نظر رکھنے والا عالم۔ پاکستان میں سید صاحب کی موجودگی ایک
نعمتِ غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ جشنِ اقبال علمی اور ادبی اہمیت کے علاوہ
ایک اور اہمیت کا حامل بھی تھا اور وہ یہ کہ اس نے ہندوستان اور پاکستان
کے ادیبوں کو اتنی مدت کے بعد ایک دوسرے سے ملنے کا موقع فراہم کیا
اور اگرچہ اس موقع پر تمام دنیا کے اقبال شناس بڑے تپاک کے ساتھ آپس میں
مل رہے تھے، لیکن ہندوستانی اور پاکستانی ادیبوں کے قہقہوں اور آنسوؤں
کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ ملنے کی بات ہی اور ایسا معلوم ہوتا تھا
جیسے فضا کے ہر گوشے سے یہ آواز سنائی دے رہی ہے۔

آ ملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

اقبال بین الاقوامی کانگریس

دہلی بہت آرام سے پہونچا، اسٹیشن پر مکرمی عبدالحفیظ انصاری کے بڑے صاحبزادے محمد طارق سے ملاقات ہو گئی، ان کی وجہ سے بڑا آرام پہونچا، پاکستانی سفارت خانے میں پریس کونسلر محمد عظیم صاحب بڑے اخلاق سے ملے، اور بتایا کہ اقبال کا صد سالہ جشن لاہور کے علاوہ کراچی اور اسلام آباد میں بھی منایا جائے گا۔ اس لئے کراچی اور اسلام آباد کا ویزا ابھی بنا دیا گیا ہے، پاکستان انٹرنیشنل ایرویز کے دفتر گیا تو معلوم ہوا کہ ٹکٹ لکھنؤ چلا گیا ہے، لکھنؤ سے ٹکٹ واپس منگایا جائے گا اس لئے سفر میں قدرے تاخیر ہو گی اور کہیں پہلی دسمبر کو روانگی ہو سکے گی، پہلی دسمبر کو پروفیسر جگن ناتھ آزاد جموں سے اور علی سردار جعفری بھی بمبئی سے دہلی آگئے۔ اور ہم سب چار بج کر بیس منٹ پر پالم سے روانہ ہوئے، اور سوا گھنٹے میں لاہور پہونچ گئے۔ ہوائی جہاز کے عملے نے بڑی پذیرائی کی، اور یادگار کے طور پر ہم لوگوں کی تصویر لینے کی خواہش کی پروفیسر آل احمد سرور اس دن ساتھ

نہ آسکے وہ بعد میں پہونچے۔ لاہور ہوائی اڈے پر بڑا پرجوش استقبال کیا گیا۔ انٹر نیشنل ہوٹل میں ہم لوگوں کے لئے کمرے پہلے ہی سے متعین کئے جاچکے تھے۔ یہ دنیا کا بہترین ہوٹل سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی اس کی شاخیں قائم کی گئی ہیں دوسرے مندوبین بھی یہیں ٹھہرائے گئے تھے۔ دوسرے دن صبح

سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کا ذکر برابر آتا رہا ہے، وہ دارالمصنفین کے عاشق بھی ہیں اور محسن بھی گذشتہ سال حکومت پاکستان سے دارالمصنفین کی کتابوں کے حق طباعت کے سلسلے میں جو معاہدہ ہوا تھا، اس کا ان کا نمایاں حصہ تھا، پاکستان کے جلیل القدر مصنف ہیں، ان کی "شعرائے کشمیر" جو کئی جلدوں میں ہے بہت مقبول ہے۔ انگریزی، اردو اور سندھی میں بکثرت کتابیں لکھی ہیں، میری نظر میں تو وہ پاکستان کے PRINCE SCHOLAR ہیں، انتہائی محبت سے ملے، گلے لگایا، اور حالات پوچھتے رہے۔ ان کی صحت ادھر گر رہی ہے، کئی آپریشن کرا چکے ہیں، میرے آنے کے تیسرے دن ان کو قلب کا دورہ پڑ گیا اور اسپتال میں داخل کر دیئے گئے، اس سے میری خوشی افسردگی سے بدل گئی، حالی دہلی غالب سے ملنے کے لئے آتے تھے، میں پاکستان آتا ہوں تو وہ پیش نظر ہوتے ہیں، مجھ کو اس طرح نوازتے ہیں، کہ میں کہتا ہوں کہ میرا اصلی پاکستان ان کا دولت کدہ ہے، ان کے اسپتال جانے سے میں بے کیف ہوگیا، دیکھنے گیا، الحمدللہ اچھے تھے، امید ہے کہ جلد مکمل صحت ہو جائے گی، ان کے لئے ہر ایک گو دعا گو ہے، چیف مارشل لا اڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق بھی ان کی عیادت کے لئے اسپتال تشریف لائے تھے، ان کے ساتھ ہوٹل میں پروفیسر عبدالرشید

بھی تھے، جنہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تقریباً چوالیس سال زندگی گذاری ہے، پروفیسر محمد حبیب کے بعد عرصہ تک وہاں کے شعبۂ تاریخ کے صدر بھی رہ چکے ہیں، اب بہت بوڑھے ہو چکے ہیں، مگر باتوں میں بالکل جوان ہیں، بہت ہی دلچسپ اور ظرافت آمیز گفتگو کرتے ہیں علی گڈھ کے عاشقوں میں سے ہیں، گھنٹوں علی گڈھ سے متعلق باتیں کرتے ہیں، وہاں کی جزوی باتوں سے بہت باخبر ہیں، بعض چیزیں تو میرے لئے بھی نئی تھیں، میری تصانیف سے اچھی طرح واقف ہیں، علی گڈھ کے رشتہ سے بڑی محبت سے ملے۔ جناب راشدی صاحب ہی کے کمرے میں پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانی سے ملاقات ہوئی۔ جن سے امیر خسرو کے جشن صد سالہ کے موقع پر برابر بے تکلفانہ انداز میں ملنے کا موقع ملا تھا، نسلاً کشمیری ہیں۔ ایم۔ اے کی ڈگری بنارس ہندو یونیورسٹی سے حاصل کی، سنسکرت اچھی طرح جانتے ہیں، لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی، مشرقی پاکستان میں آثار قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ پھر ڈھاکہ میں شعبۂ تاریخ میں ریڈر رہ چکے ہیں، پشاور یونی ورسٹی میں بھی رہے، آج کل اسلام آباد یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ بڑے اچھے مقرر ہیں، مختلف موضوعات پر ۲۳ کتابیں لکھ چکے ہیں۔

ان کتابوں میں پاکستان کے گندھارا آرٹ اور پاکستان کی مختصر تاریخ بھی شامل ہیں، حکومت پاکستان کی طرف سے ان علمی خدمات کی بنا پر ان کو ستارۂ امتیاز بھی ملا ہے، بارہ۱۲ جلدوں میں ایک مفصل تاریخ پاکستان بھی پیش نظر ہے، اس سلسلہ میں کہتے تھے کہ پروفیسر شیخ عبدالرشید نے ان سے

کہا کہ اب یہاں یہ رجحان ہو گیا ہے کہ پاکستان کی تاریخ ۱۹۳۰ء سے شروع کی جاتی ہے، لیکن قرونِ وسطیٰ کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں ہے، اس عہد کے مسلمانوں کی تاریخ پر بھی زور دینا چاہئے، سیاسی اور جنگی تفصیلات سے قطع نظر اس دور میں جو تمدنی، معاشی اور معاشرتی حالات رہے ہیں ان کو پورے طور پر سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں دارالمصنّفین میں جو تاریخیں لکھی گئی ہیں، ان کی تعریف کی، پروفیسر وانی نے میری لکھی ہوئی تاریخیں خود پڑھی ہیں، اور طلبہ سے بھی پڑھوائی ہیں، "بزمِ مملوکیہ" میں، میں نے لکھا ہے کہ امیر خسرو کے ساتھ ان کے معاصر مشہور شاعر شمس دبیر بھی دہلی سے بنگال گئے تھے، کچھ عرصہ کے بعد امیر خسرو دہلی واپس آگئے، مگر شمس دبیر وہیں رہ گئے۔

وانی صاحب نے بتایا کہ یہ شمس دبیر آگے چل کر بنگال کے سلطان ہو گئے تھے۔ ان کی یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوئی میں نے کہا اس بارہ میں خاصی تحقیق کی ضرورت ہے،

سید حسام الدین راشدی صاحب کے گھر ہی میں بشیر احمد ڈار صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، وہ پہلے کراچی میں تھے۔ اب اپنے وطن لاہور چلے آئے ہیں، راشدی صاحب، پروفیسر عبدالرشید اور ڈار صاحب ایک دوسرے کے فدائی اور شیدائی ہیں، کراچی جب بھی آنا ہوا تو ان تینوں حضرات کی مجلسوں میں شرکت کا موقع ملا، بڑی دلچسپ علمی صحبت ہوتی تھی، بذلہ سنجیوں اور زمزمہ

بستیوں کی بڑی رنگین بہاریں دیکھنے میں آتی تھیں، ڈار صاحب بڑے مخلص مسلمان ہیں، خدا ترسی اور صداقت شعاری کے ساتھ وضع داری بھی بے مثل ہیں، اور اقبالیات کے ماہر ہیں، اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر بھی رہ چکے ہیں، اقبال، بزم اقبال اور "پاکستان فلوسفیکل جرنل" کے اڈیٹر بھی تھے۔

اقبال پر ان کی حسبِ ذیل کتابیں ہیں:۔ (۱) اقبال، (۲) اے اسٹڈی ان اقبال فلوسفی۔ (۳) اقبال اینڈ پوسٹ کینٹین ولنٹرزم Iqbal and Postkantian Voluntarism. اقبال کی گلشن راز جدید، اور پس چہ باید کرد کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ اور اب مسافر اور جاوید نامہ اور ارمغان افغان کا ترجمہ کر رہے ہیں، اقبال کے خطوط اور مضامین بھی ایڈٹ کر کے شائع کیے ہیں، ان کے علاوہ انگریزی میں بکثرت مضامین لکھے ہیں، لیکن اپنے علمی کارناموں کے باوجود بہت ہی منکسر المزاج اور قناعت پسند ہیں، کسی اعزاز کے نہ خواہاں ہیں، نہ جویاں، ان سے ملتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اپنے کسی قریبی شفیق بزرگ سے مل رہا ہوں، جب کہیں ملاقات ہو جاتی ہے، بہت ہی خلوص اور شفقت سے ملتے رہیں دار المصنفین کے بڑے قدر داں ہیں، جس بزرگانہ محبت سے وہ مجھکو راشدی صاحب کی عیادت کے لئے اپنے ساتھ اسپتال لے گئے اس کی یاد کی شمع میرے ذہن میں برابر روشن رہے گی،

ہوٹل ہی میں جناب نبی احمد بلوچ سے بھی شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ ہماری مطبوعات کے حقِ طباعت کے سلسلہ میں دار المصنفین اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے درمیان معاہدے کے بارے میں غیر معمولی مدد کی تھی، وہ اخلاق و شرافت کا پیکر

ہیں، ان کا دل دیکھا جائے تو شاید گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح رنگین اور حسین نظر آئے پہلے سندھ یونیورسٹی میں وائس چانسلر تھے، پھر حکومت پاکستان کے ثقافتی امور کے سیکریٹری ہوگئے۔ آج کل آثار قدیمہ، کلچر اور اسپورٹس ڈویژن کے افسر آن اسپیشل ڈیوٹی ہیں، اقبال کے صد سالہ جشن کی بہت سی ذمہ داریاں بھی ان کے سر تھیں، ہر وقت مہمانوں کی خاطر داری بلکہ مزاج داری میں لگے رہتے تھے، علی گڈھ میں تعلیم پائی ہے، اس لئے علی گڈھ والوں سے بڑی محبت سے ملتے ہیں، سندھی اور انگریزی میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

جناب قدرت اللہ شہاب سے بھی ملاقات ہوئی، جو دار المصنفین کے بڑے عنایت فرما ہیں۔ ذمہ دارانہ مصروفیت کے باوجود مختلف کتابوں کے مصنف بھی ہیں، بزرگانِ دین سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں، اخلاق و مروت کے پیکر ہیں، گفتگو میں بڑی شیرینی ہے، اور ہر وقت دلداری و دلجوئی کا خیال رہتا ہے، کہیں سے یہ ظاہر ہونے نہیں دیتے کہ وہ پاکستان کی حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اجمل صاحب سے بھی ملا، جو دار المصنفین اور نیشنل بک فونڈیشن کے درمیان جب ہماری مطبوعات کے بارے میں معاہدہ ہوا تھا تو انھوں نے اس سلسلہ میں بڑی مدد کی تھی، اس وقت وہ وزارتِ تعلیم میں سیکریٹری تھے، اب اسلام آباد میں قائد اعظم یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر ہیں، آج کل مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات کا نفسیاتی

تجزیہ کرنے میں مشغول ہیں۔

ڈاکٹر اے۔ ڈبلیو۔ بالی پوتا صاحب سے ملاقات ہوئی تو بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں پاکستان آیا تھا تو اُس وقت اسلام آباد کے اسلامک ریسرچ انسٹیٹوٹ کے ڈائرکٹر تھے۔ اور اسلامک ریسرچ انسٹیٹوٹ کی تمام مطبوعات دارالمصنفین کو نذر کی تھیں، جو اس وقت ہمارے کتب خانہ کی زینت ہیں، انھوں نے شاہ ولی اللہ پر اکسفورڈ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس موضوع پر ان کی نظر بہت وسیع ہے، آج کل سندھ یونیورسٹی میں ہیں دینداری، ملنساری شرافت، مروت، اور محبت کے پتلے ہیں، میں ان سے مل کر پہلی بار اتنا مؤثر ہوا تھا کہ میں نے کراچی ریڈیو سے جو تقریر کی تھی، تو اس میں کہا تھا کہ بالی پوتا صاحب جیسے سیرت اور کردار رکھنے والے لوگوں کی اکثریت پاکستان میں ہو جائے، تو یہ سرزمین سونے کی ہو جائے، ان ہی کے ساتھ ڈاکٹر محمد ابراہیم شیخ خلیل سے ملاقات ہوئی، جو تمام مجمع میں سب سے زیادہ متشرع نظر آئے۔ ان کی لمبی اور منور داڑھی اقبال کے پورے جشن میں نمایاں رہی، لیاقت میڈیکل کالج حیدر آباد سندھ میں پروفیسر تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ سندھی اور ہندی کے شاعر ہیں سندھی میں اقبال پر بہت سے مضامین لکھے ہیں، کہنے لگے کہ وہ معارف کے بہت پرانے خریدار ہیں، معارف کا یہاں آنا بند ہو گیا۔ تو شرق اوسط کے ذریعہ منگانے لگے، اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے، "معارف" سے

اس تعلق کا حال معلوم کر کے دل میں ان کی بڑی قدر ہوئی۔

پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد جالندھری ازراہ کرم میرے کمرہ میں آگئے کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، اسلام آباد کی پیپل یونی ورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر رہ چکے ہیں، حکومت پنجاب کی علماء اکیڈمی کے بانی اور ڈائرکٹر ہیں۔ بڑی محبت سے ملے میری کتاب بزم صوفیہ کے بڑے قدر دان ہیں، ان کا موضوع بھی تصوف ہے انگریزی کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں بعض کے نام یہ ہیں:۔

Concept of God in Islam Confession of Ghazali Quranic Exegesis and Rassalat-e-Taghir اور Qusheri

گذشتہ مرتبہ پاکستان آیا، اور اسلام آباد میں رہا، تو بڑی خاطر کی، اس مرتبہ بھی ان کا اصرار تھا کہ میں لاہور سے اسلام آباد چلوں، اور اسلامک ریسرچ انسٹیٹوٹ میں ایک تقریر کروں کہ دار المصنفین میں کام کس طرح ہوتا ہے، میں نے معذرت کی کہ پہلے مجھے کراچی جانا ہے پھر اسلام آباد پہونچنے کا قصد ہے ان ہی کے ساتھ جناب سید فضل احمد شمسی آئے ہوئے تھے، جن سے اسلام آباد میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں برابر ملاقات ہوتی رہتی تھی، وہ وہاں فلسفہ اور سائیکولوجی یونٹ کے صدر ہیں، انھوں نے انگریزی میں ایک مقالہ البیرونی پر لکھا تھا جو بہت پسند کیا گیا ہے جناب عبد الرحمن سورتی سے بھی ملاقات رہی، ان کے ساتھ اعظم گڈھ میں ڈاکٹر محمد معظم ہی ان کا سلام

پہونچا یا تو بہت خوش ہوئے، یہ مولانا محمد سورتی مرحوم کے لائق فرزند ہیں اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، اسلامک ریسرچ انسٹیٹوٹ اسلام آباد میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ گذشتہ سفر میں بڑی مہمان نوازی کا ثبوت دیتے رہے، علمی بحث کرتے ہیں تو اپنے خیالات کو مؤثر انداز میں منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآنی تعلیمات کو مسلمانوں کے لیے شمع راہ سمجھتے ہیں۔

جناب قدرت اللہ فاطمی، (ڈائرکٹر آر۔سی۔ڈی) اسلام آباد سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، گذشتہ سفر میں اسلام آباد میں جو قیام رہا، تو انھوں نے میری میزبانی، دل داری اور دل جوئی کی ہر قسم کی کوشش کی، ان کا اصرار ہوا کہ میں اسلام آباد پہونچوں تو اُن ہی کے یہاں قیام کروں۔

مولانا اعجاز الحق قدوسی مصنف شیخ عبد القدوس گنگوہی، انتہائی محبت سے ملے صوفیائے ہند و پاکستان پر جو کام انھوں نے کیا ہے اس کی وجہ سے پاکستان میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ تزک جہانگیری کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا ہے، ان کی تصنیف اقبالؒ کے محبوب صوفیہ میری نظر میں بہت ہی مفید تصنیف ہے۔ جس سے اقبال کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ اب وہ اقبال اور علمائے پاک و ہند مرتب کر رہے ہیں، انھوں نے تاریخ سندھ کی دو جلدیں بھی لکھی ہیں ان کے قلم میں بڑی برتا دشی ہے، جس موضوع پر چاہتے ہیں، قلیل عرصہ میں ایک کتاب لکھ ڈالتے ہیں۔ کہنے لگے کہ ان میں لکھنے کا سلیقہ

دار المصنفین کی مطبوعات کے مطالعہ سے پیدا ہوا ہے، میرے ساتھ سایہ کی طرح رہے، جس کے لیے ان کا شکر گذار ہوں، ان کا مولد جالندھر اور سنہ پیدائش ۱۹۰۵ء ہے۔

ڈاکٹر شبنم دل پاکستانی ہیں، لیکن اس وقت سین ڈی ای گو SAN DIEGO کی بین الاقوامی یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ وہ میری تصانیف کی وجہ سے مجھ سے اچھی طرح واقف تھے، اس لئے ہر موقع پر بڑے مخلصانہ انداز میں ملتے رہے، کہنے لگے کہ مولانا انور شاہ، مولانا شبیر احمد اور مولانا سید سلیمان ندوی پر امریکہ میں کام کر رہے ہیں، میں نے حیات سلیمانؔ اور معارفؔ کے سلیمان نمبر کا ذکر کیا، تو بہت ہی اصرار کے ساتھ سو روپے پیش کئے کہ یہ دونوں کتابیں جلد از جلد ان کے پاس بھیج دی جائیں، صوم وصلوٰۃ کے بہت پابند ہیں، حج بھی کر چکے ہیں، دار المصنفین کے ساتھ اتنا اخلاص رکھتے ہیں کہ عرفات میں بھی اسے یاد رکھا، اور اس کی فلاح و ترقی کے لئے دعا کی، بڑے اچھے مقرر ہیں جرأت مندانہ تقریر کرتے ہیں، انھوں نے اپنا ایک انگریزی مضمون بھی دیا، میں نے وعدہ کیا ہے کہ اس کا ترجمہ معارف میں شائع ہو جائے گا۔ کہنے لگے کہ امریکہ سے وہ برابر مضامین معارف کے لئے بھیجا کریں گے، جس کے لئے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

میاں محمد سعید ابھی کم سن ہیں، لیکن ان کی تحریروں میں بڑی تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے، سیالکوٹ ان کا آبائی وطن ہے، لندن کے اسکول

آف اورینٹیل اسٹڈیز سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس وقت امریکہ میں جارج میسن یونی ورسٹی فیرفیکس میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے اپنی انگریزی تصنیف THE SHARQI SULTANATE OF JAUNPUR: A POLITICAL AND CULTURAL HISTORY بھی تھی، جس کو پڑھ کر میں بہت خوش ہوا تھا کہ ایک بڑی کمی پوری ہو گئی اور جو کام یو۔پی۔ میں ہونا چاہئے تھا، وہ لندن میں ایک پاکستانی اہل علم کے ذریعہ ہوا، ان کو جون پور کی تاریخ سے بڑی دلچسپی ہے۔ انھوں نے تذکرۂ مشائخِ شیراز ہند جون پور بھی مرتب کیا ہے، اس کے علاوہ صحائف الطریقہ اور THE ARABS INDIA AND PAKISTAN کے بھی مصنف ہیں، ابھی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن اس کم سنی میں اب تک ۹۵ ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں، میری تمام تصانیف سے اچھی طرح واقف ہیں، دارالمصنفین کے بڑے قدر دان ہیں، وہ میرے ساتھ جس محبت اور اخلاص سے پیش آئے اس کی یاد برابر باقی رہے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے علمی اور تحقیقی کاموں کی وجہ سے ہندوستان کے علمی حلقوں میں اسی طرح مقبول ہیں، جس طرح پاکستان میں ہیں، ان کی علمی سرگرمی کی ابتدا تو "سر سیّد احمد خان اور ان کے نامور رفقاء" اور "فارسی ادبیات میں ہندوؤں کا حصہ" سے ہوا لیکن اس وقت تک ۲۸ کتابوں کے مصنف بن چکے ہیں۔ اقبال پر ان کی تصانیف "مسائل اقبال" اور "مقاصد اقبال" بہت مقبول ہیں، اردو میں جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام یہاں تیار ہو رہی ہے اس کی

کے اس وقت چیف ایڈیٹر ہیں، اب تک اس کی پندرہ جلدیں تیار ہو چکی ہیں، جن کی لکھائی چھپائی، اور جلد بندی بہت عمدہ ہے۔ اس ... ایک بڑی کمی پوری ہو رہی ہے بلکہ اردو زبان کے وزن اور وقار میں اضافہ بھی ہو رہا ہے، وہ ملے تو کہنے لگے کہ میں تو مولانا سید سلیمان ندوی ہی کا پروردہ اور شاگرد ہوں، اور دارالمصنفین کے مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہوں ان کی زبان سے یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اپنے استاد مرحوم کے ادارہ پر فخر محسوس ہوا۔ جشن اقبال کی مشغولیتوں ہی کے درمیان ڈاکٹر صاحب نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے دفتر میں ایک تقریب منعقد کی جس میں ڈاکٹر اقبال کے ہم جلیس، شیدائی، اور فدائی جناب نذیر نیازی کو ایک سپاسنامہ پیش کر کے ان کی خدمت میں دس ہزار کا نذرانہ پیش کیا، ڈاکٹر سید عبداللہ اب ثقل سماعت میں مبتلا ہو گئے ہیں، اور کان میں آلہ لگائے رہتے ہیں لیکن تقریر بڑی دلچسپ اور فاضلانہ کرتے ہیں، یہ تقریب جسٹس انوار الحق تیمیہ کی صدارت میں ہوئی، اس کے خصوصی مہمان استانبول یونی ورسٹی کے فارسی کے پروفیسر عبدالقادر کارہاں، تھے، جناب احمد ندیم قاسمی نے سپاسنامہ پڑھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے از راہ کرم مجھ کو اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو بڑے اصرار کے ساتھ اس تقریب میں مدعو کیا، جشن کی ہماہمی کے موقع پر ہم لوگوں کا اس تقریب میں بروقت پہونچنا بہت مشکل تھا، لیکن جناب یعقوب ہاشمی ممبر ملک پروس کمیشن کی توجہ سے مشکل آسان ہو گئی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد ڈاکٹر سید عبداللہ کے شاگرد رہ چکے ہیں وہ ان کے والد جناب تلوک چند

مخدوم کے بہت قدرداں ہیں، اس موقع پر انھوں نے ان کا ذکر بھی محبت اور عقیدت سے کیا اور پھر خود جگن ناتھ آزاد کی تعریف و توصیف بھی انداز میں کی اس سے وہ بہت متأثر ہوئے۔ بیں نے آزاد سے کہا کہ اگر وہ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا یہ حصہ ٹیپ کر لیتے، تو وقتاً فوقتاً اسے سن سکتے اور ان پر مسرت لمحات کی یاد تازہ ہو جایا کرتی، اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے میری علمی خدمات کا بھی ذکر کیا، اور کلمات تحسین سے نوازا۔

جناب نذیر نیازی صاحب نے بھی بڑی محبت کا اظہار کیا ان کی کتاب "اقبال کے حضور میں" کی ایک ضخیم جلد شائع ہو چکی ہے۔ جس میں نیازی صاحب نے اقبال کی جزئیات زندگی کو بڑی دیدہ ریزی سے جمع کیا ہے۔ اس کی دو اور جلدیں تیار ہو چکی ہیں، خدا کرے وہ بھی جلد شائع ہو جائیں ان سے اقبال کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔

"لکھنؤ کا دبستان شاعری" کے مصنف ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی سے بھی برابر ملاقاتیں رہیں، اب وہ کراچی یونی ورسٹی کے امیریٹس ناچیات اور پاکستان کے ترقی اردو بورڈ کے اہم عہدیدار ہیں۔ اور بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، لندن نیویارک، اور بنکاک میں بھی رہ چکے ہیں، ہوٹل ہی میں ان کے لڑکے اور جرمن بہو سے ملاقات ہوئی جو بہت صاف اردو بولتی تھیں، ان ہی سے معلوم ہوا کہ ان کی ساری اولاد بہت اچھے عہدوں پر مامور رہے، ڈاکٹر ابو اللیث

صدیقی سے بھی برابر ملاقات رہی، اب وہ کراچی یونی ورسٹی کے ایمریٹس
پروفیسر تا حیات، اور پاکستان کے ترقی اردو بورڈ کے اہم عہدیدار ہیں۔ اور
بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، لندن، نیو یارک، اور بنکاک میں بھی
رہ چکے ہیں۔ ہوٹل ہی میں ان کے لڑکے اور جرمن بہو سے ملاقات ہوئی۔ جو
بہت صاف اردو بولتی تھیں، ان ہی سے معلوم ہوا کہ ان کی ساری اولاد بہت
اچھے عہدوں پر مامور ہے، ڈاکٹر ابواللیث نے پاکستان آنے کے بعد بھی متعدد
کتابیں لکھی ہیں، آج کل ڈاکٹر محمد اجمل کے ساتھ "ملفوظات اقبال" اور "اقبال اور
تصوف" لکھنے کی خدمت ان کے سپرد کی گئی ہے۔

خواجہ عبدالوحید سے ملنے میں بڑی خوشی ہوئی، وہ استاذ محترم مولانا سید
سلیمان ندوی کے دوستوں میں تھے، انھوں نے بتایا کہ سید صاحب لاہور آتے
تو ان ہی کے ساتھ قیام کرتے، اب سے کچھ سال پہلے انگریزی میں ایک ہفتہ وار
اخبار "الاسلام" نکالا کرتے تھے، اقبالیات کی ایک کتاب مرتب کی ہے۔
کہتے تھے کہ "تبویب القرآن" لکھی ہے، لیکن ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہے۔
جناب مشفق خواجہ جو اس وقت پاکستان میں اردو ادب کی بڑی خدمت کر
رہے ہیں، انھیں کے لڑکے ہیں۔

"معارف" کے بہت ہی پرانے خریدار کرنل عبدالرشید کو جب معلوم ہوا
کہ میں آیا ہوں، تو وہ تلاش کرتے ہوئے میرے پاس آئے، وہی مجھ کو خواجہ
عبدالوحید کے پاس لے گئے، دہلی سے چلنے لگا تھا تو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب
نے کہا تھا کہ ان سے ضرور ملنا، اور میرا سلام پہونچا دینا، کرنل صاحب "معارف"

میں مضمون بھی لکھا کرتے تھے - ایک زمانہ میں ہندوستان و پاکستان کے تمام اہم رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے، دیر تک دارالمصنفین اور معارف کے متعلق گفتگو کرتے رہے، کہنے لگے کہ اب بینائی کام نہیں دیتی ہے، اس لیے لکھنا پڑھنا بند ہو گیا ہے۔ مگر باتیں زیادہ تر علمی کرتے رہے۔

پروفیسر محمد ایوب قادری کا ذکر معارف کے صفحات میں برابر آیا ہے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں انہوں نے مآثر الامراء اور طبقات اکبری کے اردو ترجمے میں جو مہارت دکھائی ہے اس سے میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے، وہ ملے تو ایسا معلوم ہوا کہ اپنے کسی قریبی عزیز سے مل رہا ہوں، ہر موقع پر ساتھ رہے، اور ہر قسم کی مدد کے لیے تیار رہتے

ڈاکٹر محمد ریاض کا مضمون اقبال پر بھی معارف کی دو قسطوں میں شائع ہو چکا ہے وہ بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے، طہران یونی ورسٹی میں تھے اب اسلام آباد کے فیڈرل گورنمنٹ کالج میں واپس آگئے ہیں۔ اقبالیات پر برابر مضامین لکھتے رہتے ہیں، ان پر کتابیات بھی تیار کی ہے۔

... ڈاکٹر صابر آفاقی مظفر آباد کے گورنمنٹ کالج میں اردو کے استاد ہیں، انہوں نے راج ترنگنی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، جسے میں نے خاص طور سے ڈاکٹر علی گوہری ڈائرکٹر کے تحقیقات فارسی ایران و پاکستان سے مانگ کر حاصل کیا تھا، اس لیے ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، وہ برابر بڑی گرم جوشی اور محبت

اخلاق سے ملتے رہے۔ اقبال اور کشمیر کے عنوان سے بھی ایک کتاب لکھی ہے۔

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی علامہ اقبال یونی ورسٹی اسلام آباد میں فارسی کے استاد ہیں ابھی زیادہ عمر نہیں ہے۔ لیکن بہت سی کتابیں اُردو اور فارسی میں لکھ لی ہیں، داتا گنج بخش، اردو زبان پر فارسی کے اثرات فارسی ادب کی مختصر تاریخ وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، دیوان عمیدی طہرانی بھی ایڈٹ کیا ہے، اقبالیات پر کتابیات بھی تیار کی ہے۔ علامہ محمد اقبال پر برابر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد باقر تو اب استادوں کے استاد ہیں۔ اسلامیہ کالج لاہور اور پنجاب یونی ورسٹی کے پروفیسر ہونے کے ساتھ اورنٹیل کالج لاہور کے پرنسپل رہ چکے ہیں لندن اور نیویارک کی یونی ورسٹیوں میں جا کر پڑھایا ہے۔ ان کی کتاب "لاہور" میری میز کے سامنے الماری میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اس لیے ان سے بڑے شوق سے ملا۔ انھوں نے ساہیوال پر بھی ایک اچھی کتاب انگریزی میں لکھی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ فارسی تذکرہ "مخزن الغرائب" کو ایڈٹ کر رہے ہیں، اس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، یہ دونوں جلدیں دار المصنفین کو بطور ہدیہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔

ادارہ ثقافت اسلامی لاہور کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد سعید سے پاکستان کے گذشتہ سفر میں اسلام آباد میں ملاقات ہوئی تجدید ملاقات سے بڑی مسرت ہوئی، فلسفہ پر نصف درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، "اقبال اور پاکستان"

فلوسفیکل جرنل" کے اڈیٹر بھی رہے، پروفیسر محمد شریف نے ہسٹری آف مسلم فلوسفی جو دو جلدوں میں لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے بھی بڑی مدد پہونچائی انگریزی میں ان کی کتاب اکسٹنڈ برانز افبالس تھاٹ اینڈ آرٹ ہے بڑے خلیق ملنسار اور دوست نواز ہیں، ادارہ ثقافت اسلامیہ کی مطبوعات دارالمصنفین کو نذر کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی اب پرانے ندویوں میں شمار ہوتے ہیں ہمارے مولانا عبدالسلام قدوائی اور رئیس احمد جعفری کے گہرے دوستوں میں ہیں، اپنی عربی دانی اور خطابت میں شروع سے ہی ممتاز ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں حکیم اجمل خان کی زیر صدارت ندوہ کے اجلاس کان پور میں ان کی عربی تقریر نے دھوم مچادی تھی آج کل ثقافت اسلامیہ لاہور سے وابستہ ہیں، اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں اپنی ضعیفی اور علالت کی وجہ سے وہ جشن اقبال میں نہیں آسکے تھے میں خاص طور پر ادارہ ثقافت اسلامیہ ان کی مزاج پرسی کے لیے گیا میرے اس فرط تعلق سے وہ بہت مسرور ہوئے۔

پروفیسر شریف المجاہد سے ملاقات جناب حسام الدین راشدی صاحب کی وساطت سے بہت پرانی ہے، اس موقع پر اس کی تجدید ہوئی، مدراس اسٹیٹ نورڈ، میک گل اور رسیر اکیڈ یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی ہے، بڑے وسیع النظر ہیں، کراچی یونیورسٹی میں جرنلزم کا شعبہ قائم کیا اس کے پروفیسر بھی رہے امریکہ کی کئی یونیورسٹیوں کے بھی پروفیسر رہ چکے ہیں اس وقت کراچی میں قائداعظم اکیڈمی کے ڈائرکٹر ہیں، پاکستان کی طرف سے جو ہسٹری آف فریڈم موومنٹ

لکھی گئی ہے۔ اس میں ان کے لکھے کئی ابواب ہیں بڑی اچھی علمی اور سیاسی گفتگو کرتے ہیں۔

پروفیسر ابوالخیر کشفی سے بھی ملاقات رہی، اس وقت وہ کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ ثاقب کانپوری کے صاحبزادے ہیں۔

ڈاکٹر محمد جہانگیر خان ڈائرکٹر ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان پنجاب یونی ورسٹی خود بڑھ کر جس محبت اور اخلاص سے ملے، اس کا نقش دل پر برابر قائم رہے گا کیمبرج یونی ورسٹی کے بی اے۔ ڈی لٹ۔ بیرسٹری کی بھی ڈگری ہے، پنجاب کے مختلف کالجوں کے پرنسپل رہے مغربی پاکستان کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن بھی تھے جنرل ایوب کے زمانہ میں مغربی پاکستان کی وزارت تعلیم کے منسٹر اور جوائنٹ سکریٹری تھے۔ یورپ کے ممالک کی سیاحت بھی کی ہے۔ اپنے زمانہ میں کرکٹ کے مشہور کھلاڑی بھی رہ چکے ہیں۔ ان تمام مراتب واعزازات کے باوجود بڑے ملنسار ہیں، ان کی گفتگو میں بڑی سنجیدگی اور متانت تھی، اپنی ریسرچ سوسائٹی کی مطبوعات میرے لئے خاص طور پر بھیجیں مگر غلطی سے دوسرے صاحب کے پاس چلی گئیں، وعدہ کیا ہے کہ وہ پھر ان مطبوعات کو دارالمصنفین کی نذر کر دیں گے۔

ہندوستان میں اقبال کے جشن صد سالہ کے موقع پر جو وفد گیا تھا اس کے ارکان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، ان میں ڈاکٹر طعمۃ الدین احمد

وقت اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور کے ڈائرکٹر ہیں، وہ میرے استاد پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی کے داماد ہیں، اس لئے بڑی یگانگت سے ملے، پاکستان کے گذشتہ سفر میں بھی ان کی عنایتوں سے بہرہ مند ہوا تھا، پہلے ڈھاکہ یونی ورسٹی میں اردو کے استاد تھے، لندن جاکر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی، اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے بہت مقبول ہیں، اقبال اور یورپ، اقبال اور مسلم ورلڈ، اقبال اور قائد اعظم کے عنوانات سے کتابیں بھی لکھی ہیں۔

ہندوستان جو وفد گیا تھا، اس کے ایک اور اہم رکن عبدالوحید قریشی تھے، جو اس وقت پنجاب یونی ورسٹی میں اسلامیات اور مشرقیات کے ڈین ہیں، یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اس وقت تک ۳۶ کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں اور تین سو سے زیادہ مضامین لکھے ہیں، ان کا سالِ پیدائش ۱۹۲۵ء ہے، ان کی نوازشیں برابر ممنون کرتی رہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی سے ہندوستان کا علمی اور ادبی حلقہ اچھی طرح واقف ہے، وہ بھی پاکستانی وفد کے ساتھ دہلی گئے تھے، اس وقت اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل ہیں، لندن اور امریکہ میں بھی وزیٹنگ پروفیسر رہ چکے ہیں، اردو شعر و ادب میں اپنی ناقدانہ نظر کی وجہ سے بڑی عزت اور مقبولیت رکھتے ہیں۔ بیس کتابوں کے مصنف ہیں، اور سولہ کتابیں ایڈٹ کی ہیں۔ بڑے تپاک سے ملے۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ہوٹل میں میرے کمرے کے سامنے والے کمرہ

ہی میں ٹھہرے تھے ان کی مشہور شخصیت سے اس برصغیر میں کون واقف نہ ہوگا، عالمگیر شہرت کے مالک ہیں، آئنسٹائن کے نظریہ اضافیت کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، تقسیم سے پہلے عثمانیہ یونی ورسٹی میں ریاضیات کے پروفیسر اور وائس چانسلر رہ چکے ہیں، پاکستان میں پشاور، سندھ اور اسلام آباد یونی ورسٹیوں کے وائس چانسلر ہوئے، پھر امریکہ میں کولمبیا اور کئی دوسری یونی ورسٹیوں میں وزٹنگ پروفیسر رہے، یونسکو میں بھی ان کو عہدے ملتے رہے، پاکستان کی اکیڈمی آف سائنس کی صدارت کے فرائض بھی بہت دنوں تک انجام دے چکے ہیں۔ پاکستان کے ہر حلقہ میں بڑی عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، باتوں میں بڑی متانت اور سنجیدگی ہوتی ہے۔ اقبال کے بڑے عقیدت مند اور مداح ہیں۔ ان کے زمان و مکان کے فلسفہ کو اُردو میں بہت اچھی طرح سے سمجھایا۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کو پہلی دفعہ ۱۹۱۲ء میں دیکھا تھا، ۱۹۷۵ء میں امیر خسرو کے ہفت صد سالہ جشن کے موقع پر ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اس مرتبہ تجدید ملاقات ہوئی۔ میری تصانیف کے قدردان ہیں، اس لئے بہت محبت سے ملے، سید صاحب کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں، سید صاحب اور ڈاکٹر اقبال کے تعلقات پر ایک بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے ہم جلیس تھے، کہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب ان کو ماسٹر صاحب کہا کرتے تھے، کیوں کہ وہ شروع میں ایک اسکول کے ماسٹر رہے تھے، سید صاحب بھی ان کی بڑی قدر کرتے تھے، ہندوستان کے مسلمان

حکمرانوں کے عہد کی تعمیرات، مصوری اور فنون لطیفہ کے بڑے ماہر مجھے جانتے ہیں مجھ سے گجرات کے سلاطین کے عہد کی تمدنی تاریخ کی فرمائش کی ہے یہ دار المصنفین کی مطبوعات میں سے ہے میں نے ان کی خدمت میں پیش کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

اُردو کے مشہور شاعر فیض احمد فیض کا اس وقت برصغیر میں طوطی بولتا ہے، وہ جب کہیں ملتے بہت ہی شرافت و حسنِ اخلاق سے پیش آتے۔

پاکستان سے باہر کے نمائندوں میں ڈاکٹر غلام رضا صابری تبریزی سے بھی ملاقات رہی، یہ دہلی کے اقبال کے بین الاقوامی سیمینار میں شریک ہوئے تھے اور وہاں میرے مقالہ کو بہت پسند کیا تھا، وہ آذربائیجان کے رہنے والے ہیں، اس وقت ایڈنبرا یونی ورسٹی میں فارسی کے اُستاد ہیں، بڑے حریت منفرد ہیں، بڑی بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، اقبال کے شیدائی ہیں، مستشرقین کو پسند نہیں کرتے کہنے لگے کہ یہ ریاکار اور جھوٹے ہوتے ہیں، اسلام پر کتابیں اور مقالے لکھ کر عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔

لندن کے اسکول آف اورینٹل اور امریکن اسٹڈیز کے پروفیسر رالف رسل کی ملاقات کا بھی ذکر ہے، اردو بہت بے تکلفی سے مدرسے میں اس طرح گھل مل کر رہے ہیں جیسے پاکستان ہی کے ہیں، غالب پر ان کی کئی کتابیں ہیں، یہ جشن ایسا شاندار تھا کہ مجھ سے نمائندہ نے کہا کہ ایسی شاندار کانگریس میں نے کہیں نہیں دیکھی، ڈاکٹر محمد اجمل وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ڈاکٹر خالد حمید شیخ صدر ہاشمی اور ڈاکٹر ریاض الرحمٰن ڈائرکٹر انسٹیٹیوٹ آف

یکریٹری کو مہمانوں کی میزبانی میں سرگرم پایا۔

(۲)

علامہ محمد اقبال کی بین الاقوامی کانگریس میں جن پاکستانی مندوبین سے ملنے کا موقع ملا، ان کا ذکر گذشتہ اشاعت میں ہو چکا ہے، اس اجتماع میں آسٹریلیا، بلجیم، کناڈا، زیکوسلوکیا، مصر، فن لینڈ، فرانس، انڈونیشیا فلپائن، رومانیہ، سری لنکا، سوڈان، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، شام، تیونس ترکی، انگلستان، اٹلی، امریکہ، مغربی جرمنی، اور آئرلینڈ وغیرہ کے نمائندے بھی تھے، زیکوسلوکیا کے ڈاکٹر جان مارک پراگ میں مشرقی علوم کے استاد ہیں، اردو بھی پڑھاتے ہیں، دہلی میں اقبال پر جو بین الاقوامی سیمینار ہوا تھا وہ اس میں بھی شریک ہوئے تھے، اردو بہت اچھی بولتے ہیں، دہلی ہی میں ان سے بے تکلفی ہو گئی تھی، اس لئے لاہور میں ان کی ملاقات تو بڑی گرم جوشی رہی، روم سے پروفیسر الاسندرو بوسانی آئے تھے وہ وہاں اسلامیات کے پروفیسر ہیں نزک ہیں، لیکن فارسی اور اردو بھی بولتے ہیں، فارسی میں تو بڑی اچھی تقریر کرتے ہیں، عرب ممالک کے نمائندے اس کانگریس میں اس طرح نمایاں حصہ لیتے ہوئے نظر نہیں آئے، جس طرح بین الاقوامی سیرت کانگریس میں نظر آتے تھے۔

اس کانگریس کے لئے بکثرت مقالات آئے تھے، جن کی چار ضخیم جلدیں سائکلو اسٹائل کر کے تمام مندوبین کو پہلے ہی دے دی گئی تھیں، دو اور

جلدیں زیر ترتیب تھیں ہر نمایندے کو ایک بریف کیس دے دیا گیا تھا۔
جس کے اندر پروگرام، نمایندوں کے تعارف اور دوسرے ضروری
کاغذات کے ساتھ ایک سونے کا تمغہ بھی تھا، جس پر فرسٹ اقبال
سنٹنری، اور یہ شعر کندہ تھا۔

آدمیت احترام آدمی باخبر شو از مقام آدمی

اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا کرسٹ بھی تھا، تاکہ شناخت کے لیے
نمایندے اپنے لباس پر لگا سکیں، بریف کیس کے اندر حسب ذیل کتابیں بھی
تھیں، (۱) پس چہ باید کرد ... کا انگریزی ترجمہ جو جناب بشیر احمد ڈار
کا کیا ہوا تھا، ان کے متعلق ذکر آچکا ہے کہ وہ اقبالیات کے بہت بڑے
ماہروں میں ہیں، (۲) Message from the East.
از محمد ہادی حسین۔ (۳) کتابیات اقبال از رفیع الدین ہاشمی (۴)
The place of God, Man and universe
in the philosophical system of Iqbal.
از ڈاکٹر جمیلہ خاتون، (۵) ثقافت کا اقبال نمبر (۶) الفلاح کا اقبال نمبر
(۷) حصول پاکستان، از پروفیسر احمد سعید اور فارسی جریدہ ہنر مردم کا
اقبال نمبر، ان تحائف کے ساتھ ایک سیاہ رنگ کی جناح کیپ بھی تھی۔

۲ دسمبر ۱۹۷۷ء کی صبح سے کانگریس کی کارروائی شروع ہو گئی، تمام
نمایندے انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل ہی میں ٹھہرائے گئے تھے، اس لئے ناشتے اور

کھانے میں ملاقات اور گفتگو کا موقع برابر ملتا رہتا تھا اپنے یہاں دہلی میں اس کی بڑی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اندرون ملک کے نمائندوں کے قیام کا انتظام وہاں نہیں تھا، یہ لوگ ذاتی طور پر جہاں موقع ملا ٹھہر گئے تھے۔ اس لیے ان کو ایک دوسرے سے بے تکلفانہ ملاقاتوں کا موقع نہیں ملتا تھا۔ پاکستان میں یکجائی قیام سے تبادلۂ خیالات کا خوب موقع ملتا تھا۔ ناشتے اور کھانے میں تنوعات تو مسلمانوں کے دسترخان کی خصوصیت ہے۔ لیکن پاکستان بہت امیر ملک نہیں۔ اس لئے اس کی دعوتوں میں عہد ماضی کی امیرانہ شان کے بجائے سادگی کا لحاظ رکھا جائے تو اچھا ہے

کانگریس کی کارروائی کا آغاز علامہ محمد اقبال کے مزار پر حاضری سے کیا گیا جو بادشاہی مسجد کے پھاٹک کے بائیں جانب پر واقع ہے، اس کا ڈیزائننگ مرمر کا ہے، فاتحہ خوانی کا منظر بڑا ہی پرکیف تھا، ٹیلی ویژن کا عملہ اور فوٹو گرافر ہر طرف دوڑ رہے تھے، نمائندے بادشاہی مسجد کے اندر بھی گئے، دہلی کی جامع مسجد میں جو حسن ہے، وہ تو اس میں نہیں ہے۔ لیکن اب اس کی پوری مرمت کر کے اس کی ہر چیز میں خوش سلیقگی اور نفاست پیدا کر دی گئی ہے، پاکستان کو اب اس مسجد پر اسی طرح ناز ہو سکتا ہے، جس طرح کہ ہندوستان کو دہلی کی جامع مسجد پر ہے۔

وہاں سے ہم لوگ جاوید منزل آئے، جو علامہ محمد اقبال کی آخری رہائش گاہ تھی، ان کے لڑکے ڈاکٹر جاوید اقبال سے حکومت پاکستان نے اسے خرید لیا ہے، اب یہ ایک میوزیم بن گیا ہے، یہاں وہ چیزیں بھی دیکھیے جو علامہ اقبال کو میٹرک

بی۔اے اور ایم۔اے کے امتحانات میں ملے تھے، وہ سرٹیفکیٹ بھی رکھے ہوئے تھے جو کیمبرج اور میونخ یونی ورسٹیوں سے ان کی ڈگریوں کے سلسلہ میں ملے تھے، پنجاب، علی گڑھ اور الہ آباد یونی ورسٹیوں نے ان کو ڈی لٹ کی جو اعزازی ڈگریاں دی تھیں، ان کی سندیں بھی رکھی ہوئی تھیں ان کے استعمال میں جو فرنیچر تھے، وہ بھی محفوظ کر دیئے گئے ہیں، ان میں ایک نیوار کی کھاٹ، ایک ڈریسنگ ٹیبل، ایک صوفہ، تین آرام کرسیاں، دو چھوٹی چھوٹی میزیں، چھ کھانے کی کرسیاں ایک گھومنے والی الماری اور ایک تخت پوش، سب چیزیں سلیقہ سے رکھی تھیں، کمروں میں وہ قالین بھی تھے، جو ان کو شاہ افغانستان نادر شاہ مرحوم اور شہنشاہ ایران نے دیئے تھے، نادر شاہ مرحوم کے دیئے ہوئے قالین ویسے ہی تھے، جیسے استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کو ملے تھے، علامہ اقبال کے ملبوسات میں کچھ سوٹ، کچھ اونی پائجامے، قمیصیں، شلواریں اور تولیے بھی رکھے ہوئے تھے، ان میں ایک لنگی بھی تھی، پاس ہی لوہے کے بکس اور چمڑے کے سوٹ کیس بھی رکھے ہوئے تھے، اس سامان میں پیتل کے نیچے کا ایک حقہ بھی دکھائی دیا جس چلمچی اور لوٹے کو وہ استعمال کرتے وہ بھی محفوظ کر دیئے گئے ہیں، ان کا وہ قلمدان بھی رکھا تھا، جس میں دو شیشے کی دواتیں اور بیچ میں ایک ہولڈر ہے، لکڑی کی ایک سرمہ دانی بھی دیکھی، ان کے کچھ جوتے اور سلیپرس بھی تھیں علامہ محمد اقبال نے مولوی محمد دین فوق، مہاراجہ کشن پرشاد، مولانا گرامی مولانا غلام مرشد، مولانا احمد علی، مولانا ظفر علی خاں، سید حبیب، مولوی نور الحق

سید عبدالقادر، مولانا ابوالحسن، غلام رسول مہر، اور مولوی عبدالحق کو جو خطوط لکھے تھے، وہ بھی یہاں محفوظ کردیئے گئے ہیں۔ کلام پاک کے جو نسخے ان کی تلاوت میں رہتے تھے وہ بھی تھے، ان کے مطالعہ میں جو کتابیں رہتی تھیں وہ بھی محفوظ کردی گئی ہیں، یورپین مصنفوں میں برگسان کی The

Phylosophy of Change اور گی کی

Neitzche in outline and Agnonism

خود نطشے کی تین کتابیں The Twilights of the idols,

The birth of tragedy, The joyful

wisdom کی. براون کی Mystery of space انشٹین کی.

Religious spirit in the poets.

ہال کی اخبار الحلاج، مورڈن کی The interpretation of

Men and memories. روتھنزٹی ڈار کی history

کروس کی Logic کار کی کتاب المقدس، مثنوی مولانا روم (چھ جلدیں)

اور The philosophy of Change نقادی

کی Translation of Arabley - تھیں۔ بس

مجموعہ میں قصیدہ البردہ، اور ایک کتاب "مسلمانوں کے افلاس کا علاج" بھی تھیں۔

میں نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ساتھ بڑی دلچسپی اور انتہائی مسرت کے ساتھ علامہ اقبال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودّے دیکھے، ان کی جن مثنویوں اور نظموں کے مسودّے محفوظ تھے، وہ یہ ہیں (۱) اسرارِ خودی (۲) رموزِ بےخودی شکوہ، شمع و شاعر، پیامِ مشرق، مسافر، زبورِ عجم، جاوید نامہ، پیغام، مذہب شبلی و حالی، بالِ جبریل، پس چہ باید کرد، پیامِ مشرق کے پہلے اڈیشن میں ان کے لکھے ہوئے کچھ اشعار بھی تھے، جس کا اضافہ وہ اس کے دوسرے اڈیشن میں کرنا چاہتے تھے، ذہن میں یہ بات تھی کہ علامہ اقبال اپنے اشعار میں ترمیم نہیں کرتے تھے، جو کچھ کہتے ویسے ہی لکھ دیتے مگر کہیں کہیں ترمیم و اضافہ بھی نظر آیا یہ مسودّے اب بہت قیمتی علمی اور ادبی سرمایہ ہیں، جو بہت ہی شوق سے دیکھے جائیں گے، جاوید منزل کو حکومت نے بہت اچھے حال میں رکھا ہے، آیندہ یہ بہت ہی تاریخی عمارت سمجھی جاتی رہے گی۔

جمعہ کا روز تھا، اس لئے ہم لوگ نماز کے لئے ہوٹل واپس لائے گئے ہوٹل کے پاس ایک چھوٹی سی مسجد تھی اس سے ملحق ایک میدان تھا، جس میں جانمازیں بچھی ہوئی تھیں، مگر یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ اس عاشقِ رسولؐ شاعرِ فلسفہ اسلام کے ترجمان اور ملّت کے حدی خوان کی تعلیمات اور پیغامات سننے کے لئے تو اتنا شاندار اجتماع تھا لیکن اس میں سے نماز جمعہ ادا کرنے والوں کی تعداد بہت ہی کم تھی، قاری محمد ظریف صاحب نے نماز پڑھائی، وہ پنجاب یونی ورسٹی کے شعبہ قانون کے کتب خانہ کے لائبریرین ہیں۔ دیکھنے میں پنجابی

معلوم ہوئے، لیکن گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ ضلع مونگیر (ریاست بہار) کے رہنے والے تھے، اب پاکستانی ہیں، مولانا مناظر احسن گیلانی کے رشتہ داروں میں ہیں، نماز میں اتنی اچھی قرأت کی کہ دل خوش ہو گیا۔

اسی سہ پہر کو کانگریس کا باضابطہ افتتاح پنجاب یونی ورسٹی کے شاہ فیصل ہال میں تھا، ہم لوگ وہاں لے جائے گئے، باہر طلبہ علیحدہ علیحدہ ملکوں کے نام لئے کھڑے تھے، میں علی سردار جعفری صاحب اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ہندوستانی مندوبین کی نشست گاہ پر بیٹھ گیا، ڈائس کی آرائش قابل دید تھی، اس پر بیٹھنے والوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یورپ یا امریکہ کے کسی جلسہ کا منظر پیش نظر ہے، پاکستان کے صدر جناب فضل الٰہی چودھری صاحب اسٹیج پر تشریف لائے، تو قاری محمد ظریف نے تلاوت کلام پاک کی، ان کی قرأت کچھ ایسی سامعہ نواز تھی کہ دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی، اور ساری فضا متاثر نظر آئی، پروفیسر ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا نے انگریزی میں خطبہ استقبالیہ پڑھا اس کے بعد جناب فضل الٰہی چودھری نے علامہ محمد اقبال کی ایک قد آدم تصویر کی نقاب کشائی کی، اس تصویر میں علامہ محمد اقبال شلوار شروانی اور ٹوپی پہنے دکھائی دیئے، ان کے پیچھے قرطبہ کا منظر تھا، اس کے بعد بیرونی مندوبین کا تعارف کرایا گیا، ہم ہندوستانی مندوبین کے نام لئے گئے، تو دیر تک حاضرین تالیاں بجاتے رہے پروفیسر آل احمد سرور اس وقت تک نہیں پہونچ پائے تھے دوسرے دن آئے، تعارف

کے بعد صدر پاکستان جناب فضل الٰہی چودھری نے افتتاحیہ خطبہ پڑھا، اس کے بعد ایک پُر تکلّف چائے کا انتظام تھا، اس میں جناب صدر پاکستان سے خاص طور پر ملاقات کا موقع ملا، میں نے ان کی خدمت میں مولانا سید ابوالحسن ندوی کی دو خاص کتابیں Glory of Iqbal اور Muslim Civilization پیش کیں جن کو انھوں نے تشکریہ کے ساتھ قبول فرمایا، اس موقع پر ان کے سکریٹری اور اے ڈی سی اور فوٹوگرافر انھیں گھیر کر کھڑے ہو گئے، اسی استقبالیہ دعوت میں اپنے سفیر جناب ایس کے۔ ایس باجپائی سے بھی ملاقات ہوئی، وہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آئے، اپنے موٹر پر ہوٹل واپس لائے، ان کے کمرے میں بڑی اچھی صحبت رہی، وہیں پاکستان کے مشہور شاعر فیض احمد فیض صاحب بھی آ گئے، جناب باجپائی اور ان کی اہلیہ نے ہم لوگوں کی بڑی خاطر داری کی۔

اسی رات کو علامہ اقبال سے متعلق جتنی کتابیں اب تک لکھی جا چکی تھیں ان کی بھی نمائش تھی، جو بڑے سلیقہ سے سجائی گئی تھی، اس جشن کی ایک تحریر میں بیان کیا گیا ہے کہ علامہ اقبال پر اب تک دو ہزار کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اس لحاظ سے وہ شکسپیر دانتے اور رابندر ناتھ ٹیگور سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس میں مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی اقبال کامل اور مولانا ابوالحسن ندوی کی "گلوری آف اقبال" بھی تھیں، اس نمائش کو کامیاب بنانے میں جناب رفیع الدین ہاشمی پروفیسر گورنمنٹ کالج سرگودھا نے بڑی محنت کی تھی، ان کی کتابیات

اقبال، اقبال اکیڈمی لاہور سے شائع ہوئی ہے، ان کے ساتھ ڈاکٹر محمد بشیر حسین صدر شعبۂ فارسی، اورنٹیل کالج لاہور بھی بڑی سرگرمی سے شریک رہے نمائش کے بارے میں اظہارِ خیال کے لیے ایک رجسٹر تھا، میں نے بھی اپنے تاثرات اس میں درج کر دیے۔

۳ دسمبر کو مقالات کے پڑھنے اور سُننے کا سلسلہ شروع ہُوا۔ پہلے روز تمام مندوبین ایک ساتھ جمع ہوئے۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر فریدون زند فارسفیر ایران نے کی، ان کے شریک صدر (کو چیرمین) ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا وائس چانسلر پنجاب یونی ورسٹی تھے، سکریٹری کے فرائض خواجہ غلام صادق نے انجام دیے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال نے اقبالؒ اور تصوف کے موضوع پر ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے خیالات پیش کیے کہ دل بہت خوش ہُوا، اس موضوع پر میں جو کچھ سوچ یا لکھ سکتا تھا، اس کی بہت ہی عمدہ عکاسی اور ترجمانی ان کی تقریر میں تھی، اجلاس کے بعد ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ نے بزم صوفیہ کے مصنف کے دل کی باتیں کہہ دیں۔ اسی اجلاس میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا مقالہ "اقبال ہز آرٹ اینڈ تھاٹ" پر تھا، انھوں نے بہت عمدہ اور موثر انداز میں اپنے مقالہ کا خلاصہ پیش کیا، وہ اس وقت اس برصغیر میں اقبالیات کے بڑے ماہروں میں سمجھے جاتے ہیں، اس لیے ان کا مقالہ بہت غور سے سنا گیا۔ اور خوب داد دی گئی۔ اس کے علاوہ دوسرے مقالات کے عنوانات اور مقالہ نگاروں کے اسمائے گرامی یہ تھے۔

(۱) Medival Religiosity of Dante and The Modern Religion of Iqbal.
از پروفیسر الیساندر بوسانی (روم یونی ورسٹی، اٹلی)

(۲) Reflections on Iqbal's mosque
از ڈاکٹر باربرا مٹکاف (پین سلوینیا یونی ورسٹی، امریکہ)

(۳) Iqbal, his message از سید عبدالحی (ڈھاکہ یونیورسٹی)

(۴) Iqbal, a Universal leader از ڈاکٹر عبدالکریم سیتو (جاپان). (۵) Iqbal's Message از ڈاکٹر عبدالقادر کرہان (ترکی) (۶) پروفیسر جلال متینی (ایران) نے اپنے خیالات کا اظہار ایک تقریر کے ذریعہ سے فارسی زبان میں کیا۔

صبح کا یہ اجلاس ۹ بجے سے شروع ہو کر گیارہ بجے ختم ہو گیا، کافی اور چائے کے بعد دوسری نشست ہوئی، اس کی صدارت پروفیسر میر حسین شاہ (افغانستان) نے کی، شریک صدر ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال تھے، اور سکریٹری کے فرائض جناب محمد اسمٰعیل بھٹی نے ادا کیے۔ اس میں حسبِ ذیل مقالات پڑھے گئے۔

(۱) Iqbal's linguistic Situation از پروفیسر جوسی آرد (فن لینڈ) (۲) Iqbal seeing our time and Speaking to-day. از پروفیسر کارل ایلوف (سوئڈن)

Prophetic faith in Iqbal, Buber and Tillich از شیلا میکڈونو (کناڈا) - (۴) "اقبال فی مصر" از ڈاکٹر محمد سعید جمال الدین (مصر) (۵) - Iqbal & Nationality

(۶) Iqbal, poet of ... از جناب جوہر جلال الدین فلپائن

Iqbal and The East از جناب مبارک مغربی (سوڈان)

The third world از پروفیسر کارونارتنے (سری لنکا)

یہ اجلاس ایک بجے ختم ہوا جس کے بعد ایک پرتکلف لنچ ہوا۔ شام کو لاہور میوزیم میں اقبال کو مصوری کے ذریعہ سے پیش کیا گیا، جہاں پاکستان کے مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی، صادقین، اسلم کمال اور عباسی عابدی نے اقبال کے بعض اشعار کو مصور کیا تھا، جن کی قدر و قیمت کا اندازہ مصوری کے ماہرین ہی کر سکتے تھے۔ اس کی رسم افتتاح پنجاب کے گورنر جسٹس اسلم ریاض نے کی۔ وہاں سے واپسی کے بعد انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل میں رات کا کھانا ہوا جو پہلے سے بھی زیادہ پرتکلف تھا۔

۴ دسمبر کو پھر مقالہ خوانی کا اجلاس نو بجے صبح سے شروع ہوا۔ اس کی صدارت روس کے ڈاکٹر سوخا چیونے کی، اور ڈاکٹر جسٹس اس۔ اے۔ رحمان شریک صدر ہوئے۔ سکریٹری ڈاکٹر خالد حمید شیخ تھے، ڈاکٹر جسٹس رحمان پاکستان کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں، شاعر بھی ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، بڑے خلیق اور ملنسار ہیں۔

راقم سطور سے دار المصنفین کے تعلق سے بڑی گرم جوشی سے ملے۔ اِس اجلاس کا آغاز خود ان کے مقالہ سے ہوا۔ جس کا عنوان تھا۔ "اقبال اور اجتہاد" دوسرے مقالات حسبِ ذیل تھے۔

The Importance of Scientific knowledge in Iqbal's Philosophycal Thoughts.

یہ مقالہ نظریہ اضافیت کے مشہور ماہر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے لکھا تھا۔ (ڈاکٹر صاحب تقسیم سے پہلے عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد میں تھے۔ پھر پشاور، سندھ، اور اسلام آباد کی یونی ورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں) (۲) Iqbal and Kashmir از جسٹس محمد یوسف صراف (چیف جسٹس ظفرآباد ہائی کورٹ) (۳) The Illustrious Ancestry of Iqbal از ڈاکٹر محمد باقر (لاہور) (۴) Iqbal's attitude towards Imperialism. از ڈاکٹر جان مارک (چیکوسلواکیہ)

(۵) اقبال اور میراث اسلام۔ از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی (کراچی یونیورسٹی)

(۶) اقبال اور تقدیر امم۔ از۔ ڈاکٹر محمد ریاض (اسلام آباد)۔ (۷) اقبال اور عارفانہ تجزیہ از۔ ڈاکٹر وزیر آغا (لاہور)

مقالات کی کثرت کی وجہ سے ایک ہی وقت میں دو اجلاس کئے جانے لگے۔ اس لیے ایک دوسرے کمرہ میں ۲۸ دسمبر کی صبح کا جو علیحدہ

اجلاس ہُوا۔ اس کے صدر جاپان کے ڈاکٹر عبدالکریم سبنو اور ان کے شریک میاں امیر الدین (صدر مرکزی مجلس اقبال لاہور) ہوئے۔ سیکریٹری پروفیسر ذوالفقار علی ملک تھے۔ اس کی ابتدا میاں امیر الدین کے مقالہ "علامہ اقبال، چند باتیں اور چند یادیں" سے ہوئی دوسرے مقالات یہ تھے۔

(۱) اقبال اور نشاطِ نو۔ از جناب فرمان فتح پوری صاحب (کراچی یونی ورسٹی) (۲) اقبال ایک متکلم کی حیثیت سے از ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل (حیدر آباد) (۳) Iqbal's Views on Nation and Millat از پروفیسر احمد حسن دانی (اسلام آباد یونی ورسٹی) (۴) Iqbal, a member of the Punjab Legislative Council از ڈاکٹر عبدالحمید (لاہور) (۵) اقبال اور پاکستان۔ از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید (لاہور) اس اجلاس میں مولانا امتیاز علی خان عرشی کا مقالہ زمان و مکان کی بحث سے متعلق علامہ اقبال کا ایک مقالہ اور ہارورڈ یونی ورسٹی کی پروفیسر اینے مری شمل کا مضمون اقبال کی شاعری میں ابلیس بھی رکھا گیا تھا۔ مگر خود یہ دونوں لاہور نہ آسکے تھے۔

کافی اور چائے کے بعد ۲۸ دسمبر ہی کو دو اجلاس پھر علیحدہ علیحدہ کمروں میں ہوئے ایک کی صدارت پروفیسر جلال ہتی (ایران) نے کی، ان کے شریک صدر پروفیسر میاں عبدالشکور احسن تھے، جو پنجاب یونی ورسٹی میں فارسی اور علوم مشرقی و اسلامی کے صدر رہ چکے ہیں۔ سیکریٹری ڈاکٹر خواجہ غلام زکریا تھے۔ اس میں حسبِ ذیل مقالات پڑھے گئے۔

Iqbal's philosophy of prayer (۱

Iqbal's (۲) از ڈاکٹر عبدالرؤف (لاہوری)

(۳) از مسز اختر امام (ڈھاکا) nature of the self

Iqbal as a modern interpreter of Islam

Some remarks on از جناب محمد سعید شیخ (لاہور)

The Conception of Iqbal

Is Iqbal a (۵) از ڈاکٹر برنڈ مینوٹل ویشر (جرمنی)

(۶) اقبال از جناب بشیر احمد ڈار (لاہور) Pantheist

In memo- (۷) والقرآن از ڈاکٹر حسین مجیب المصری (قاہرہ)

ry of Iqbal. از ڈاکٹر عبدالرزاق محی الدین (بغدادی)

(۸) علامہ اقبال اور ان کے قارئین از مجتبیٰ حسین (کوئٹہ)

دوسرے کمرے کے اجلاس کی صدارت ترکی کے پروفیسر ڈاکٹر نزہت یال سن تاس نے کی شریک صدر پروفیسر عبادت بریلوی تھے۔ سکریٹری جناب علی عباس ہوتے، اس میں یہ مقالے پڑھے گئے

(۱) علامہ اقبال اور عظمت آدم از پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی (لاہوری) (۲) مکاتیب اقبال کا ادبی جائزہ۔ از جناب آفاق صدیقی (میرپور خاص) (۳) اقبال اور احترام آدمیت۔ از ڈاکٹر آغا یمین خان (لاہور) (۴) The mainspring of Iqbal's

Rumi ،(۵) Life work از محمد ہادی حسین (کراچی)

Iqbal . (۶) and Iqbal از محمد اونڈر جرمنی

and Yeats از مسز برنڈا بایین۔

یہ دونوں اجلاس ختم ہوئے، تو لنچ ہوا سہ پہر میں لاہور کے
شہریوں کی طرف سے شالیمار باغ میں عصرانہ تھا۔ گزشتہ اشاعت میں
ذکر ہو چکا ہے کہ اسی وقت ڈاکٹر سید عبداللہ نے جناب نذیر نیازی کو
ان کی خدمات کے صلہ میں سپاسنامہ اور ایک تھیلی پیش کرنے کی تقریب
رکھی تھی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور مجھ سے انھوں نے بہت اصرار کیا
کہ ہم دونوں اس میں ضرور شریک ہوں۔ شالیمار باغ کی تقریب کچھ وجہ
سے دشواری محسوس ہو رہی تھی مگر ہم دونوں کی جناب محمد یعقوب
ہاشمی ممبر پبلک سروس کمیشن کی عنایت سے یہ مشکل آسان ہو گئی اور ہم
لوگ آسانی سے دونوں تقریبوں میں شریک ہو سکے ہاشمی صاحب
بڑا اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے شعراء کے
اشعار ان کی نوک زبان پر ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ سے رخصت ہو کر ہم
لوگ شالیمار پہونچے۔ اس باغ کے تزک و احتشام اور آرائش و زیبائش
کی دیکھ کر تیموری بادشاہوں کی شان و شوکت اور زیب و زینت کی
تصویر نگاہوں کے سامنے آگئی اور میں عالم خیال میں، اپنی کتاب ...
"ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے" کی ورق گردانی
کرنے لگا۔ اس باغ نے مغل سلاطین کی سیر و تفریح کے کیسے شاندار منظر دیکھے

ہوں گے۔ آج تیموریوں کا جاہ وجلال قصۂ پارینہ ہو چکا ہے غنیمت ہے کہ پاکستانی حکمران ان کی یادگاروں کی حفاظت کر رہے ہیں، اور ان کی رعنائی و زیبائی میں اضافہ کر رہے ہیں۔

شالیمار سے واپسی کے بعد علامہ اقبال کی لڑکی منیرہ صلاح الدین صاحبہ کے دولت کدہ پر ڈنر تھا۔ مندوبین کے علاوہ شہر کے دوسرے معززین بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ہم لوگ پہونچے تو سارا مکان اور شامیانہ بقعۂ نور نظر آیا، نشست کا انتظام بہترین اور کھانے ایک سے ایک بڑھکر تھے، اس ڈنر کے ساتھ ایک محفلِ سماع بھی تھی۔ جس میں اقبال کی غزلیں گائی جا رہی تھیں۔ پروفیسر آل احمد سرور اس دن آگئے تھے۔ اور ڈنر میں شریک ہوئے۔ منیرہ صاحبہ اپنے شوہر جناب صلاح الدین اور اپنے بھائی جاوید اقبال صاحب کے ساتھ مہمانوں کی پذیرائی بڑی خندہ پیشانی سے کر رہی تھیں۔ منیرہ صاحبہ اور جاوید اقبال صاحب دونوں پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے بڑے تپاک سے ملے، آزاد نے کہا کہ اقبال اور اُن کی اولاد کا گھر تو میرا مرکزِ عقیدت اور کعبۂ مقصود ہے، جناب جاوید اقبال نے کہا میں تو آپ کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ منیرہ صاحبہ نے جاوید صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ جب آزاد صاحب آپ کے بھائی ہیں تو وہ میرے بھائی بھی ہوئے۔ پھر آزاد صاحب سے کہا کہ ایک روز ہم تینوں بھائی بہن مل کر اس قسم کے ہنگامے سے الگ کھانا کھائیں۔ دوسرے دن آزاد منیرہ صاحبہ کے

مہمان خصوصی ہوئے۔ اور اُن کے اور جاوید اقبال صاحب کے ساتھ کھانا کھایا۔ یہ پروفیسر آزاد کا بہت بڑا اعزاز تھا۔

میں ہندوستان سے چلا تھا تو نزلہ اور کھانسی میں مبتلا تھا۔ سفر اور ان تقریبات کی مشغولیتوں سے اور خستہ ہو گیا۔ ۵ دسمبر کو مقالہ خوانی کا آغاز ہوا تو اطلاع ملی کہ ایک اجلاس کی صدارت مجھے بھی کرنی ہے۔ سردار محمد اقبال خان شریک صدر (کو چیرمین) مقرر ہوئے۔ جو پنجاب یونی ورسٹی میں لا رکالج کے پرنسپل ہیں۔ اور اپنی قابلیت کیوجہ سے بڑی عزّت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ سکریٹری جناب عبد الخالق صاحب تھے۔ جو پنجاب یونی ورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ اس اجلاس میں زیادہ تر بیرونی مندوبین کے مقالے پڑھے گئے۔ جو حسب ذیل تھے۔ (۱) Image and Symbol in Iqbal Persian quatrains از مسٹر اسکال موکی زبلیم (۲) محمد اقبال از ڈاکٹر شعید و دو دشا بلی (مصر) (۳) Reflections on Iqbal in the hearts (۵) ڈاکٹر محمد سولٹی (ٹیونس) (۴) Kange-i-Rah از محمد رحیم الہام (۶) Iqbal's idea about the time nature of poetry از جے۔ سی۔ برجل (سوئزرلینڈ) (۷) عبد المعین الموفی (دمشق) نے بھی اقبال پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، دو اور مقالے پڑھے نہ جا سکے۔

جب یہ اجلاس ختم ہوا۔ تو مجھے صدر کی حیثیت سے اپنے خیالات پیش کرنے کے لئے کہا گیا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھکو یہ صدارت دے کر ہندوستان کے ساتھ پاکستان کی طرف سے جذبۂ خیر سگالی کا اظہار کیا گیا ہے اور علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ادارہ دار المصنفین کی قدر دانی کی گئی ہے، جس کے لئے میں تہِ دل سے شکر گذار ہوں۔ میں نے پھر کہا کہ ہندوستان میں بھی کچھ دنوں پہلے اقبال پر ایک بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا تھا۔ ممکن ہے۔ اس کانگریس کے برابر وہ شاندار و پُرشکوہ اور دلآویز و دلنواز نہ ہو۔ لیکن میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ پورے طور پر شاعر مشرق کی شان، رتبہ اور وقار کے مطابق تھا۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے بڑے سلیقہ سے خوبصورتی کے ساتھ اس میں فلسفی شاعر کی زندگی کی نمایش تصویروں اور تحریروں کے ذریعہ سے کی تھی۔ جو دیکھنے کے لائق تھی۔ یہاں سے جو پاکستانی وفد گیا تھا وہ بھی اس کو دیکھ کر محظوظ ہوا۔ پھر ہمارے وزیر سری ال۔ کے۔ اڈوانی نے اس موقع پر انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم لوگوں کو امید ہے اقبال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خیر سگالی کے جذبات پیدا کرنے کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوں گے۔ ہم لوگ اس پر آمین کہتے ہیں۔

شریک صدر سردار محمد اقبال خان آخر میں بولنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ تو مقالہ نگاروں کے مقالات پر مختصر طریقے پر پُرمغز تبصرے کئے۔ پھر میری تقریر کا ذکر تحسین آمیز طریقہ سے کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی طرف سے خیر سگالی کا جذبہ

میں پاکستان برابر کا شریک ہے۔ اور انشاء اللہ اقبال نہ صرف ہندوستان و پاکستان بلکہ انسان اور انسان کے درمیان خیر اندیشی کا جذبہ پیدا کرنے میں مؤثر ثابت ہوں گے۔

(۳)

۵ دسمبر ۱۹۷۷ء کو دوسرے کمرہ میں جو اجلاس ہو رہا تھا۔ اس کی صدارت ترکی کے ڈاکٹر عبدالقادر کرہانی نے کی۔ اُن کے ساتھ ڈاکٹر رفیق احمد صدر تھے۔ جو پنجاب یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ہیں سکریٹری جناب محمد وارث میر ہوئے اس میں یہ مقالات پڑھے گئے۔

(۱) Some Reflections on philosophical aspects of Iqbal's philosophy از پروفیسر ڈاکٹر سید النجیب العطاس (ملیشیا)۔

(۲) Allama M. Iqbal and Mehmet Akil Ensoy از پروفیسر ڈاکٹر ناست کاگ تو (روس)

(۳) A fore runner of Pakistan - Turkish friendship از ڈاکٹر فوات بائرم اگلو (ترکی)

(۴) Role of Iqbal in the creation of Pakistan. از مادام پیری ہان آری بورون (ترکی)

(۵) Iqbal as a believer in Islam.

از ڈاکٹر لطفی ڈوجن (ترکی)

(۶) Iqbal's relevence to-day از جناب عنایت اللہ صاحب (لاہور)

(۷) Iqbal's concept of Muslim Revival. از ڈاکٹر محمد کلیم (بنگلہ دیش)

(۸) Iqbal and Walt Whitman: East and West Meet. از پروفیسر شمیم فیفر (نیومکسیکو)

کافی اور چائے کے بعد پھر دو اجلاس ہوئے۔ ایک کی صدارت ملیشیا کے پروفیسر ڈاکٹر سید النجیب العطاس نے کی۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر منیر چغتائی شریک صدر تھے۔ جو پنجاب یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر ہیں۔ سیکریٹری ڈاکٹر امان اللہ ہوئے۔ اس میں یہ مقالات پڑھے گئے۔

(۱) Research into Iqbal's life and Works in the Soviet Union از ڈاکٹر سوفا چیبہ (روس)

(۲) Iqbal: A Giant of our Planet از ڈاکٹر دگیفورو (روس)

(۳) The vision of Iqbal. از ڈاکٹر شام افتخار۔

(۴) Individual and Society in Iqbal. از ڈاکٹر غلام رضا صابری تبریزی (ایڈنبرا)

(۵) Iqbal to be rediscovered از راقم الحروف

(۶) علائق اقبال با افغانستان از میر حسین شاہ (افغانستان)

(۷) Attribute to Iqbal. از احمد حسین صاحب۔

ہر مقالہ خواں کے لیے دس منٹ مقرر تھے، میرا مقالہ پندرہ صفحے کا تھا، مگر میں نے اس کو دس منٹ کے لحاظ سے مختصر کر لیا تھا۔ اس میں پہلے تو یہ دکھایا تھا کہ مولانا شبلی رح نے اقبال کے متعلق یہ پیشین گوئی کی تھی کہ حالی اور آزاد کے بعد شاعری میں جو کرسیاں خالی ہوں گی ان میں ایک اقبال سے پُر ہو گی۔ یہ پیشین گوئی پورے طور پر صحیح ثابت ہوئی۔ پھر استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی رح نے اقبال کی وفات پر جو کچھ لکھا تھا۔ اس کا اقتباس سنایا۔ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم اور جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کی جو رائیں اقبال سے متعلق تھیں۔ ان کا ذکر کیا۔ مولانا ابو الحسن ندوی کی کتاب Glory of Iqbal. کا تذکرہ کرتے ہوئے اقبال کے بارہ میں ان کی رائے بھی نقل کی۔ اس کے بعد یہ ظاہر کیا کہ اقبال کے مطالعہ میں دار المصنفین کا ایک خاص زاویہ نظر ہے اسی بنا پر یہ راقم السطور اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا ہے۔ کہ اقبال محض یورپ کے فلسفیوں کی رفو کو ٹانکتے رہے بلکہ اُن کا مسلک قرآن مجید کی تعلیمات پر مبنی تھا۔ انھوں نے فلسفۂ خودی کو کلام پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ، اور صحابہ کرام کے عشق رسول ؐ سے اخذ کیا، پھر ان کی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ انھوں نے افلاطون، ارسطو، کانٹ، میکڈ انلڈ، فرائڈ، ولیم جیمس، برگسان میک ٹگاوٹ فرنل، نطشے، اسپنگلر، جنگ، ٹالسٹائے۔ اور لاک وغیرہ سب ہی سے اختلاف

کیا ہے۔ وہ اُن کے نظری اور فکری خیالات کے بڑے ناقد رہے ہیں۔ ان کے بجائے وہ کلام پاک کے مطالعہ سے اسرارِ الٰہی کے محرم بنے، عشقِ رسول سے سرشار رہے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت اویس قرنیؓ حضرت بلالؓ کی زندگی سے اپنی شاعری کے محبوب موضوع عشق کا درس لیا۔ پھر حکمائے اسلام میں مولانا رومیؒ کے علاوہ بوعلی سینا، سنائی، فارابی، ابنِ خلدون، ابن خرم، فخرالدین رازی، ملّا باقر، عراقی، ابن تیمیہ، ابوالدولہ سمنانی، شاہ ولی اللہؒ، جمال الدین افغانی، اور سر سید احمد خان سے بھی متاثر ہوئے۔ وہ بگڑے ہوئے تصوّف کے ضرور ناقد تھے۔ لیکن حقیقی تصوّف کے ہمیشہ حامی رہے۔ اور صوفیائے کرام سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کیا ہے:۔

تمنّا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ انکو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انھیں خلوت گزینوں میں

ان کا موضوع تصوّف نہ تھا۔ لیکن اپنے خیالات کے اظہار میں وحدت الوجود کے منکر نہیں تھے۔ ان کا وحدۃ الوجود اپنا تھا، بیسویں صدی کا تھا، وہ وحدت الوجود کے حامیوں کی طرح اپنے کو خدا میں جذب ہونے کے بجائے خدا کو اپنے میں جذب ہوتا دیکھنا پسند کرتے تھے۔ کہتے ہیں:۔

؎ خود گم ہر تحقیقِ خودی شو
انا الحق گوے و صدیقِ خودی شو

ضربِ کلیم میں کہتے ہیں:۔

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر اِک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

انھوں نے اپنی شاعری میں عشق کے جو فلسفیانہ رموز و نکات بتائے

ہیں، وہ کسی قلوپطرہ، کسی جولیٹ، کسی لیلیٰ، کسی عذرا اور کسی شیریں کے

لیے نہیں ہے بلکہ یہ خالصتہً عشق الٰہی ہے۔ جو وحدۃ کا دوسرا نام ہے۔

صوفیائے کرام میں وہ حضرت فضیل بن عیاض، جُنید بغدادیؒ۔ بایزید

بسطامیؒ۔ داتا گنج بخشؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

امیر خسروؒ، شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ سے بڑی عقیدت

رکھتے تھے، اُن کی تعلیمات کا پرتو اُن کی شاعری پر ہے۔ شعراء میں مولانا رومیؒ کے

علاوہ حضرت فرید الدین عطارؒ۔ خاقانیؒ۔ بوعلی قلندرؒ پانی پتی۔ عرفی۔ طالب

کلیم۔ صائب۔ فیضی، رضی، دانش، عبد القادر بیدل، غنی کشمیری۔ غالب اور

داغ سے متاثر ہوئے۔ اسلامی تاریخ کی سیاسی شخصیتوں میں سے حضرت عمرؓ، حضرت

علیؓ، طارق بن زیاد، عبد الرحمن اول اندلسی، سلیم، سنجر، طغرل، محمود غزنویؒ۔

مراد، اورنگ زیب، اور ٹیپو سلطان کی سیرت و کردار کا اثر اُن کی شاعری میں

نمایاں ہے، ان حقائق کے بعد یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے، کہ وہ فرنگی مفکروں کی

گاڑی کے قلی بنے رہے، درحقیقت وہ اسرارِ الٰہی کے محرم رسول اللہ کے عاشق، فلسفہ

اسلام کے ترجمان، اور کاروانِ ملت کے حدی خوان بن کر شاعری کرتے رہے۔ اسی

حیثیت سے انھوں نے خودی، اجتماعی خودی، عظمتِ آدم، شرفِ انسانی اور

تسخیرِ فطرت کا پیام دُنیا اور انسانیت کو سنوارنے کے لیے دیا۔ اسی لیے ان کی

شاعری میں ابدیت کی لذت برابر ملتی رہے گی۔ ہم نے اگر اقبال کو اس جشن کے موقع پر صحیح معنوں میں پالیا۔ تو ہم اپنے کو بھی اسی حیثیت میں پالیں گے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے قرآنی تعلیمات کی بُنیاد پر انسان کی خودی کا ایک نیا درس دیا ہے۔ اسلام کے روحانی، مذہبی اور ذہنی راز سربستہ کو کھول کر ایشیا کے رہنے والوں کے دل کے اندر نیا سوز، ساز اور درد عطا کیا ہے، فرنگی فکر کے نشہ کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔ انسان کو بلند کر کے کائنات کا حکمران بننے کی دعوت اور انسانیت میں آفاقیت اور عالمگیریت پیدا کرنے کا پیام دیا ہے۔

میرا یہ مضمون انگریزی میں تھا۔ جس کا خلاصہ اوپر پیش کیا ہے۔ جب میں اپنا یہ مقالہ پڑھ رہا تھا۔ تو وہاں جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال بیٹھے تھے۔ اُن کو سامنے دیکھ کر مقالہ پڑھنے میں بہت جی لگا۔ یہ خیال غالب رہا کہ ان کا سن لینا ہی میری محنت کا اصلی صلہ ہوگا۔ جب میں نے مقالہ ختم کیا۔ تو وہ اٹھے اور بڑی گرم جوشی اور محبت سے ہاتھ ملایا، داد دی، پھر باہر نکل کر کہنے لگے کہ

It was very gripping and interesting

یہ اجلاس ختم ہوا تو پیرس کی ایک خاتون لپکتی ہوئی میرے پاس آئیں۔ اور مبارک باد پیش کرتی ہوئی بولیں کہ میں اس مقالہ سے بہت محظوظ ہوئی اور میں نے بہت کچھ سیکھا۔ آگے بڑھا تو پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر خیرات محمد ابنِ رسا سے ایک صاحب کچھ باتیں کر رہے تھے، مجھکو

دیکھتے ہی بولے، آپ ہی کا ذکر خیر ہو رہا ہے۔" میں نے کہا کہ کوئی شکایت تو نہیں پیدا ہو گئی۔ بولے نہیں، ہم لوگ کہہ رہے تھے کہ آپ کا مقالہ اس کانگریس کا بہترین مقالہ قرار دیئے جانے کے لائق ہے۔ سندھ کے ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل نے اس رائے کو سن کر کہا کہ میں بھی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ کراچی کے جناب اعجاز الحق قدوسی مؤلف "اقبال کے محبوب صوفیائے کرام" اپنی محبت میں یہ کہہ گئے کہ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ کانگریس کا بہترین مقالہ تھا۔ دوسرے دن جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال سے ملاقات ہوئی۔ تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ کچھ بیرونی نمائندے ان سے کہہ رہے تھے کہ یہ مولانا کیسے اتنی اچھی انگریزی میں اتنا اچھا مقالہ لکھ سکے۔ میں یہ سن کر ہنسنے لگا۔ دل میں خوش تھا کہ اللہ نے دارالمصنفین کے معیار اور وقار کی لاج رکھ لی۔

میں نے جس اجلاس میں اپنا مقالہ پڑھا تھا اسی کے ساتھ دوسرا اجلاس اسی وقت دوسرے کمرے میں ہو رہا تھا۔ جس کے صدر مصر کے ڈاکٹر حسین مجیب تھے۔ اُن کے ساتھ ڈاکٹر حسن رفعت رشید صدر تھیں۔ جو پنجاب یونیورسٹی کی آرٹ فیکلٹی کی ڈین ہیں۔ سکریٹری ڈاکٹر خواجہ غلام زکریا تھے۔ اس میں یہ مقالے پڑھے گئے۔ (۱) Allama Mohammad Iqbal and the German از ڈاکٹر ہل ترد نرستو (جرمنی)

(۲) Iqbal and Renaissance of Islam. از پروفیسر ڈاکٹر جکا (انڈونیشیا)

(۳) Iqbal: His portraits and hand-

writing از سلیمہ سلطانہ (پاکستان)

(۴) اقبال اور پان اسلام ازم از ڈاکٹر پروین شوکت (لاہور)

(۵) Iqbal and the material well-being of the Muslims از جناب لطیف احمد صاحب شروانی

(۶) Metaphysical implication of Iqbal - Eristmic views از ڈاکٹر محمد معروف (لاہور)

(۷) Iqbal's concept of mental health از ڈاکٹر ایس۔ ام۔ رحمان (پاکستان)

(۸) اقبال اور وحدت الوجود، از جناب امیر حمزہ شنواری (پاکستان)

سہ پہر کو لاہور کے خانہ فرہنگ ایران میں ایک استقبالیہ عصرانہ تھا۔ اس میں پہلے مقالہ خوانی ہوئی۔ اس کی صدارت ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے کی۔ اس موقع پر جناب بہاؤالدین اورنگ نے پہلے استقبالیہ خطبہ پڑھا۔ پھر تہران یونیورسٹی کے پروفیسر جعفر محمد محجوب اور پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالشکور احسن نے اپنے اپنے مقالات پڑھے، اس کے بعد صدر نے اپنا خطبہ پڑھا۔ پھر ایران کے قونصل جنرل نے وہاں کے ایک کتب خانہ کا افتتاح کیا، جس کا نام علامہ محمد اقبال لائبریری رکھا گیا ہے۔ ایک بہت پر تکلف عصرانہ بھی رکھا گیا تھا۔ ہم لوگ ہوٹل واپس آئے، تو خانہ فرہنگ کی طرف سے رات کا ڈنر بھی تھا۔ جس میں حسبِ معمول انواع واقسام

کے کھانے تھے۔

۱۷ دسمبر کی صبح کو پھر دو علیحدہ علیحدہ کمروں میں مقالہ خوانی کے چار اجلاس ہوئے۔ ایک اجلاس کی صدارت ڈاکٹر غلام رضا صابری تبریزی نے کی جو اڈنبرا یونی ورسٹی کے استاد ہیں۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صدر ہوئے۔ اور سکریٹری ڈاکٹر خالد حمید شیخ تھے۔ اس میں یہ مقالے پیش ہوئے۔

(۱) A tribute to Iqbal از جناب احمد حسین پاکستان۔

(۲) بانگ درا کی طویل نظموں کے پس منظر کا ایک مطالعہ، از جناب سید ابوالخیر کشفی (کراچی یونیورسٹی)

(۳) اقبال اور گورنمنٹ کالج، از جناب محمد حنیف شاہد (لاہور)

(۴) Therapeutic Aspects of Iqbal's thoughts - از جناب ڈاکٹر نذیر قیصر (لاہور)

(۵) Iqbal and Syed Ali Hamdani از ڈاکٹر جی آر ڈی

باورنگ (مغربی جرمنی) (۶) محمد اقبال۔ امیر شعراء الاسلام از عبدالودود شلبی (مصر) (۷)

Iqbal and high ideals of Islamic state

از پروفیسر مولانا الٰہی بخش بیدار اللہ

(۸) Iqbal's advice to the young از جناب محمود دہلوی

اسی وقت دوسرے کمرے میں جو اجلاس ہو رہا تھا اس کی صدارت

فرانس کی میڈیم ایوا میورووچ کر رہی تھیں۔ ان کے ساتھ صدر جسٹس محمد یوسف صراف تھے، سکریٹری محمد اسمٰعیل بھٹی ہوئے۔ اس میں یہ مقالے پڑھے گئے۔

(۱) Iqbal A poet of the East از جناب علی سردار جعفری (ہندوستان)

(۲) Iqbal's And ulusian theme از ڈاکٹر محمد یوسف عباسی (پاکستان) (۳) اقبال کی دعائیں، از پروفیسر شریف گنجاہی (پاکستان) (۴) آفاقی شاعر اور مفکر اقبال کا پیغام حیات از ڈاکٹر ابوسعید نورالدین (بنگلہ دیش) (۵) کلام اقبال پر احادیث نبویؐ کا اثر از مریم سلطانہ صاحبہ (پاکستان) (۶) اقبال اور ایران، از ڈاکٹر نسیم۔ (پشاور) (۷) علامہ اقبال پر کتابیات۔ از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، (سرگودھا)

(Iqbal On observation of nature Gud knowledge از جناب عبدالخالق صاحب (پاکستان)

چائے کے بعد دو علیٰحدہ کمروں میں جو اجلاس ہوئے ان میں سے ایک کی صدارت امریکہ کے بیتھم فیفر نے کی۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر عبدالحمید (لاہور) صدر رہے۔ سکریٹری ڈاکٹر ماجد شیخ ہوئے۔ اس میں یہ مقالے پیش ہوئے۔

(۱) Dialogue in Iqbal از ڈاکٹر محمد اجمل (اسلام آباد)

(۲) اقبال اور ہمارے فکری رویے، از ڈاکٹر سلیم اختر (۳) اقبال کے نظریہ فنون لطیفہ میں فنِ تعمیر، از ڈاکٹر عبداللہ چغتائی۔ (لاہور)۔

(۴) اقبال کی ابتدائی فارسی شاعری - از ڈاکٹر صابر آفاقی (آزاد کشمیر)
(۵) علامہ اقبال کا معاشی مقصد از ڈاکٹر معز الدین (ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی
لاہور) (۶) صوفیانہ افکار و نظریات میں اقبال کے مجددانہ تصرفات
از مولانا نور احمد آفریدی (۷) اقبال کی اردو غزل از جناب رفیق خاور
لاہور (۸) Iqbal, the poet of man از ڈاکٹر
شمس الدین صدیقی (پشاور) (۹) The naturalism
of Iqbal. از پروفیسر عبدالقیوم (پشاور)

اس اجلاس میں پروفیسر آل احمد سرور نے اردو میں ایک اچھی
تقریر کی، جس میں یہ ظاہر کیا کہ اقبال مغرب اور مشرق دونوں کی اعلیٰ قدروں
سے متاثر ہوئے۔ اسی وقت دوسرے کمرہ میں جو اجلاس ہو رہا تھا۔ اس
کی صدارت انڈونیشیا کے ڈاکٹر حمکا نے کی۔ ان کے ساتھ اقبال اکیڈمی کے
ڈائرکٹر ڈاکٹر معز الدین صدر ہوئے۔ سکریٹری ڈاکٹر ظہور احمد اظہر تھے۔ اس میں
یہ مقالے پیش ہوئے

(۱) Iqbal's view of space and time
از ڈاکٹر فاضل احمد شمسی (اسلام آباد)
(۲) Rumi and Iqbal از میاں سید رسول رسا (پشاور)
(۳) علامہ اقبال اور تحریک پاکستان از ڈاکٹر انعام الحق کوثر)
(۴) Introducing Iqbal to western

(۵) اقبال اور مغربی جمہوریت، بالشوزم اور اسلام از احسان اکبر (پاکستان)

(۶) علامہ اقبال خانقاہ شکن صوفی، از جناب محمد ایوب قادری (کراچی)

اس کے بعد مقالہ خوانی کے اجلاس ختم ہو گئے، مقالات کی مذکورہ بالا فہرستوں سے اندازہ ہوگا کہ اس کانگریس میں اقبالیات سے متعلق جتنے پہلو ذہن میں آسکتے تھے، ان سب پر مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور ہر مقالہ نگار کو اپنا مقالہ پڑھنے کا موقع دیا گیا، اس سے مقالہ نگاروں کو بظاہر تو تسکین ضرور ہو جاتی تھی۔ مگر بعض اوقات مقالے وقت کی تنگی کی وجہ سے کچھ ایسی عجلت میں پڑھے گئے کہ پڑھنے اور سننے دونوں میں کوئی لذت نہ ملتی تھی، بعض مقالہ نگاروں نے بڑی محنت اور کاوش سے مقالے لکھے۔ جس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ غور سے پورے سنے جاتے اور ان پر بحث و مباحثہ ہوتا، لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا، کسی مقالہ پر کوئی بحث نہیں ہوئی۔ مگر اتنے مقالات پڑھے اور سنے گئے کہ میرا خیال ہے کہ ہر مندوب نے اس کانگریس میں شرکت کرکے کچھ نہ کچھ نئی اور مفید چیزیں ضرور حاصل کیں۔

اسی روز شام کو جنرل محمد ضیاء الحق کی طرف سے استقبالیہ تھا، وہ اس وقت چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے پاکستان میں بہت مقبول ہیں، اور عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، فوجی حکمرانی میں

ملبوس تھے۔ عام پاکستانیوں کی طرح مونچھیں صاف نہ تھیں۔ بلکہ اُن کی
مونچھوں سے اُن کی مردانگی اور سپہگری کا اظہار ہوتا تھا۔ ہنستا ہوا چہرہ تھا
بات بات پہ ہنستے ہوئے دکھائی دیتے۔ شامیانے میں داخل ہوئے تو میری
شروانی کی جیب پر انڈیا لکھا ہوا تھا۔ میری طرف بڑھے ہنس کر پوچھا کہ یہاں
کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں
اُن کے لئے ہندوستان سے کچھ علمی تحفے لایا ہوں، پھر مولانا ابوالحسن علی ندوی کی
اور اپنی کچھ تصانیف اُن کی خدمت میں پیش کیں، انھوں نے ان کو قبول کیا، تو فوٹو
گرافروں نے آگے بڑھ کر تصویریں لے لیں، میں نے اُن سے یہ بھی عرض کیا کہ گذشتہ
سال میرے ذریعہ سے پورا دارالمصنفین پاکستان کو نذر کر دیا گیا ہے۔ یہ سن کر
ہنسنے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ دارالمصنفین ہی کے سلسلہ میں آپ کی خدمت میں کچھ
باتیں عرض کرنی ہیں، اُس کے لئے اسلام آباد آکر ملاقات کا شرف حاصل کرنا چاہوں
گا، جواب دیا کہ اسلام آباد میں ضرور ملئے۔ ہندوستان کے اور دوسرے نمایندوں
سے بھی بہت ہی حسنِ اخلاق سے ملے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے دیر تک باتیں
کرتے رہے۔ استقبالیہ میں بکثرت مدعوئین تھے۔ مغرب کا وقت ہوا تو جنرل صاحب
نماز پڑھنے کے لئے اُٹھ گئے۔ نمازِ باجماعت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مگر سیکڑوں مدعوئین
میں سے صرف پندرہ بیس آدمی نماز میں شریک ہوئے۔ نماز کے بعد مصلیوں سے
جنرل صاحب نے بے تکلفانہ گفتگو کی، میری طرف بھی بڑھے، میں نے اس وقت
دارالمصنفین اور حکومت پاکستان سے جو معاہدہ ہوا تھا، اس کی کچھ اور تفصیل بتائی،

اور اسلام آباد میں پھر شرفِ ملاقات کے لئے وقت کا طالب ہوا، انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اس کانگریس کے بعد اسلام آباد میں آسکوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ ابھی تو کراچی جاؤں گا، وہاں سے اسلام آباد حاضر ہوں گا، یہ معلوم کرکے انھوں نے اپنے سکریٹری کو کراچی میں میرا پتہ لکھ لینے کو کہا۔ سکریٹری صاحب نے میرا پتہ لکھ کر کہا کہ مجھ کو اسلام آباد آنے کی تکلیف دی جائے گی۔ یہ شام پرتکلف چائے، اور جنرل صاحب کی بے تکلفی ملاقات کی وجہ سے بڑی خوشگوار رہی۔

رات کو پرتکلف کھانے کے بعد کچھ ماہرینِ موسیقی نے اقبال کی غزلوں کے ساتھ سندھی، پنجابی، اور بلوچی گیتوں سے بھی مندوبین کو محظوظ کیا۔

۸ ستمبر کو الوداعی اجلاس تھا، مندوبین پھر پنجاب یونیورسٹی کے نفیس ہال میں جمع ہوئے، پنڈال افتتاحیہ اجلاس کی طرح سجا ہوا تھا، اسٹیج پر بیٹھنے والے خصوصاً پاکستانی زیادہ تر انگریزی لباس میں ملبوس تھے۔ جنرل ضیاء الحق تالیوں کی گونج میں ڈائس پر تشریف لائے۔ کارروائی کلام پاک کی تلاوت سے شروع ہوئی، پھر جناب بشیر حسین ناظم نے اپنے پرکیف ترنم سے اقبال کی وہ نظم سنائی جس کا ایک شعر یہ ہے :-

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق　　یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

جب یہ نظم ختم ہوئی تو جنرل ضیاء الحق اٹھ کر جناب بشیر حسین ناظم سے بغل گیر ہوئے اور ان کے اندازِ ترنم کی تعریف کی۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی

کے وائس چانسلر نے استقبالیہ خطبہ پڑھا پھر مندوبین میں ان کے ایک ایک نمایندہ کو اپنے اپنے تاثرات کے اظہار کے لیے ڈائس پر مدعو کیا گیا۔ افغانستان کے پروفیسر محمد ابراہیم الہام نے کہا افغان قوم حکیم الامت اقبال کے عظیم نظریات اور فلسفیانہ شاعری کے علاوہ انھوں نے انسانیت مدار اتحادِ عالم کے لیے جو ہدایات دیئے ہیں اُن سے بخوبی آشنا ہے۔ بنگلہ دیش کی بیگم اختر امام نے کہا کہ علامہ اقبال کا پیغام صرف مسلمانوں کے ہی لیے نہیں بلکہ تمام انسانیت کے لیے ہے۔ اقبال سب کے ہیں۔ مصر کے ڈاکٹر محمد جمال الدین نے کہا کہ علامہ اقبال ملتِ اسلامیہ کو ایک خاندان تصور کرتے تھے۔ فرانس کی میڈیم الوا میورووچ نے اقبال کے پیام کو دنیا بھر میں پھیلانے کی ضرورت پر زور دیا۔ ہندوستان کی طرف سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد بولے اور جب وہ مائک کے پاس آئے، تو پورا ہال تالیوں کی گونج سے بھر گیا۔ کارروائی انگریزی میں ہو رہی تھی، مگر انھوں نے بہت ہی فصیح و بلیغ اردو میں مجمع کو مخاطب کیا۔ اردو میں ان کا بولنا پاکستانی سامعین کو پسند آیا۔ انھوں نے اس ضرورت پر زور دیا کہ اقبالیات کے اسکالروں کا یہ بین الاقوامی فورم مستقل بنا دیا جائے، تاکہ علامہ اقبال پر ہونے والا کام ایک دوسرے کے تعاون سے بڑھے۔ اپنی تقریر کے درمیان یہ شعر پڑھا۔

عشق شور انگیز را جادہ در کوئے نیز زرد = بر تلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برد

پھر ہندوستانی مندوبین کی جو پذیرائی ہوئی اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

دو دن میں ہوگیا ہے یہ عالم کہ جس طرح   تیرے ہی اختیار میں ہوں عمر بھر سے ہم

تو پورا ہال متاثر ہو کر تالیاں بجا رہا تھا۔ ان کا اندازِ تخاطب کچھ ایسا تھا کہ جلسہ کے بعد لوگوں کی زبان پر تھا کہ یہ بہترین تقریر تھی۔

امریکہ کی خاتون ڈاکٹر میٹکاف بار بار بھی اردو میں بولیں جس سے شاید ان پاکستانی حضرات نے ضرور سبق لیا ہوگا جو اپنے خیالات کا اظہار اردو کے بجائے انگریزی میں کر رہے تھے۔ وہ بولیں کہ کانگریس نے دور دراز کے لوگوں کو ایک ساتھ مل کر بیٹھنے کا موقع دیا۔ تاکہ وہ علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ سے آگاہ ہو سکیں، وہ خود بھی اس سے مستفید ہوئیں۔ اور لاہور سے یادوں کا خزینہ ساتھ لے کر جا رہی ہیں۔ فرانس کی مسز سعید یاسین ال رش نے لاہور اور سیالکوٹ پر انگریزی میں دو نظمیں سنائیں، جو انہوں نے اس کانگریس کے موقع پر کہی تھی، سوڈان کے نمائندہ جسٹس مبارک مغربی نے عربی میں علامہ اقبال کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا، ترکی کے فواد بہرام اوغلو نے اس توقع کا اظہار کیا کہ علامہ اقبال کی فکر کو سمجھنے کے لیے تبادلہ خیال کا جو سلسلہ لاہور کانگریس میں شروع ہوا ہے، وہ جاری رکھا جائے گا۔ اٹلی کے پروفیسر بوسانی نے کہا کہ علامہ اقبال صرف سائنس کے مطالعہ اور تحقیق و جستجو کی دعوت نہیں دیتے، بلکہ وہ انسان کو عشق اور روحانیت کی طرف بھی بلاتے ہیں۔ بلجیم کے نمائندہ پروفیسر اسکالی موسکی نے کہا کہ ان کو بہت سی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن یہاں کی ایسی شاندار اور کامیاب کانگریس کہیں اور نہیں دیکھی۔

اِس کے بعد جناب جنرل محمد ضیاء الحق مجمع کو خطاب کرنے کے لیے اُٹھے۔ علامہ اقبال پاکستانیوں کے ذہن و دل پر جس طرح چھائے ہوئے ہیں۔ اس کی پوری ترجمانی ان کی تقریر میں ہوئی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال کا پیام آفاقی ہے۔ جو تمام لوگوں کی رہنمائی ہر وقت اور ہر جگہ کرتا رہے گا۔ کیوں کہ اس شاعرِ مشرق کے یہاں انسان کی عظمت کا درس ہے۔ بیرونِ دُنیا میں ان کی شہرت اُن کے عظیم پیام کی وجہ سے ہے۔ ان کی نظر سمندروں کی گہرائیوں اور آسمان کی بلندیوں تک تھی، وہ تسخیر کائنات کا راز جانتے تھے۔ پھر وہ ہر شخص کو اس کے آبیڈیل کو عملی شکل دینے اور رازہائے حیات کو باہر لانے پر تیار کرتے ہیں۔ اور اس کے لیے خدا کی طرف رجوع کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں پنجاب یونی ورسٹی میں شعبۂ اقبالیات قائم کرنے کی بھی ہدایت دی۔ تاکہ اقبالیات پر بامقصد اور مؤثر تحقیق ہو۔

اس موقع پر یہ بھی بتایا گیا کہ اس بین الاقوامی کانگریس میں ۱۹۳ مندوبین نے شرکت کی۔ جس میں ۷۰ بیرونی ممالک سے آئے اس میں ۱۰۰ مقالات پیش کئے گئے۔ جس میں پچاسی انگریزی، دس عربی اور پینتالیس اُردو زبان میں تھے۔ یہ تقریب ختم ہونے والی تھی کہ جناب جنرل ضیاء الحق نے ایک بار پھر بشیر حسین ناظم سے علامہ اقبال کی کوئی نظم سنانے کی فرمائش کی۔ وہ اسٹیج پر آئے تو اپنی بہت ہی مترنم اور نغمہ ریز آواز میں یہ نظم شروع کی۔

دلِ بیدارِ فاروقی، دلِ بیدار کرّاری   مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

اور جب وہ اس شعر پر پہونچے کہ

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

تو پورے مجمع پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ان کے پڑھنے کا انداز ہی کچھ ایسا تھا۔

اس تقریب کے بعد چائے اور کافی بھی تھی۔ پھر ہم لوگ ہوٹل واپس ہوئے۔ ایک بجے کھانا تھا پھر ڈھائی بجے لاہور کی تاریخی عمارتوں کی سیر کا پروگرام تھا۔ پہلے ہم لوگ جہانگیر کے مقبرے لے جائے گئے۔ اس کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا مگر اس بار دیکھ کر جہانگیر کی دلآویز اور رعنا شخصیت تزک جہانگیری میں اس کی نثر نگاری کی شگفتگی حکمرانی میں اس کی رواداری اور فراخ دلی علم و فن کی اس کی قدر دانی اور سرپرستی، نور جہاں سے اس کی شیفتگی، اور پھر نور جہاں کی وجہ سے ہندوستان کے تمدن میں انقلاب پذیری کی ساری تصویریں سامنے آگئیں۔ خیال آیا کہ دہلی اور آگرہ کے یہ حکمران اپنے زمانہ میں دنیا میں متمدن ترین اور طاقت ور ترین حکومت کے والی سمجھے جاتے تھے، مگر اسی آگرہ اور دہلی کے مسلمان اب کیا سے کیا ہو کر رہ گئے ہیں، جذبات میں یہ تلاطم پیدا ہو رہا تھا کہ ہم لوگوں سے کہا گیا کہ اب یہاں سے لاہور کے قلعے کو دیکھنے کے لیے جانا ہے، وہاں پہنچ کر مجھ کو معلوم ہوا کہ جس اسپتال میں جناب سید حسام الدین راشدی صاحب دل کے مرض میں مبتلا ہو کر آگئے ہیں وہ قریب ہے

کانگریس کے آرگنائزنگ سکریٹری پروفیسر خواجہ غلام صادق نے ازراہ کرم ایک موٹردی اور جناب بشیر احمد ڈار صاحب بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ اسپتال لے گئے، یہاں جناب راشدی صاحب کو خوش اور مطمئن دیکھ کر بڑی راحت ہوئی، قلعہ کی تقریب میں شرکت کرنے سے زیادہ مسرت ان کے پاس بیٹھنے میں ہوئی۔

مغرب کے بعد ہوٹل پہنچا تو لاہور کے ٹیلی ویژن اسٹیشن والے ہندوستان کے وفد کو اپنے یہاں انٹرویو کے لئے لے گئے۔ یہ انٹرویو ایک گھنٹہ کا رہا کشور ناہید صاحبہ نے ہندوستان کی علمی اور ادبی سرگرمیوں سے متعلق بہت سے سوالات کئے، جن سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ یہاں کی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف ہیں، جناب علی سردار جعفری اور پروفیسر آل احمد سرور اُن کے سوالات کا تشفی بخش جوبات دیتے رہے، پھر انھوں نے علامہ محمد اقبال سے متعلق ہم لوگوں کے تاثرات فرداً فرداً پوچھے، میں نے اپنے تاثرات کے سلسلے میں بیان کیا کہ ہندوستان میں علامہ محمد اقبال کو واپس لانے میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا نمایاں حصہ ہے، پھر ان کے متعلق اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ میں کسی حال میں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ وہ فرنگی مفکروں کی گاڑی کے قلی تھے، دارالمصنفین کے بارے میں بھی مجھ سے سوال کیا گیا، میں نے اس ادارے کو پاکستان کے نذر جس طرح کر دیا گیا ہے اس کی مختصر تفصیل بتائی۔

۸۔ دسمبر کو ہم لوگوں کا پروگرام سیالکوٹ جانے کا تھا، جہاں علامہ محمد اقبال پیدا ہوئے لاہور سے سیالکوٹ کا سفر بس سے تقریباً تین گھنٹہ تک تھا۔ تین بسیں اور پندرہ موٹر گاڑیاں ساتھ چلیں، ایک اچھا خاصہ جلوس ہو گیا، لاہور شہر کو دیکھتے ہوئے ہم لوگ باہر نکلے، پروفیسر میاں محمد سعید کا ذکر پہلے کر چکا ہوں، وہ امریکہ میں جارج مین یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں، ہم دونوں ساتھ بیٹھے۔ وہ راستہ میں ہر علاقہ کی تاریخ بتاتے گئے۔ ہم لوگ وزیر آباد سے گذرے تو انھوں نے بتایا کہ یہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا وطن ہے، یکایک خیال آیا کہ وہ دار المصنفین اعظم گڈھ بھی تشریف لائے تھے، شہر میں ان کا جلوس نکالا گیا تھا۔ تو ان کو ایک فٹن پر بٹھا کر شہریوں نے خود گاڑی کھینچی تھی، وہ یاد آئے تو ان کا اخبار زمیندار بھی یاد آیا، اور پھر شاعری میں ان کی قادر الکلامی اور پُر گوئی ذہن پر چھا گئی، پورا علاقہ بہت شاداب اور زرخیز نظر آیا۔ میاں محمد سعید صاحب یہاں کی زرخیزی اور شادابی کا ذکر کرتے رہے۔ راستہ میں اس جلوس کو دیکھنے کے لئے سڑکوں کے دونوں کنارے پر جا بجا لوگ کھڑے تھے، خوش ہو کر تالیاں بھی بجاتے۔ جا بجا پھاٹک اور کاغذ کی جھنڈیاں بھی لگا رکھی تھیں، ہم لوگ سیالکوٹ پہونچے تو بوائے اسکاؤٹ کی ایک لمبی قطار استقبال کے لئے کھڑی تھی، بینڈ باجے بھی بج رہے تھے۔ سیالکوٹ کو وہاں کے شہریوں نے خوب سجایا تھا۔ ایک بہت بڑے شامیانہ کے نیچے ہم لوگ بٹھائے گئے،

جہاں کا اجتماع علامہ اقبال کی بین الاقوامی کانگریس کے ایک جلسہ میں تبدیل ہوگیا، اور اس کو ہونا بھی چاہیئے تھا، کیوں کہ علامہ اقبال کے مولد کا بھی حق پہنچتا تھا۔ اس کی صدارت زون اے کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے کی، یہاں زیادہ تر زبانی تقریریں ہوئیں، سری لنکا کے پروفیسر کیرو تارتینے نے علامہ اقبال پر ایک مؤثر تقریر کی، اور وہاں کی یونی ورسٹی میں اقبالیات پر ایک شعبہ کھولنے کی تجویز پیش کی۔ بنگلہ دیش کی راج شاہی یونی ورسٹی کے ڈاکٹر محمد کلیم نے اردو میں بڑی اچھی تقریر کی، سین ڈی آگو کے ڈاکٹر شبنم دل نے اس موقع پر اپنی بڑی جرأت مندانہ تقریر میں پاکستان میں جلد از جلد جمہوریت کی واپسی کے خواہاں ہوئے، پروفیسر میاں محمد سعید نے مجھ سے تقریر کرنے کی فرمائش کی، مگر میں اس کے لیے تیار نہیں ہوا، اسٹیج پر پھر پروفیسر جگن ناتھ آزاد بلائے گئے، وہ تھوڑی دیر تک تو اردو میں بولے، پھر علامہ اقبال پر اپنی ایک نظم سنائی جو انھوں نے اس جشن سے متأثر ہو کر کہی تھی اس کا پہلا بند یہ تھا۔

چھلک رہا ہے لگا ہوں سے دل کا پیمانہ .. یہی نیاز ہے میری یہی ہے نذرانہ
جو تو سنے تو مرا ہر نفس حقیقت ہے وگرنہ میرا سخن بھی فسون و افسانہ
تری نوا کہ زمانے کا درد ہے اس میں یہی خرم ہے مرا اور یہی ہے ترانہ
سلام رومیِ عصر جدید تجھ پر سلام سلام محرم رازِ درون میخانہ
جدید دور میں تیرے سوا کوئی نہ ملا نظر ہو جس کی حکیمانہ بات رندانہ

آخری بند یہ تھا۔

میں آرہا ہوں دیارِ مزارِ غالب سے
ترے مزار پہ لایا ہوں دل کا نذرانہ

مری خموش نگاہی مری خموشیٔ نطق
اُسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ

ضیائے طورِ معانی بس اک لطیف جھلک
کہ مضطرب ہے مرا جذبۂ کلیمانہ

اِس ارمغانِ محبت کی ہو پذیرائی
کہ آج محفلِ احباب میں ہوں بیگانہ

چلا تھا گھر سے جو کل تیری آرزو لے کر

مقامِ شوق میں گم ہو گیا وہ فرزانہ

ظاہر ہے کہ اس نظم کی داد کیسے نہ ملتی۔ آنند کی پذیرائی ہر جگہ ہو رہی تھی، اس نظم کے بعد وہ اور بھی مقبول ہوئے۔ ان کے قدردانوں اور دوستوں کا جمگھٹا برابر اُن کے اردگرد رہا۔ یہاں پروفیسر آل احمد سرور نہ آسکے تھے کیونکہ اُن کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ جناب علی سردار جعفری آئے تھے، جناب فیض احمد فیض صاحب سے اُن کے گھرے تعلقات ہیں، اس لئے وہ ہر جگہ ان ہی کے ساتھ دکھائی دئے۔

اس جلسہ کے بعد ہم لوگ جلوس کی شکل میں پاپیادہ اقبال منزل کی طرف چلے۔ جلوس کے آگے آگے ہندوستانی نمائندے اور عاشقِ اقبال پروفیسر جگن ناتھ آزاد تھے۔ اقبال منزل پہنچنے کے لئے جن سڑکوں اور گلیوں سے ہم لوگ گذرے، وہ جھنڈیوں سے سجی ہوئی تھیں۔ کوٹھوں اور چھتوں پر لوگ کھڑے جلوس کو دیکھ رہے تھے، اور بکثرت پھول نچھاور کر رہے تھے، ایک جگہ ایک

تاجر صاحب تین قیمتی ہار لیے کھڑے تھے ہم تین آدمی جو آگے آگے تھے، انھوں نے ہمارے ہی گلوں میں یہ تینوں ہار ڈال دیئے، ہم یہی ہار پہنے اقبال منزل پہونچے جو ہر طرح صاف ستھری دکھائی دی، اس کے مختلف کمرے دکھائے گئے، او ر اب وہاں ایک چھوٹی سی لائبریری بھی قائم کر دی گئی ہے، سیالکوٹ کے لوگوں نے جس مسرت، اخلاص اور بلند حوصلگی سے ہم لوگوں کا خیر مقدم کیا۔ اس سے تمام مندوبین متأثر تھے۔

وہاں کی سروسز کلب میں ایک پر تکلف لنچ رکھا گیا تھا، جن میں حسب معمول طرح طرح کے کھانے اور پھل تھے، لنچ کے بعد علامہ اقبال کے استاد جناب مولوی سید میر حسن کی پوتی مس کاظمی، پرنسپل زنانہ گورنمنٹ کالج سیالکوٹ نے تمام مندوبین کو یادگار کے طور پر اقبال کے شاہین کا ایک تحفہ پیش کیا، جو غالبًا جست کا بنا ہوا ہے، اس کے بعد اس بین الاقوامی کانگریس کی باضابطہ کاروائیاں ختم ہو گئیں۔ اور ہم لوگ لاہور اپنے ہوٹل میں واپس آئے۔

"معارف" اعظم گڑھ

جنوری، فروری، مارچ ۱۹۷۸ء

جگن ناتھ آزاد کا سفرِ پاکستان

(ایک انٹرویو)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اقبال کے فکر و فن پر جو کام کیا ہے وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ آزاد کے کام کا اعتراف ہندوستان سے باہر روس اور پاکستان اور امریکہ میں بھی ہوا ہے۔ ابھی حال ہی میں آپ اقبال عالمی کانگریس میں شرکت کے لئے پاکستان گئے تھے۔ پاکستان سے واپسی کے بعد اگلے دن آزاد صاحب سری نگر آگئے تو ایڈیٹر "سری نگر ٹائمز" کے ساتھ آپ کی طویل ملاقات ہوئی۔ بات چیت کے دوران میں ایڈیٹر "سری نگر ٹائمز" نے سفر پاکستان کے بارے میں پروفیسر آزاد سے کئی سوالات کئے۔ ایڈیٹر "سری نگر ٹائمز" کے سوالات اور پروفیسر آزاد کے جوابات ایک انٹرویو کی صورت میں نیچے درج کئے جا رہے ہیں۔

(سری نگر ٹائمز، سری نگر ۔ ۳ اگست ۱۹۸۶ء)

صوفی غلام محمد ۔ آزاد صاحب آپ تو تقسیم ہند کے بعد کئی مرتبہ

پاکستان جا چکے ہیں۔ اب کے اقبال کانگریس عالمی میں شرکت کے لئے آپ کتنی مدت کے بعد پاکستان گئے۔؟

جگن ناتھ آزاد۔ بارہ برس بعد۔ آخری بار جون ۱۹۶۵ء میں لائل پور اور کراچی کے مشاعروں میں شرکت کے لئے گیا تھا میں کراچی ہی میں تھا کہ رن آف کچھ کی جنگ شروع ہو گئی۔ اور میں مشاعرے کے فوراً بعد دہلی واپس آگیا۔

ص۔ اقبال عالمی کانگریس لاہور سے جو ڈیلی گیشن گیا۔ اس میں کون کون سے ادیب شریک تھے۔

ا۔ یہ ڈیلی گیشن چار ادیبوں پر مشتمل تھا۔ آل احمد سرور صباح الدین عبد الرحمٰن، علی سردار جعفری اور یہ خاکسار۔ لیکن اس ڈیلی گیشن کی تشکیل کسی انجمن یا حکومت ہند نے نہیں کی تھی۔ ہم چاروں کو اپنی انفرادی حیثیت میں اقبال عالمی کانگریس کی طرف سے دعوت نامے موصول ہوئے تھے۔

ص۔ اقبال عالمی کانگریس میں شرکت سے کا آپ کیا تاثر لے کر آئے ہیں؟

ا۔ صوفی صاحب یہ ایک بہت بڑی کانگریس تھی۔ اس میں

پاکستان اور بیرون پاکستان کے ایک سو اسّی مندوبین نے حصہ لیا۔ اس کے علاوہ پاکستان کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے دانشوروں کی ایک بھاری تعداد میں اس کانگریس میں شریک ہوئے سیمینار میں ایک سو سینتیس مقالے پڑھے گئے۔ منتظمین نے مہمانوں کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مجھے اس سے قبل بھی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے لیکن جو حسنِ انتظام میں نے اقبال عالمی کانگریس لاہور اور سیالکوٹ میں دیکھا وہ اپنی مثال آپ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندوستانی وفد کی جو عزت افزائی اور پذیرائی کی گئی اس سے ہندوستانی وفد کا ایک ایک رکن متاثر ہوا۔ ذاتی طور پر میں اس پذیرائی سے جس طرح متاثر ہوا اس کے اظہار کے لئے مجھے الفاظ نہ مل سکیں۔ اور میں اپنے ان تاثرات کا اظہار جو مجھ سے ہو سکا اپنی اس تقریر میں بھی کیا جو میں نے فیض آڈیٹوریم لاہور میں کی، اپنے ان مقالوں میں بھی کیا جو "نیشنل ہیرالڈ" لکھنؤ۔ "پاکستان ٹائمز" لاہور اور "آج کل" نئی دہلی میں چھپے اور سرینگر بمبئی، لکھنؤ، جبل پور، حیدرآباد اور نئی دہلی کے ریڈیو اسٹیشنوں اور لکھنؤ ٹیلی ویژن کی تقریروں اور ملاقاتوں میں بھی کیا لیکن اس کے باوجود میں محسوس کرتا ہوں کہ

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

ص۔ کیا آپ نے اہلِ پاکستان کے دلوں میں ہندوستان اور اہلِ ہندوستان کے لئے کوئی نمایاں تبدیلی دیکھی۔؟

ا۔ میں نمایاں تبدیلی کی بات نہیں سمجھا اور اپنے گیارہ بارہ دن کے قیام میں، میں جن لوگوں سے ملا وہ میرے دوست تھے، اساتذہ تھے، شاعر اور ادیب تھے۔ کانگرس کے سلسلے میں مصروفیات اتنی زیادہ رہیں ـــ صبح سے رات تک ـــ کہ نہ کسی ادیب اور شاعر سے سیاسی موضوعات پر بات چیت کرنے کی مہلت ملی۔ نہ کسی سیاسی شخصیت سے ملاقات ہوئی۔ ہاں جنرل محمد ضیاء الحق صاحب سے ملاقات ہوئی وہ صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ مجھ سے ملتے ہی انھوں نے فرمایا کہیے آزاد صاحب! کوئی نئی کتاب آپ کی چھپی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جی ہاں "اقبال اور مغربی مفکرین" ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ بولے کہاں ہے؟ لائیے۔ چنانچہ میں نے "اقبال اور مغربی مفکرین" کا ایک نسخہ انہیں اسی وقت پیش کیا۔ لیکن اس طرح کی ملاقاتوں سے کسی سیاسی نتیجے پر کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی وفد کی پذیرائی سے اگر کوئی نتیجہ آپ نکالنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اہلِ پاکستان کے دلوں میں ہندوستان کے لئے خیرسگالی کے جذبات ہیں۔ عداوت اور بغض کے نہیں۔

ص۔ پاکستان ریڈیو سے میں نے سنا تھا کہ آپ نے سیالکوٹ میں قلعے

سے علامہ اقبال کے مکان تک ایک جلوس کی رہنمائی کی تھی؟

ا۔ جی ہاں یہ صحیح ہے۔ اب آپ اسی بات ہی کو لے لیجیے۔ اس کانگرس میں ایک سے ایک بڑا ماہر اقبالیات موجود تھا۔ ایسا ندر بسانی تھے ایوا میرووچ تھیں، صابری تبریزی تھے اور خود پاکستان میں یوسف سلیم چشتی، بشیر احمد ڈار، سید عبدالواحد، خواجہ عبدالوحید، نذیر نیازی عبدالسّلام خورشید، جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن اور جاوید اقبال موجود تھے۔ اگر ہندوستان کے لیے اہلِ پاکستان کے دل میں کسی قسم کے عناد، بغض یا عداوت کا جذبہ موجود ہوتا تو وہ اس خاکسار کو یہ اعزاز کیوں دیتے اور پھر سوال یہ ہے کہ ہندوستان سے وہ سرور، جعفری صباح الدین عبدالرحمٰن کو اور مجھے کیوں مدعو کرتے؟ ایسی انہیں کون سی مجبوری تھی؟ اور اگر ہم چار ادیب وہاں نہ ہوتے تو اقبال عالمی کانگرس میں کون سی کمی واقع ہو جاتی؟

ص۔ ایک زمانے میں اہلِ پاکستان اقبال کو اپنا ملّی ہیرو تسلیم کرتے تھے اور انہیں بانیٔ پاکستان قرار دیتے تھے۔ کیا اب اس نظریے میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی ہے؟

ر۔ صوفی صاحب یہ آپ نے ایک بڑا اہم سوال کیا ہے۔ میں اس سوال کا پوری طرح تجزیہ کر کے اپنا جواب آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اہلِ پاکستان کو اقبال سے

جو عقیدت ہے اس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں۔ اقبال عالمی کانگریس بھی عقیدت کے اظہار ہی کا ایک پہلو تھی۔ اب رہا سوال اقبال کو ملی ہیرو یا بانیٔ پاکستان سمجھنے کا سوال۔ غالباً اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ بانیٔ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح ہیں اور اہل پاکستان اس بات سے بخوبی واقف ہیں۔ لیکن اقبال اہل پاکستان کے یقیناً ملی ہیرو ہیں اور تصور پاکستان کو اقبال ہی کی دین سمجھتے ہیں۔ اب اس مسئلے پر لمبی بحث کا تو آج وقت نہیں لیکن صوفی صاحب جو لوگ تصور پاکستان کو فکر اقبال سے لاتعلق قرار دیتے ہیں یا ان کا مطالعۂ اقبال یا ادھورا ہے یا غیر دیانتدارانہ۔ ۱۹۳۱ء میں اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ سیشن الٰہ آباد میں جو خطبہ صدارت پیش کیا اس میں اس مملکت کے قیام کی جھلک موجود تھی جو بعد میں پاکستان کے نام سے نقشۂ عالم پر نمودار ہوئی۔ ہندوستان میں بعض لوگ قیام پاکستان کو پسند کریں یا ناپسند کریں یہ دوسری بات ہے لیکن تصور پاکستان کو فکر اقبال سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو اقبال کو ہندوستان نے زیب طاق نسیان ہی بنا دیا۔ دراصل یہ جذبہ پاکستان ہی کے خلاف تھا جیسے جیسے پاکستان کے لئے اہل ہند کے دلوں میں جذبہ مخالفت

کم ہوتا گیا اقبال بھی ہندوستان میں Rehabilitate
ہوتے چلے گئے۔

س۔ عام خیال یہ ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ خیال بڑی حد تک صداقت پر مبنی ہے کہ اقبال کو ہندوستان میں Rehabilitate کرتے میں آپ کا بہت بڑا ہاتھ ہے
جس زمانے میں عام طور پر اقبال کا نام لینا جرم سمجھا جاتا تھا آپ نے اقبال کے متعلق تحریروں اور تقریروں کا سلسلہ جاری رکھا۔

ا۔ صوفی صاحب، جس خیال کا اظہار آپ نے کیا ہے اسی خیال کا اظہار ہندوستان کے اکثر ادیب مثلاً مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر خلیق انجم اپنی تحریروں میں کر چکے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب میں اس قسم کے تعریفی جملے سنتا ہوں تو میرا نفس بہت موٹا ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال سے اہل ہندوستان زیادہ دیر تک بیگانہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ہندوستان ایک بڑا ملک ہے۔ بڑا سے میری مراد اس کا طول و عرض نہیں ہے۔ بلکہ اس کی روحانی، علمی اور ادبی عظمت ہے اور ہندوستان ایسا بڑا ملک اقبال ایسے بڑے شاعر اور اپنے اتنے بڑے فرزند کو بہت مدت تک نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اقبال علم و ادب کا آفتاب عالم تاب ہے۔

کچھ مُدّت کے لئے یہ آفتابِ عالم تاب بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ ان بادلوں کو تو ایک دن چھٹنا ہی تھا اس لئے یہ کہنا کہ جگن ناتھ آزاد ہی کی وجہ سے یہ بادل چھٹے ہیں صحیح نہیں ہے۔ خود میرے عظیم مُلک ہندوستان کو اس بات کا احساس ہُوا کہ اقبال ایسے علم و ادب کے آفتاب سے روگردانی ہندوستان کو زیب نہیں دیتی۔ جگن ناتھ آزاد کا اس میں کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ مرغ نے بانگ دی تو صبح ہوئی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صبح کو تو طلوع ہونا ہی ہے۔ مرغ بانگ دے یا نہ دے۔

ص ۔ آپ نے کہا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے خلاف ہندوستان میں ایک جذبہ موجود تھا۔ یہ جذبہ کن لوگوں کے دلوں میں تھا؟ کیا آپ کے دل میں بھی پاکستان کے خلاف جذبہ موجود تھا؟

ا ۔ یہ جذبہ یعنی پاکستان کے خلاف جذبہ شمالی ہند میں آباد ہندوؤں کی اکثریت کے دل میں تھا۔ میں ہر ہندو کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ ہندوؤں کی اکثریت کی بات کر رہا ہوں۔ شمالی ہند کا ذکر بالخصوص اس لئے ضروری ہے کہ جنوبی ہند تقسیم کے ہنگاموں سے بڑی حد تک غیر متأثر رہا۔ شمالی ہند کے ہندوؤں کی وہ نسل جو پاکستان کے خلاف تھی اب آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے اور نئی نسل خدا کے فضل سے اس جذبہ مخالفت سے بیگانہ ہے۔

آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ کیا میرے دل میں بھی پاکستان کے خلاف جذبہ موجود تھا۔ صوفی صاحب، مجھے تقسیمِ ہند کا دکھ تو ضرور تھا اور اس کے کئی وجوہ تھے۔ ایک تو یہ کہ مجھے اور میرے خاندان کے افراد کو لاہور، راولپنڈی، ضلع جہلم اور مغربی پاکستان کے بعض دیہات کو اکھڑ کے ہندوستان کے مختلف حصوں میں مارے مارے پھرنا پڑا۔ اور مدت تک پناہ گزینوں کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں لاہور بلکہ پاکستان سے جدا ہونے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا۔ غالباً یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ پاکستان کا سب سے پہلا قومی ترانہ جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوا تھا میں نے ہی لکھا تھا۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری کا ترانۂ پاکستان تو بہت بعد میں معرضِ وجود میں آیا۔ بلکہ حالات کی ستم ظریفی یہ تھی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے حفیظ جالندھری کا لکھا ہوا ترانۂ ہندوستان نشر ہو رہا تھا۔ اُس وقت حفیظ جالندھری شملے سے دہلی پہنچے تھے اور اپنی جان بچانے کی فکر میں تھے۔ جس رات میرا ترانۂ پاکستان لاہور ریڈیو سے نشر ہو رہا تھا میں اپنے مکان واقع رام نگر لاہور دبکا ہوا پڑا تھا۔ سارا رام نگر اور اس کے ساتھ ملحقہ کرشن نگر کا علاقہ خالی ہو چکا تھا۔ میرا خیال ہے ہندوؤں کی آبادی کے اس سارے علاقے میں میرے سوائے اور کوئی متنفس باقی

باقی نہیں رہ گیا تھا۔ یہ تو خیر صوفی صاحب کی ذاتی وجوہ تھیں۔ ایک سیاسی وجہ بھی تھی اور وہ یہ کہ تقسیم ہند کو میں ہندوستان میں باقی رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے بہت مضر سمجھتا تھا۔ تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد غالباً ساڑھے چار یا پانچ کروڑ تھی اور ہندوؤں کی اکثریت ان سب کو پاکستان بنانے کا ذمہ دار سمجھتی تھی۔ حتیٰ کہ اکثر ہندو ابوالکلام آزاد، شیخ محمد عبداللہ فخرالدین علی احمد، ذاکر حسین اور رفیع احمد قدوائی تک کو کھلم کھلا بُرا بھلا کہتے تھے۔ مخالفت کا یہ جذبہ بہت بعد میں جا کے کم ہوا۔

لیکن میرے دل میں پاکستان کے خلاف نفرت کا جذبہ نہیں تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو غالباً میرے والدِ محترم کے خیالات تھے جنہوں نے مجھے اس نفرت کے جذبے سے ہمیشہ بچائے رکھا۔ اگر ان کی نظم "پاکستان کو الوداع" آپ نے پڑھی ہے تو آپ میری بات بہ آسانی سمجھ لیں گے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پاکستان کے قیام کو ہندوستان کے تمام قومی رہنماؤں مثلاً مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، راج گوپال اچاریہ، ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد، رفیع احمد قدوائی اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے تسلیم کر لیا تھا۔ اب اس کے بعد کسی ہندوستانی کا پاکستان کے خلاف نفرت کا جذبہ دل میں پالنا میرے نزدیک بہت معیوب تھا۔ تیسرے تقسیم کے وقت

جن حالات سے میں گذرا ان حالات نے میرے دل میں اہل پاکستان کے لیے محبت کا جذبہ پیدا کیا نفرت کا نہیں۔ میں یہ حالات مختصر طور آپ کے سامنے رکھوں گا۔

جب میں اگست ۱۹۴۷ء میں رام نگر لاہور میں تنہا مقیم تھا۔ تو ایک دن نازش رضوی اور شیخ عبدالشکور آکر مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور میں کئی روز شیخ عبدالشکور کے گھر میں ان کے گھر کے افراد کی طرح رہا۔ بعد میں جب اس محلے میں امرتسر اور دہلی سے لٹ پٹ کے آئے ہوئے مسلمان آکر آباد ہونا شروع ہو گئے اور اس امر کا اندیشہ لاحق ہوا کہ شاید انہیں میری موجودگی کا علم ہو جائے تو مجھے نازش رضوی اپنے گھر لے گئے اور اس وقت تک مجھے اپنے یہاں رکھا جب تک شیخ عبدالشکور اور نازش رضوی دونوں کو اس امر کا یقین نہ ہو گیا کہ اب ان کے لیے لاہور میں ایک ہندو کی حفاظت کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ اس کے بعد میرے یہ دونوں بزرگ دوست مجھے بحفاظت ہندوؤں کے ریفیوجی کیمپ میں لے آئے اور اپنے سامنے ایک بس میں بٹھا کے ہندوستان روانہ کیا۔

اس موقع پر خان بہادر ملک خدا بخش سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھے دہلی جانے سے یہ کہہ کے روکا کہ حالات کچھ دنوں میں اچھے ہو جائیں گے۔ آپ میرے پاس میرے گھر میں رہیے۔ اس کے بعد میں آپ کو

ریڈیو میں یا اور کسی اور اچھی جگہ ملازمت دلوا دوں گا۔ لیکن ایک تو میں خود اس خانہ بدوشی کی زندگی سے اکتا چکا تھا، دوسرے نازش رضوی اور شیخ عبدالشکور میرے لیے اپنے خلوص اور محبت کی بنا پر یہ طے کر چکے تھے کہ میں لاہور میں نہ رہوں اور ہندوستان چلا جاؤں۔

اب اس صورتِ حال کے پیش نظر صوفی صاحب، آپ خود اندازہ کیجیے کہ میرے دل میں پاکستان اور اہلِ پاکستان کے لیے نفرت یا مخالفت کا جذبہ کہاں سے آ جائے گا۔ یہ جذبہ پیدا ہونے سے قبل ہی نازش رضوی، شیخ عبدالشکور اور خان بہادر ملک خدا بخش کے ہاتھوں جڑ سے اکھڑ جا چکا تھا اور خدا کے فضل سے میرے دل میں پاکستان اور اہلِ پاکستان کے لیے محبت کا آج بھی وہی جذبہ موجود ہے جو اُس وقت تھا۔

ص۔ آزاد صاحب یہ تو آپ نے عجیب و غریب واقعات سنائے ہیں۔ ہم تو اب تک ان سے بے خبر تھے۔ اب ایک بار پھر مجھے اپنے سوال کی طرف واپس آنے دیجیے اور یہ بتایئے کہ کیا اہلِ پاکستان اقبال کے فکر و نظر کو یہیں تک محدود سمجھتے ہیں کہ انھوں نے تصورِ پاکستان پیش کیا یا اقبال پر اہلِ پاکستان کا کام اس سے آگے بھی بڑھا ہے۔

ا۔ پاکستان میں ماہرینِ اقبالیات کا کام یقیناً آگے بڑھا ہے۔ اقبال

کے بین الاقوامی نظریہ کو اس وقت وہاں بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔

سیاست دان حضرات بھی اقبال کے یونی ورسل اپروچ کو فکرِ اقبال میں نمایاں حیثیت دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مثلاً کانگریس کی افتتاحی تقریب میں صدرِ پاکستان چودھری فضل الٰہی نے ابتدا ہی میں اقبال کے یہ جملے دہرائے ہیں۔ "تاہم ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ فلسفیانہ غور و فکر میں قطعیت تام کی کوئی چیز نہیں۔ جیسے جیسے جہانِ علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے اور فکر کے نئے نئے راستے کھلتے ہیں کتنے ہی اور نظریئے اور شاید ان نظریوں سے جو ان خطبات میں پیش کیے گئے ہیں، زیادہ بہتر نظریئے ہمارے سامنے آتے جائیں گے ہمارا فرض بہرحال یہ ہے کہ فکرِ انسانی کے نشو و نما پر باضابطہ نظر رکھیں اور اس باب میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید سے کام لیتے رہیں۔" جب صدرِ پاکستان نے اقبال کے یہ جملے دہرائے تو ہال میں بہت دیر تک پُر زور تالیوں سے ان جملوں کا استقبال ہوتا رہا۔

پنجاب کے گورنر اسلم ریاض حسین نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اقبال کا پیغام صرف اپنے ہم مذہبوں کے لئے نہیں تھا۔ اپنے فکر و فن میں اقبال نے ان اصولوں کی نشاندہی کی ہے جو انسان کی ارتقائے خودی کے ضامن ہیں۔ اقبال نے دُنیا کے متعدد بڑے بڑے انسانوں کی اپنی نظم و نثر میں تعریف کی ہے۔ اور صوفی صاحب آپ تو جانتے ہیں ان بڑے انسانوں

ہیں جہاں حضرت نظام الدین اولیا اور حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہم آتے ہیں وہاں زرتشت، ٹالسٹائی، رام، بدھ اور گرونانک دیو بھی آتے ہیں۔ خود میں نے اپنے مقالے Iqbal: His Art and Thought میں اقبال کے بین الاقوامی نقطہ نگاہ کی اہمیت کو واضح کیا تھا اور فیض احمد فیض اور ڈاکٹر جاوید اقبال نے میرے مقالے کو بہت پسند کیا تھا۔ بقول جاوید اقبال پروفیسر الیساندرا اور جسٹس ایس۔ اے رحمان نے بھی میرے مقالے کی تعریف کی تھی۔

ص۔ آپ نے تھوڑی دیر قبل شاید یہ کہا تھا کہ اس کانگریس میں دنیا بھر سے مندوبین شریک ہوئے تھے۔ کیا اتنے لوگ دنیا میں اقبال پر کام کر رہے ہیں؟

ا۔ جی ہاں، غالباً مندوبین کی صحیح تعداد ایک سو چھیاسی تھی۔ ایک سو مندوبین تو پاکستان ہی کے تھے۔ باقی چھیاسی ہم لوگ باہر کے تھے۔ اور اس انتخاب میں تین طرح کے ادیب اور محقق شامل تھے۔ پہلی فہرست میں وہ ادیب اور محقق شامل تھے جو اقبال پر کام کر رہے ہیں مثلاً ایوا میورو ویچ (فرانس) صابری تبریزی (ایران) الیساندر باسانی (اٹلی) اور آل احمد سرور، صباح الدین عبدالرحمٰن اور سردار جعفری (ہندوستان)

ص۔ اور آپ خود۔

ا۔ چلئے ایسا ہی سہی۔ دوسری فہرست ان لوگوں کی تھی جنھوں نے اقبالیات

پر تو نہیں لیکن اسلامیات پر معیاری کام کیا ہے مثلاً ڈاکٹر باربرا مٹکاف (کینیڈا) شیلا میکڈونو (امریکہ) حاجی عبدالکریم سوہا توڈ جاپان) وغیرہ اور تیسری فہرست میں وہ لوگ شامل تھے جنہوں نے اردو ادب پر کام کیا ہے۔ جیسے رلیف رسل (انگلستان) یان ماریک (چیکوسلوواکیہ) اور بیلیکوف (روس) لیکن وہاں مقالے سب نے اقبال ہی پر پڑھے۔

ص۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ اقبال پر دنیا میں ایک سو سے زیادہ نقاد اور محقق کام کر رہے ہیں تو اقبال پر کتابوں کی تعداد کا آپ کے اندازہ ہوگی۔

ا۔ صوفی صاحب کتابوں کی بات یہ ہے کہ آپ لاہور میں اقبال پر کتابوں کی نمائش کو دیکھتے تو حیرت زدہ رہ جاتے۔ صرف اقبال اکیڈمی لاہور نے ۱۹۷۷ء میں اقبال پر ایک سو اٹھائیس کتابیں شائع کیں۔ اس کے علاوہ کوئی اشاعتی ادارہ پاکستان میں ایسا نہیں جو اقبال پر کتابیں شائع نہ کر رہا ہو۔ اقبال پر کتابیں انگلستان، امریکہ، فرانس، جرمنی، ہندوستان اور عرب ممالک میں برابر شائع ہو رہی ہیں۔ ہم لوگوں کا اندازہ یہ ہے کہ اس وقت تک اقبال پر کوئی دو ہزار ۲۰۰۰ کتابیں اردو سمیت دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ مقالات اور رسائل کے خاص نمبر اس کے علاوہ ہیں۔

ص۔ کیا کتابوں کی یہ نمائش اقبال عالمی کانگریس کا جزو تھی اور کیا یہ حکومت پاکستان نے مرتب کی تھی؟۔

ا۔ جی ہاں یہ نمائش اقبال عالمی کانگرس کا جزو تھی لیکن یہ حکومت نے کیسے مرتب کی تھی۔ حکومت پاکستان کی سرپرستی تو ساری کانگرس کو حاصل تھی۔ یہ نمائش تین ادیبوں کی شبانہ روز محنت کا نتیجہ تھی اور وہ ادیب ہیں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سلیم اختر اور پروفیسر رفیع الدین ہاشمی۔

ص۔ نمائش سے یاد آیا کیا پاکستان میں اقبال کی تصویری نمائش بھی منعقد ہوئی جیسے ہندوستان میں آپ کی مرتب کی ہوئی تصویروں کی نمائش سارے ہندوستان کا چکر لگا رہی ہے۔

ا۔ جی ہاں۔ وہاں جاوید منزل میں ایک تصویری نمائش بھی منعقد ہوئی لیکن وہ اقبال کی چند نادر تصاویر پر مشتمل تھی۔ اس لیے بہت مختصر پیمانے پر تھی۔ میری نمائش میں تصاویر کی تعداد چھ سو کتیس ہے۔ وہاں کی نمائش میں تصویروں کی تعداد بہت کم تھی۔

ص۔ اچھا آزاد صاحب اب آخر میں آپ ہمیں یہ بتائیے کہ آپ اس سفر کے کس پہلو سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے

ا۔ مزار اقبال پر حاضری سے۔ اس حاضری نے مجھے جذبات کی ایسی کیفیت سے آشنا کیا جو میرے نصیب میں کبھی کبھی آتی ہے۔ اس حاضری کے متعلق میں نے ایک نظم بھی کہی ہے اس کے دو ایک شعر آپ کو سناتا ہوں۔ ے

مرقدِ اقبال پر حاضر تھی جب دل کی تڑپ

زندگی کا ایک پردہ درمیاں تھا دوستو!

قُرب نے پیدا کیا تھا خود ہی دوری کا سماں

فاصلہ ورنہ کوئی حائل کہاں تھا دوستو!

روبروئے جلوۂ مرقد وجودِ کم عیار

ذرّۂ ناقص شرمسارِ امتحاں تھا دوستو!

کاش تم بھی میری پلکوں کا نظارہ دیکھتے

یہ نظارہ کہکشاں در کہکشاں تھا دوستو!

اقبال کی یاد

علی سردار جعفری کے سفر پاکستان کے تاثرات

(حسن علی مرزا)

سردار جعفری نظام کلب کے گیسٹ ہاؤس میں تلگو کے چند صحافیوں سے مصروف تکلم تھے۔ وہی ترقی پسند ادب کی تحریک کی باتیں۔ ڈگمبر اور رنگن کو کویتا کے تذکرے۔ دن بھر کی مصروفیات سے تھکے تھکائے۔ سردار تکیہ سے ٹیکا لیے ان کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے۔ لیکن ان کی آنکھوں سے ایک خواہش جیسے بول رہی تھی کہ بھئی میں پاکستان سے لوٹا ہوں وہاں کی کچھ باتیں پوچھو ہم نے اس سفر کی یاد دلوائی تو وہ ان دنوں کا تذکرہ کرنے لگے جو لاہور، سیالکوٹ اور پاکستان میں گزرے تھے اقبال ہی سے ہماری اس بات چیت کا آغاز ہوا۔ میں نے پوچھا۔

"اقبال کے تعلق سے پاکستان کے دانشوروں کا رویہ کیا ہے، کیا وہ اقبال کو پاکستان کی تخلیق و تشکیل کا محرک قرار دینے ہی پر قناعت کرتے ہیں۔

سردار بولے، اب وہ صورت حال باقی نہیں رہی۔ یہ صحیح ہے کہ پاکستانی دانشوروں کے لئے یہ تصور بڑا جاذب نظر ہے کہ ان کے خوابوں میں بسنے والا

ایک خطۂ ارضِ عالم وجود میں آیا لیکن وہ بھی بڑے ہی غیر محسوس انداز میں

اپنے محاسبۂ باطن کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جس سرزمین کی شہریت کا انہیں اعزاز حاصل ہوا وہ اقبال کی شہرۂ آفاق نظم "طلوعِ اسلام" سے کوئی مشابہت یا مطابقت نہیں رکھتی، وہ بہت خوش ہیں، بہت سے لوگ اقبال کے آفاقی نقطہ نظر کو سرچشمہ وجدان بنائے ہوئے ہیں۔ اقبال کانگریس میں پاکستان نے ۵۰ بیرونی ممالک کے ادیبوں اور شاعروں کو شرکت کی دعوت دی تھی ان کے قافلے کو لے کر جب وہ اقبال کے پیدائشی شہر سیالکوٹ میں ان کے آبائی مکان کی زیارت کے لئے چل پڑے تو انہوں نے جگن ناتھ آزاد کو اس کارواں کی سرداری کا اعزاز عطا کیا۔ سیالکوٹ میں اقبال کے گھر تک پہنچنے کے لئے ایک لمبی گلی سے گذرنا پڑتا ہے جس کے دونوں طرف مکانات کا سلسلہ سا چلا گیا ہے جب قافلہ گلی کے اسی سرے پر پہنچا جہاں سے اندر داخل ہونا تھا تو نوجوانوں کا ایک ہجوم ہاتھوں میں پھولوں کا ہار لیئے کھڑا تھا یکے بعد دیگرے یہ ہار قافلہ کے سالار جگن ناتھ آزاد کے گلے میں ڈالے گئے، اور جب کارواں گلی طے کرنے لگا تو ہر دریچہ سے پھولوں کی بارش ہونے لگتی۔ ہر ایک اسے روک روک کر پوچھتا جگن ناتھ آزاد کہاں ہے سردار کہاں ہے اور پھر جب انھیں بتایا جاتا کہ یہ جگن ناتھ آزاد ہے اور یہ ہے سردار جعفری تو اس بے اختیاری کے ساتھ بغل گیر ہو جاتے کہ ان کے دلوں کی دھڑکنیں "ان کہے" انتظار کی صورت اختیار کر لیتیں۔

سردار، سفر پاکستان کچھ اس انداز میں سنانے لگے کہ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں پاکستان پہنچ گیا ہوں۔ سردار کا سلسلہ کلام ٹوٹتا ہی نہیں تھا۔ میں اس انتظار میں کہ

وہ دم لیں تو دوسرا سوال کروں۔ بڑی مشکل سے مجھے ایک لمحہ ملا۔ میں نے پوچھا پاکستان میں عام ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا رجحان کیا ہے۔ سردار کی گرجدار آواز پھر ایک بار گونجی۔

تقسیم ہند کو ۳۰ برس بیت چکے ہیں اور ادیبوں، شاعروں، دانشوروں کی اُس پیڑھی کے لوگ خال خال ملتے ہیں جنہوں نے تقسیم ہند کے بعد کے خون خرابہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لکھنے والوں کی نئی نسل ۲۵ اور ۳۰ سال سے بڑی عمر کی نہیں۔ ان کے تحت شعور میں ایسے کسی احساس کی جھلک نظر نہیں آتی جو انسانی رشتوں کی شکست و ریخت کا ردِ عمل ہوتا ہے وہ بار بار پوچھتے ہیں، ہندوستان کے طلباء کے وفود پاکستان کیوں نہیں آتے ادیب اور صحافی کیوں نہیں آتے؟"

سردار نے بتایا، انہیں اپنے پاکستان کے دوران قیام میں ہر روز کسی نہ کسی جلسہ میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ ایک جلسے میں ان کو پاکستان کی نوخیز شاعرہ پروین شاکر کو سننے کا موقع ملا اور وہ پروین کے کلام سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنے رسالہ "گفتگو" کے لیے انہوں نے اس کی کوئی آدھی درجن نظموں اور غزلوں کا اسٹاک اپنے ساتھ لے آئے سردار بڑے شوق سے اس جلسہ کی روئداد سنانے لگے۔ پروین شاکر مشکل سے ۲۵، ۲۶ سال کی ہے۔ ابھی ابھی اس کا پہلا مجموعہ "خوشبو" منظر عام پر آیا ہے وہ ڈائس پر آئی اور کہنے لگی میں نے ایک نظم لکھی ہے "مشترکہ دشمن کی بیٹی" میری آرزو اور التجا ہے کہ سردار میری طرف سے لتا منگیشکر کو بطور تحفہ دے کر اس سے کہیں کہ

اے میرے پیارے دشمن کی پیاری بیٹی تیری آواز تو ریڈیو کی وساطت سے ہمارے کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن تو خود کیوں نہیں آتی۔ ہمارا مہدی حسن تیری گلی کا پھیرا کر رہا ہے۔ اب تو آجا۔ پروین بولے جا رہی تھی اور پوری محفل پر ایک سناٹا سا طاری تھا۔ اس مختصر لیکن بے حد پُراثر تمہید کے ساتھ پروین اپنی نظم سنانے لگی اس میں ایک رستوران کو پیش کیا گیا ہے جس میں دو لڑکیاں، کافی کی چسکیاں لیتی ہوئیں، ہاتھ کی مہندی، کلائی کی چوڑیاں، رنگ برنگی ڈوپٹے لپ اسٹک اور اپنے محبوب سے چوری چھپے کی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے ۱۹۶۵ء کی جنگ تک پہنچ جاتی ہیں اور چوڑیوں کی جھنکار کے بجائے رستوران کی فضا میں بارود کا دھواں بھر جاتا ہے۔ پھر ۱۹۷۱ء کی لڑائی پر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بگولے رستوراں میں گھسے چلے آرہے ہیں۔ لڑکیوں کا دم گھٹنے لگتا ہے لیکن رستوران میں اچانک لتا کا نغمہ گونجنے لگتا ہے۔ ع جانے والے سے ملاقات نہ ہونے پائی

اور پھر سارا تناؤ ختم ہو جاتا ہے اور تازہ ہوا کا ایک جھونکا دریچے کے اندر داخل ہوتا ہے۔ سردار کہنے لگے یہ نظم اتنی مؤثر تھی کہ خود ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے لیکن وہ بتا نہیں سکتے کہ یہ آنسو کیوں پلکوں کے بند کو توڑ کر سامنے دھرے کاغذ پر ٹپک پڑے تھے۔ اپنے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے جب انہوں نے شاعرہ کو دیکھا تو اس کے گالوں پر بھی آنسوؤں کی ایک لڑی سی نظر آرہی تھی۔ اور سامعین میں سے کئی ایک لوگوں کا یہی عالم تھا" سردار نے لہک لہک کر پروین کے کچھ اشعار بھی سنائے۔

شوقِ رقص سے جب تک انگلیاں نہیں کھلتیں
پاؤں سے ہواؤں کے بیڑیاں نہیں کھلتیں

حُسن کو سمجھنے کو عمر چاہیئے جاناں
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

میں ان کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

سردار، پروین شاکر کے چیدہ اشعار سناتے جا رہے تھے اور میری نظروں میں میری بڑی بھتیجی انیسہ پروین کا خاکہ ابھر رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ دو الگ الگ ملکوں کی لڑکیوں میں فرق ہی کیا ہے! "خواب بستیوں" کے یہ سارے مکین ایک دوسرے سے کتنے مشابہ ہیں۔

سردار سے میں نے پاکستان کی صحافت کے بارے میں کچھ جاننا چاہا۔ انہوں نے کہا۔ "پاکستان میں اردو کے اخبارات بہت بڑھیا اور اعلیٰ معیار کے ہیں اور ان

اخبارات کو دیکھنے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آج کے پاکستان پر حاوی جذبہ "ہندوستان سے دوستی" ہی ہے۔ انگریزی اخبار "ڈان" نے میرے آنے پر دو کالم کا اداریہ لکھا "جنگ" میں بھی میرے آنے کی خبر اور میری تقاریر کے اقتباسات بڑے اہتمام اور انتظام سے شائع کئے گئے۔ روزنامہ "مساوات" نے جو ابراہیم جلیس کی شہادت کے بعد پاکستان میں آزادیِ صحافت کا سب سے بڑا نقیب سمجھا جاتا ہے، میری مصروفیات کے لئے اپنے صفحات پر کافی جگہ نکالی۔"

سردار اب کچھ تھک سے گئے تھے پاکستان کی سیاسی فضا کے بارے میں جب میں نے اس سے کچھ جاننا چاہا تو انہوں نے بڑی تنک مزاجی سے جواب دیا "میں ایک ادیب اور صحافی کی حیثیت سے پاکستان گیا تھا۔ میں نے پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ۱۲ دن گزارے اور اس اثناء میں میں نے کبھی پاکستان کے کسی سیاسی لیڈر سے ملاقات نہیں کی۔ پاکستان مارشل لاء کے ایک بڑے صبر آزما دور سے گذر رہا ہے اور میں اس ملک کی سیاست پر تبصرہ کر کے ان لوگوں کو کانٹوں میں نہیں الجھانا چاہتا جنھوں نے ہمارے لئے یہ پھولوں کی سیج بچھا رکھی تھی۔ میں اور عباس نے اقبال پر دوریل کی ایک ڈکومنٹری فلم بنائی ہے۔ میں حکومت پاکستان اور اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال کا بیحد ممنون ہوں کہ اس کے فلمانے کے سلسلے میں ہمیں ان لوگوں کا بڑا تعاون حاصل رہا۔ جاوید اقبال کے ایک خوبصورت انٹرویو نے ہماری اس تخلیق میں ایک نئی جان ڈال دی ہے اور اب اس فلم کا ایک پرنٹ شری اٹل بہاری واجپائی نے پاکستان کو پیش کیا ہے۔ پاکستان کے لوگ اس فلم کو دیکھنے کے بہت

آرزومند ہیں اگر ہماری یہ حقیر کوشش انہیں پسند آئے تو میں اسے بڑی کامیابی تصوّر کروں گا۔"

سردار کا خیال ہے کہ "اقبال کی یاد ہندوستان اور پاکستان کے رشتوں میں استواری پیدا کرنے کا ایک بڑا محرّک بن گئی ہے اور ایک شاعر کی وسعتِ خیالی نے برِ صغیر ہند و پاک کو ایک اکائی کی صورت دے دی ہے۔ جو رفیق ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے ان میں سے اکثر منوں مٹی کے تلے دبے ابدی نیند سو رہے ہیں لیکن ان کی نسل اس رشتۂ محبت کی تجدید میں مصروف ہے جس پر سیاسی مفادات کا زنگ چڑھ گیا۔ سردار نے یاد دلایا کہ انہوں نے ایک دفعہ اہلِ پاکستان کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبحِ بنارس کی روشنی لے کر

وہ صبح بنارس کی روشنی کا تحفہ لے کر پاکستان گئے تھے اور پاکستان والوں نے گلشنِ لاہور کے سب سے خوب صورت پھول ان کے دامن میں ڈال دیئے۔

(بشکریہ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد)

۔ جی ہاں یہ نظم تم جو لاہور سے آؤ تو ۔۔۔ آپ پڑھ چکا ہوں اب آپ نے چند اشعار دوبارہ سنا دیے انہوں نے قندِ مکرّر کا مزہ دیا۔ آزاد صاحب اُن اشعار کے لیے بھی آپ کا شکریہ اور سارے انٹرویو کے لئے بھی ادا کرتے ہیں۔ آپ کی اس بات چیت سے ہم نے بھی لاہور اور سیالکوٹ میں منعقدہ اقبال عالمی کانگریس کی جھلک دیکھ لی اور اب ہم اس بات چیت میں عن قریب "سری نگر ٹائمز" کے قارئین کو بھی شریک کریں گے۔

جسٹس قدیر الدین احمد

فکرِ اقبال کے بُنیادی عناصر

اقبال رح کی شخصیت میں ایمان عشق اور فلسفہ اِس طرح حل ہو کر یک جان ہو گئے ہیں کہ ان کو جُدا کر کے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عقل سے بہت سا کام کیا ہے۔ اگرچہ اس کے خیالات میں جذبات اور حُسن ادا اکثر شورِ محشر برپا کرتے رہے ہیں۔ یہ اس کی شخصیت ہی کی کیفیت ہے کہ اس کا بُنیادی خیال فلسفیانہ بھی ہے۔ اور والہانہ بھی۔ دل تڑپاتا بھی ہے اور اسے تسکین بھی دیتا ہے۔ صدہا جذبات اُٹھ اُٹھ کر اپنی نیرنگیوں سے اس کو گہرے اور ارفع احساسات کی طرف بڑھاتے ہیں مگر عقل اس کو جذبات میں بہہ جانے سے روکتی ہے۔ وہ بے چین ہو کر ہر طرف دیکھتا ہے کہ کوئی میرا ساتھ دینے والا بھی ہے یا نہیں۔ اس کو پروانے تو بہت نظر آتے ہیں۔ مگر کوئی بھی ساتھی نظر نہیں آتا ——— چناں چہ فریاد کرتا ہے۔ کہ

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست
آہ یک پروانۂ من اہل نیست

پھر خود اس کو عالمِ رنگ و بو اور کائنات کے شور و شغب میں اپنے ہی اندر ایک صلاحیت نظر آتی ہے جو بلا کی طاقتور ہے۔ یہ ذوقِ ایجاد اور اختراع ہے۔ وہ پہچان لیتا ہے۔ کہ یہ ذوق و شوق قضا و قدر کی طرف سے ہر انسان کے لیے ایک انعام ہے۔ جو اس کے خمیر میں موجود ہے۔ اس لگن کو دیکھ کر وہ حیران بھی ہوتا ہے۔ اور ممنونِ احسان بھی۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ قوت کارخانۂ عالم میں بھی ہر طرف موجود ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔ کہ

اگر این خاک دان را واشگافی
درونش بنگری خونریزیِ عشق

اسی قوت سے دنیا کے دور ترقی کی طرف بدل رہے ہیں۔ یہ قوت قدرت کی تخلیقی طاقت کا ایک عکس ہے۔ اسی لیے ہر چیز میں نمایاں ہے۔ مگر اس کی ہمہ گیر خاصیت کو پہچاننے میں بڑے بڑے عاقلوں نے غلطی کی ہے۔ اگر وہ اس کو پہچان لیتے تو اقبالؒ کے ہمنوا ہو کر کہہ دیتے

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است

مگر انسان نے کل زندگی پر ایک جامع نظر ڈالنے کی بجائے یہ کیا کہ کبھی اجزائے عالم کی طرف دیکھتا رہا تو کبھی فقط اپنے دل کی طرف کبھی ایک طرف ڈھل گیا تو کبھی دوسری طرف۔ اس

کو خیال نہیں آیا کہ جب سارے عالم میں یہ خاصیت یکساں کار فرما ہے۔ تو لازمی ہے کہ ہمہ گیر بھی ہو۔ اگر انسان کو احساس ہو جائے کہ قوتِ ایجاد کائنات میں تلاطم برپا کئے ہوئے ہے۔ اس لئے ضرور ایک واحد طاقت ہو گی۔ جس کا مقصد ارتقائے ہمہ رنگ ہی ہو سکتا ہے۔ تو وہ کائنات سے متحد ہو کر اس کا روپ بدل دے۔ یہی ذوق انسان کو اتحادِ حقیقی کی طرف لے جائے اور خود انسان کا عشق باکمال ہو جائے۔ اقبالؒ نے یہ خیال طرح طرح سے ظاہر کیا ہے۔ یہی خیال اس کا جذبۂ شعر بھی ہے۔ اور یہی فلسفہ بھی ہے ؎

زشعرِ دلکشِ اقبال می تواں دریافت
کہ درسِ فلسفہ میداد و عاشقی ورزید

باقی جو کچھ اقبال کے بیان، سحر آفرینی اور خیالات میں ہے وہ سب اسی حکمت کی شرحیں اسی کے حصول اور اسی راز کے سراغ ہیں۔ جو ہم رنگی و ہم آہنگی اس نے خود دیکھی۔ اس کی تائید غائب سے اس کو اسلام کی تعلیم میں ملی اور پھر وہ فلسفہ شعر و ادب کے واحد زینہ پر چڑھتا رہا عالمِ بالا کا رخ کرتا ہے اور کائنات پر سے گزرتا ہوا عرش تک پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ تفصیل اور اصول بہت اہم ہیں۔ کیوں کہ ان سے یہ کھلتا ہے کہ کس طرح فرد کا ذوق اس کو ضمیر سے متاد دیتا ہے۔ اور پھر ملت غیر اہم میں مشغول ہے کر تسخیر کی طرف توجہ کرتی ہے۔ اور اپنے ضمیر میں زیادہ

کرتی ہیں۔ اس طرح فرد اور جماعت کے سارے اختلافات بھی مٹ جاتے ہیں۔ اور دونوں ایک جان ہو جاتے ہیں۔ فرد، جماعت اور عالم سب کی راحت اور تکلیف کا مطلب سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ مادے اور روح کے تصادم کا حل ملتا ہے۔ یہاں تک موت اور حیات کی حقیقت کھل کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ زندگی ایک کوشش ناتمام ہے۔ جس میں درد اور مُصیبت تو ایک طرف، موت بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

فرد میں جو قدرت نے تخلیق اور عمل کا عشق بخشا ہے اس کو، اس کے ظہور اور اس کے عجائبات کو اقبال اسرارِ خودی کہتا ہے۔ اور فرد کا جماعت کے ساتھ مِل کر ایک مجموعۂ صفات پیدا کرنے کو جب کہ جماعت کی مسلسل زندگی۔ جو صدیوں تک جاری رہتی ہے اور اپنی وسعتوں میں نئے نئے مقاصد کو حاصل کرنے میں مشغول رہتی ہے۔ اور ان ہی وسعتوں سے پھر فرد کے سیراب ہونے کو رموزِ بے خودی کہتا ہے۔ ان اسرار اور رموز کے بغیر تخلیق کا عشق اقبالؒ کے خیالات کا سنگِ بُنیاد تو رہتا ہے۔ مگر اس بُنیاد پر جو دلفریب اور شاندار عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ نہیں ہوتا اس تعمیر کے نہ در نظر آتے ہیں۔ نہ دیوار نہ بلند منزلیں نظر آتی ہیں اور نہ وہ مینار۔

اس سے پہلے کہ ان اصولوں کی طرف اشارہ کیا جائے جو اقبالؒ کے خیالات اور فکر کی بلندیوں میں شامل ہیں۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ اقبالؒ کا [illegible] سامنے انسانوں اور سب جماعتوں کے لئے [illegible] پھر اقبالؒ

اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اپنے کلام کو اکثر و بیشتر کیوں محدود کرتا ہے یہ سوال خود بخود ذہن میں آتا ہے۔ کہ عرش و کرسی، لوح و قلم اور وحدتِ خداوندی کی طرف وہ کیوں رُخ کر لیتا ہے؟ اپنے خیالات کی رو کو نہ نزولی کی طرف دوڑا کر خالص روحانی ذریعے سے اس کے راز کھولتا ہے نہ خالص علوم عقلی کی طرف بڑھ کر افلاطون کی ہمنوائی کرتا ہے۔ اور نہ مادیت کی طرف مُڑ کر مارکس کے انداز میں عقدہ کشائی کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اقبال رحؒ کے دل نے غور و فکر کے بعد یہ پایا کہ انسان کا خمیر جن عناصر سے بنا ہے ان میں روحانیت بھی ہے مادیت بھی۔ اور علم و عقل بھی۔ اس لیے کسی ایک طرف جُھک جانا انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ جب کبھی انسان نے ایسا کیا یا کرے گا تو فطرت کے تقاضوں اور ازلی آداب جبلت سے اس کا ٹکراؤ ہو گا اور اس کا ذوقِ تخلیق و تسخیر یا تو جلد ہی ناکام ہو جائے گا یا مدت تک عارضی کامیابیوں کے دھوکے میں پڑا رہے گا۔

اقبال رحؒ نے یونانی فلسفے کا مطالعہ کیا اور افلاطون کو یہ کہہ کر پیچھے چھوڑ دیا کہ یہ عقل کا پتلا تو ہے مگر اس میں ذوقِ عمل کی کمی ہے۔ اس عشق اور جستجو کی اس کو خبر نہ تھی جہاں سے ارتقاء کی سوتے پھوٹتے ہیں۔ اس کی ہدایات پر عمل کیا جائے۔ تو کائنات کی تسخیر کرنے کی بجائے انسان ایک راہب اور بزدل گوشہ نشین بن جائے گا۔ جس زندگی میں عملی جستجو نہیں وہ سنبھلنے اور رشد و ہدایت کی قوت نہیں رکھتی۔ چنانچہ اس نے افلاطون کے متعلق کہا ہے ؎

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود
جانِ او وارفتۂ معدوم بود

خالص روحانیت کی مثال اس نے بہت سے صوفیاء میں پائی۔ ان کی دلچسپیوں میں دنیا سے فرار پایا۔ اُن کو لذتِ احساس سے مخمور دیکھا اور ایک معنی آفرینی ان کا مقصد پایا جس میں تخلیق اور تسخیر کی بجائے انفعالیت نظر آیا۔ اس کا پیغام ان کے نام یہ ہے۔

زمن گو صوفیانِ باصفا را
خدا جویانِ معنیٰ آشنا را
غلام ہمتِ آں خود پرستم
کہ با نورِ خودی بیند خدا را

اقبال رح نے مغرب کا مطالعہ بھی کیا۔ وہاں مادیت کی جلوہ گری بھی دیکھی۔ کھوٹے اور کھرے کو پرکھا اور یہ سمجھا کہ عقل نے مادے پر حاوی ہو کر بڑی بڑی ایجادات تو کی ہیں۔ چنانچہ مغرب اپنی کیمیاگری سے ریگِ رواں کو زر تو کر سکتا ہے۔ مگر اس کے دلِ سوختہ میں اکسیر قیمت کم ہے۔ بغیر اس عشق کے جو ہمہ گیر ہے نہ اس کی بنیادیں مضبوط ہو سکتی ہیں اور نہ اس کے حدود وسیع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اسی پر یہ راز کھل گیا۔

دلِ بیدار نہ دادند بہ دانائے فرنگ
این قدر ہست کہ چشمِ نگرانے دادند

یہ تو صحیح نہیں ہے کہ اقبال کو اپنے تلاش اس طرح کی ہو کہ اس کا دل اسلامی تہذیب سے قطعی ناآراستہ ہو کیونکہ وہ روایاتِ اسلامی اور عقائدِ مسلمانی سے ہمیشہ سرشار رہا ہے۔ بچپن ہی سے اس کے دل میں اسلام کی تعلیم گھر کر چکی تھی۔ البتہ وہ گہرائیاں جن کی اس کو تلاش تھی وہ کہیں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ اور وہ بیتاب ہو کر پکارتا تھا کہ ؎

طورِ من سوز کہ می آید کلیم
تا امید آستم زیارانِ قدیم

وہ کائنات کے جزو و کل کو دیکھتا تھا کہ ان کی تہ میں ایسا راز مل جائے جس سے وہ سارے تار جو ٹوٹے ہوئے نظر آرہے تھے ایک ترتیب کے حامل اور ایک ہی مربط کے تار ہو جائیں۔ اس نے خود اپنی عقل کو استعمال کیا۔ اپنے فلسفہ دان دماغ سے کام لیا اور اپنے اس دل سے صلاح کرتا رہا۔ جو دردمند بھی تھا، حق شناس بھی۔ اور قدرتی طور سے بچپن بھی۔ اس بے چینی میں مولانا روم کی مثنوی کی دلآویزی نے ان کے ذوق کی بے تابی نے، ان کی نظرِ رازکشا نے اس کی دستگیری کی اور ہمت بخشی انہوں نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں بھی اس نور کی ایک جھلک ہے۔ نور بھی وہی ہے، جذبات بھی وہی ہیں۔ بس ان ہی کو عمل کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے یہ ابتدا خود اس

کی تخلیق ہے۔ چناں چہ اسی نظم میں جس میں رومیؒ سے ملاقات کا ذکر کرتا ہے یہ بھی کہتا ہے کہ ؎

ہیچ کس رازے کہ من گویم نہ گفت
ہمچو فکرِ من دُرِ معنے نہ سُفت

یہ اس کا نفسیاتی ارتقا تھا۔ جس ترتیب سے اس کو اُوپر بیان کیا گیا وہ تاریخی نہیں بلکہ خیالی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس غلط فہمی کو دُور کیا جائے کہ اس نے مولانا رومؒ کی تقلید ہی میں اپنے فلسفۂ عمل کو پایا۔ اِسی طرح اس غلط فہمی کے امکان کو بھی دُور کرنا مقصود ہے۔ کہ اقبالؒ کے احساسات اور عرفان کی ابتدا بعض فلسفیوں کی طرح خالص ذہنی جُستجو سے ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عقل کو اس نے اس سے زیادہ درجہ نہیں دیا کہ ؎

چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

اس کی روشنی میں تلاش ضروری، مگر جو بصیرت اس کو نصیب ہوئی اس میں اس کی عقلِ رسا کے ساتھ دلِ سوزمند اور اسلام کی تعلیم کا فیضان بدرجۂ اتم موجود تھا۔ وہ اپنی اس کیفیت کو جانتا تھا۔ چنانچہ اس نے کہا ہے۔ کہ

من کہ این شب را چو مہ آراستم
گرد پائے ملّتِ بیضاستم

اس کی طفولیت اور نوجوانی کے ماحول اور تعلیمی اثرات کا اس کے

دل و دماغ پر جو بھی اثر ہوا ہو اس سے تو وہ بچ نہیں سکتا تھا۔ مگر اپنی طرف سے غیر جانب دارانہ تلاش اس کا مطمحِ نظر تھا۔ اسی تلاش میں ان کو اسلام کی دولت مل گئی۔ چناں چہ سید عبدالوحید صاحب نے اپنی کتاب موسومہ "اقبال" میں بیان کیا ہے کہ اقبال رح نے ایک یورپی عالم کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ میری فارسی کی نظمیں اس غرض کی آئینہ دار نہیں ہیں کہ میں اسلام کی طرفداری کرتا ہوں۔ بلکہ میں تو اس کا خواہش مند ہوں کہ بہتر سے بہتر نظامِ تمدن کو تلاش کروں۔ اگر مجھے ایسا ہمہ گیر نظام موجود مل جائے جس میں رنگ، ذات اور قوم کا فرق معدوم ہو تو میں اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایسا نظام اس کو اسلام کی تعلیم میں ملا۔

وطنیت کا جو نقشہ اقبال رح نے مغرب میں دیکھا اس سے اس کو انسانیت کے مٹ جانے کا خوف ہوا۔ جمہوریت کا چرچا تو بہت سنا مگر دیکھا کہ ادھورے ادھورے اصولوں کو شافی اور کافی سمجھ کر سراہا اور پھیلایا جا رہا ہے۔ حالاں کہ ایک طرف تو وطنیت سے مخلوقِ خدا قوموں میں تقسیم ہو رہی ہے۔ اور انسانیت کے ٹکڑے ہو رہے ہیں اور دوسری طرف جذبۂ تفریق کو افسون بنا کر پیش کرنے سے بنے ہوئے فرقے آپس میں ٹکرا رہے ہیں مگر مخلوق کی تباہی کے اس منظر کو تجارت کی زرگری کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے اور اس طرح مقامی، مادی اور نسلی مفاد پر خدا کے بندوں کو قربان کیا جا رہا ہے ان قوموں اور فرقوں کی آنکھوں پر ایک اور پردہ اس موہوم تصور کا گر

ڈالا گیا کہ گویا سب انسانوں کے ساتھ برابر کا سلوک ہو رہا ہے۔ سب برابر کے حقوق رکھتے ہیں اور برابر کی عزت اور توقیر کے حق دار ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو زیر کرے۔ اس پر حاوی آسکے اور اپنا مطلب پورا کرنے کی ہر وقت درپے ہے۔ خود ایک قوم میں بھی برابری نام کو ہے۔ کیوں کہ برابری کا کوئی پکا اصول ان اقوام کے پاس موجود ہی نہیں ہے فقط کہنے کی باتیں ہیں۔ رُوسو نے اپنی کتاب "معاہدہ عمرانی" کے پہلے باب کو اس نعرے سے شروع کیا ہے۔ کہ "ہر ایک انسان آزاد پیدا ہوا مگر ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے"۔ مگر یہ قول حقیقت میں شروع ہی سے غلط ہے کہ ہر ایک انسان آزاد پیدا ہوا۔ کیوں کہ ہر ایک انسان اپنے گرد وپیش، تمدن، ماحول اور سیاسی طاقت سے مجبور ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک فرد عقل، طاقت، وجاہت بلکہ شعور تک میں بھی برابر نہیں ہوتا۔ اصل برابری جو قائم اور دائم ہے۔ یہ ہے کہ سب انسان خدا کے بندے ہیں خواہ وہ کوئی ہوں اور کسی حالت میں ہوں چنانچہ اصل برابری خدا کی بندگی میں ہے۔ کیوں کہ خدا کے حضور میں شاہ وگدا، محمود و ایاز ایک ہیں۔ یہی اصول حقیقی برابری کا ہے اور برابری کی پختہ اور لازوال بنیاد ہے۔ باقی سب کچھ افسانہ و افسون ہے۔ جو کہ ایک غیر معمولی انسان کی پیدائش ہے۔ جیسے نپولین اور ہٹلر نے پاش پاش ہو گئے ہے۔ کیوں کہ جمہوریت اور فسطائیت دونوں خیالی اصول ہیں۔ اسی طرح قوموں کے بے بنیاد حکمرانوں، فسادات اور انسانیت تباہ و برباد ہوتے ہیں اور فقط جمود ماضی باقی رہ جاتا ہے۔ قوموں کی خود غرضی، ایک قسم کی بیماری ہے۔

بُت پرستی کا رنگ اختیار کر چکی ہے۔ اقبال یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور اس مساوات کو یاد کرتا ہے جس کی بُنیاد وحدانیتِ خداوندی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

اقبال نے جمہوریت کی بُرائی کی ہے۔ کبھی اس کو "مغز دو صد خر" کہا ہے اور کبھی ایسی طرزِ حکومت بتایا ہے جس میں "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے" مگر اس کی مراد یہ نہیں ہے کہ مشاورت یا رائے عامہ ووٹ کے ذریعے معلوم کرنا اور اس رائے کو قابلِ پابندی تصور کرنا غلط یا قابلِ اعتراض بات ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ بھی ایک جائز طرز اور تدبیر ہے مگر غلطی یہ ہے کہ اس کو ایسی اصلیت مان لیا جائے کہ گویا اس کے اصول سچے اور دوامی ہیں۔ طرز کو طرز ہی سمجھنا چاہئے نہ کہ ایک متبرک اور ہر لحاظ سے قابلِ تقلید شے۔

کائنات میں وہ طرح طرح کے اختلافات اور ٹکراؤ اس کی نظر کے سامنے آتے ہیں۔ مگر جب وہ ان پر اسلام کی کاشفانہ روشنی ڈالتا ہے۔ تو سب افتراق اور سارے تضاد اس طرح غائب ہو جاتے ہیں جیسے سورج کی روشنی میں شبنم کے قطرے معدوم ہو جائیں۔ اس کی سب سے گہری نظر اس حقیقت پر پڑتی ہے اور پورے انہماک سے جمی رہتی ہے کہ خدائے کائنات کی صفات میں سے ایک بڑی واضح صفت اس کی قوت اور ذوقِ تخلیق ہے۔ جب اس نے انسان کو پیدا کیا تو کہا کہ میں نے زمین

پھر اپنا نائب مقرر کیا اور یہ بھی فرمایا کہ انسان کی فطرت اللہ کی فطرت پر ہے چنانچہ انسان کا تجربہ یہ ہے۔ کہ سب سے زیادہ خوشی اور اطمینان اس کو اس وقت میسر آتا ہے جب وہ کچھ تخلیق کرتا ہے۔ یہی اس کا شوق و ذوق اور یہی اس کا اصلی منبعِ عشق ہے خدا نے کائنات بنائی اور انسان نے اس کو اپنے کام کا اور اپنے ذوق کا بنایا۔ اقبال رح کی ایک مشہور نظم میں انسان خدائے برحق سے کہتا ہے۔

بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

انسان کی تخلیقی صلاحیت بے کنار ہے۔ جتنا اس کو استعمال کیا جائے اتنا ہی نئے نئے امکانات نظر آتے جاتے ہیں۔ چنانچہ عمل کا شوق اور اس کی لگن انسانیت کا جوہر بھی ہے اور طاقتِ خداداد بھی۔ یہی اس کو آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اس شوق کو اور اس عمل کو بروئے کار لانے سے انسان میں احساسِ خودی بھی بڑھتا ہے۔ کیوں کہ اپنی کوشش اپنی کامیابی اور اپنے کام کے نتائج سے اپنی ذات کے وجود کی خبر ہوتی ہے یہ خبر احساس بنتی ہے۔ اور پھر یہ احساس خودی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے یہ احساس اقبال رح کے نزدیک زندگی کا راز ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

چوں خبر دارم ز سازِ زندگی
با تو گویم چیست رازِ زندگی
غوطہ در خود صورتِ گوہر زدن
پس ز خلوت گاہِ خود سر برزدن

عمل اور ایجاد کا شوق اور اس شوق کی راہ میں جو تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں وہی سوز و ساز زندگی ہیں۔ وہ غم نہیں بلکہ مضراب زندگی ہیں۔ ان تکالیف سے انسان کی خودی کا گوشہ گوشہ اس طرح گونج اٹھتا ہے۔ جیسے گھنٹے پر چوٹ لگانے سے اس کا ذرہ ذرہ بولنے لگتا ہے۔ اس لئے جتنا شوق بڑھتا ہے اتنی ہی خودی مستحکم ہوتی ہے اور اتنا ہی جوشش عمل زیادہ ہوتا ہے۔ بقول اقبال ؒ

از محبت اشتعال جوہرش
ارتقائے ممکنات مضمرش

جب امکانات کی حد نہیں تو کسی حد پر رکنا فطرتِ انسانی اور جوہر خودی کے خلاف ہے۔ اس واسطے اقبال ؒ کہتا ہے۔

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلےٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کوششِ ناتمام زندگی کے وجود کو قائم رکھنے کا راز ہے انسان کا کام نئے نئے مقاصد کی تخلیق کرنا اور اپنی حالت سے غیر مطمئن ہو کر ترقی کی آرزو کرنا ہے۔ اس آرزو کے لئے تگ و تاز کرنا اور پھر نئی آرزوئیں پیدا کرنا ہے بقولِ غالب ۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

فطرت کی بے تابی کو پورا کرنے اور قائم رکھنے کے لئے ایک مقصد اعلیٰ کا تعین ضروری ہے۔ تاکہ اس کے ماتحت ہر قدم کا ایک رخ ہو۔ کیوں کہ بغیر مقصد کے تخلیق سے محض اضطراب اور انتشار ہی میسر آسکتا ہے۔ انتخاب مقصد کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے انسان کو بنانے کے بعد ایک مقصد تو یہ فرما کر متعین کر دیا تھا کہ ول دنیا آدم الاسماء کلھا جس کی تفسیر اقبالؒ نے یہ کی ہے کہ اشیاء کا علم حاصل کرنا انسان کا فرض ہے خدا نے یہ بھی فرمایا کہ جہ (ترجمہ) زمین میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ اور یہ بھی کہ (ترجمہ) ہم نے تمہارے لئے جو کچھ زمینوں اور آسمانوں میں ہے۔ اس کو قابو میں کر دیا ہے۔ اور یہ بھی کہ (ترجمہ) ۔ انسان کو سوائے اس کوشش کے پھل کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ ان سب کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کے لئے علوم و فنون کا حاصل کرنا بلکہ فطرت کی تسخیر کے لئے کوشاں رہنا ایک طرف تو اس کی اپنی صفت تخلیق ہی سے ہے اور دوسری طرف اس کی خودی کی راہ ہائے دلفریب اور حیات کامل کے حصول کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ علوم و فنون کی تحصیل اور تسخیر فطرت اسلامی روحانی تربیت کا ذریعہ ہے۔ اس طرح سے دنیا کی زندگی اور روحانی ترقی میں ٹکراؤ باقی نہیں رہتا۔ یہی فطرت بھی ہے اور نور یعہ دسر ور ۔ سلیں بھی۔ اسلام نے ان اصولوں کے ذریعے نہ دین و دنیا کی تقسیم باقی رکھی ہے۔ اور نہ مادے اور روح کے جھگڑے

کو باقی چھوڑا ہے۔

یہ کتنی بڑی امانت انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے ؟ کیا تعجب ہے۔ کہ بقول حافظ شیرازی۔ ع

"آسمان بارِ امانت نتوانست کشید"

آسمان و زمین میں یہ صلاحیت کہاں تھی کہ وہ ارادتاً تخلیق میں خدا کا ساتھ دیتے۔ ان میں تو اس چیز کا شعور ہی نہ تھا فرشتے ایک کل کے پتلے ہیں۔ وہ کوشش اور تسخیر سے ارتقاء حاصل کرنے کے کہاں قابل ہیں ؟ پھر ان کا امتحان کہاں ہے کہ برائی کا مقابلہ کر کے بھلائی کو حاصل کریں ؟ شیطان نے سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اور راندہ درگاہ ہوا لیکن دنیا میں انسان کی روحانی تربیت کا ذریعہ بنا ورنہ انسان بھی ایک لوٹا ہوا سمجھ ہی جانتا اس کی روحانی استطاعتیں اور صلاحیتیں کیونکر اجاگر ہو تیں ؟ اب تو کائنات انسان کے لئے ایک میدانِ عمل ہے جس میں اس کو اپنی بے حساب صلاحیتوں کو فروغ دینے کا موقع ہے۔ انسان کی مخالف قوتوں سے جنگ بیک وقت دنیاوی بھی ہے اور روحانی بھی۔ اگر انسان کو اپنے مقاصد پر پورا یقین ہو اور اس کا دل نورِ ایمان سے منور ہو۔ تو اس سے بڑھ کر کوئی اور ذریعہ اس کی قلبی اور جسمانی طاقت کے حاصل کرنے کا تصور میں نہیں آتا۔

علامہ اقبالؒ کا ہم پر اور سارے مسلمانانِ عالم پر احسان ہے کہ اس نے ایک نرالا اندازِ نظر پیدا کیا۔ عشقِ ازلی کو فطرت کا راز ہونا سمجھایا۔ ایک نئے اور دلنواز انداز میں دین و دنیا کے سنگم

کو نمایاں کیا۔ فرد اور جماعت کا روحانی ارتباط بتایا۔ ذوق و شوق کے ساتھ راہِ عمل اختیار کرنے کو حیات کا کرشمہ ظاہر کیا۔ دُنیا کی تکلیفوں کو خودی کے استحکام اور تسخیرِ فطرت کے مقصد کا لازمہ قرار دیا۔ یہ سب اصول اور خیالات اس کے علم، شعور اور یقین کامل سے اس پر آشکار ہوئے۔ وہ خود علم الیقین اور عین الیقین سے آگے بڑھ کر حق الیقین کے درجہ پر پہنچ چکا تھا اور اس کا دل اس کو گواہی دیتا تھا کہ اسلام ہی ہر تکلیف، ہر درد، ہر نفاق اور ہر تضاد کا حل بھی ہے اور ہر کامیابی کا ذریعہ بھی۔ چنانچہ اس نے کہا ہے۔ کہ ؎

ولایت بادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیریں

ان سب کارناموں کے ساتھ اس نے تشکیلِ الٰہیات اسلامی کا ایک جدید ڈھنگ، بطور نمونے کے بھی پیش کر دیا ہے جو بجائے خود ذوقِ تخلیق کی ایک گراں قدر مثال ہے۔

▲▲

پروفیسر کفیل احمد خانزادہ

اِقبالؒ اور نُسخہِ کیمیا

شاعر مشرق حکیم الامت علامہ اقبالؒ بیسویں صدی کی وہ تاریخ ساز ہستی ہیں جنہوں نے اپنی قوم کو پستی و بے مائیگی سے نکال کر شاہراہ ترقی پر لانے کے لیے اپنی شاعری کو ذریعہ بنایا۔

اقبال کے خمیر میں شاعری کے جوہر زمانہ طالب علمی ہی سے چمکنے لگے تھے۔ تاہم اس وقت عام روش کے مطابق انہوں نے غزل سے محفل شعر آراستہ کرنا شروع کی۔ مگر ان کی اٹھان کسی اور ہی راستے کی متقاضی تھی۔ لہٰذا کالج ہی کی زندگی میں اصلاح اور دردمندی کا احساس انہیں کشاں کشاں قومی جذبات کی ترجمانی کی راہ پر لے آیا۔ اس ابتدائی دور میں وہ مغربی خیالات سے متاثر تھے۔ ان کا متاثر ہونا ایک فطری امر تھا۔ اس لیے کہ جس دور میں شاعر مشرق نے آنکھیں کھولیں وہ دور مغربی استبداد کا تھا۔ اس وقت ان کی فکر نے کوئی معین راہ اختیار نہیں کی تھی، وہ بھی دوسرے رہنماؤں کی طرح برِ صغیر میں بسنے والوں کو ایک قوم خیال کرتے تھے۔ اور بیک وقت دونوں قوموں کی فلاح و بہبود اور متحدہ

ہندوستان کے خواہاں تھے

وہ اپنی قوم کے درد میں تو شریک تھے۔ لیکن اصلاح و احوال کے لیے کوئی لائحہ عمل ان کے پاس نہ تھا۔ اس وقت اقبالؒ محض وطن پرست شاعر تھے۔ وطن کی محبت کا جادو ان کے رگ و پے میں جاری و ساری تھا۔ بقولِ جگر

کس کو معلوم کہ ہم حُسن شناسانِ ازل
کتنے اوہام سے گزرے تو یقین تک پہنچے

اقبالؒ نے مسلمانوں کو ہمیشہ اتحاد کے باہمی رشتہ کو استوار کرنے تلقین کی اور فرقہ بندی کی ہمیشہ مخالفت کی ان کی سب سے بڑی آرزو تھی کہ مسلمان ایک اکائی ہو جائیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

جس دور میں شاعر مشرق نے عالم اسلام کے ایک ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس دور میں برطانوی استعمار نے مسلمانوں کی اکثریت کے ممالک کو غلام بنا رکھا تھا۔ اسی طرح اسپین، فرانس، اٹلی، جرمنی وغیرہ کے مفتوحہ علاقوں میں بعض اسلامی ممالک شامل تھے۔ جنگ عظیم دوئم میں ترکوں کو شکست ہوئی۔ روس نے مسلمانوں سے کئی صوبے چھین لیے اور سلطنت عثمانیہ کو نیست و نابود کر دیا بلکہ عرب علاقے اس سے چھین لیے۔ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے روس سے ہو گئے کہ مسلمان شاید ہی اٹھ سکیں۔ لیکن

شاعرِ مشرق نے اس موقعے پر بھی مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

برصغیر میں مغربی اقتدار نے مغربی تہذیب و تمدن کا ایسا بیج بویا۔ کہ مسلمان سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ مغرب کے ذہنی و اخلاقی غلامی کے شکار ہو کر رہ گئے۔

اقبال رح کے نزدیک، برصغیر کا مسلمان اس عذاب کا شکار اس وقت ہوا جب مغربی اقتدار نے تقویت حاصل کی اور ان کے نزدیک یہی اقتدار تہذیب و تمدن کی پیدائش کا سبب تھا۔ اہل مغرب کی حکمت عملی سے ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ بکھرنے ہی والا تھا کہ بے ساختہ پکار اٹھے

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیتِ اِنَّ الملوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اِک جادوگری

یورپ کے زمانۂ قیام میں اقبال رح نے مغربی علوم کا عمیق مطالعہ و مشاہدہ نے ان کی نگاہوں سے مغربی فلسفہ پر مبنی وطن پرستی کا پردہ اتار دیا گیا انہیں معلوم ہو گیا کہ پوری قوم اسی نظریۂ تصورِ وطنیت کے فریب میں گرفتار ہو کر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہی ہے یہ دیکھ کر اقبال کے افکار و خیالات میں شدید تغیر

صرف اسلام بلکہ پوری دنیا نے اسلام کی فلاح اسلام کے

لگے اور نظریہ حیات پرور اور آفاقی نظام میں نظر آنے لگی لہٰذا انہوں نے وطنی قربت اور قوم پرستی پر کاری ضرب لگائی اور مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔

آہ! اے مردِ مسلمان تجھے کیا یاد نہیں
حرف لاتدع مع اللہ الٰہً آخر

مغربی قومیت اور قوم پرستی کے تصور کو اسلامی اصولوں کے منافی قرار دیتے ہوئے کہا۔

"میں نے مغربی وطنیت کی مخالفت کی۔ اس لئے نہیں کہ اسے اگر ہندوستان میں نشو و نما پانے کا موقع میسّر آئے تو مسلمانوں کو مادّی فوائد حاصل ہوں گے، بلکہ میری مخالفت صرف اس لئے ہے کہ میں ان میں ملحدانہ مادیت پرستی کے بیج دیکھتا ہوں جو میرے نزدیک انسانیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ حبّ الوطنی ایک طبعی وصف ہے انسان کی اخلاقی زندگی میں اس کا مکمل ملحوظ ہے۔ لیکن اصل اہمیت اس کے ایمان، تہذیب اور روایات کو حاصل ہے میری نگاہوں میں یہی اقدار اس قابل ہیں کہ ہمیشہ زندہ رہیں۔"

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ نہ سکی عفیف

اقبال کا خیال ہے کہ وطنیت کے طلسم کے دام میں اگر کوئی ایک بار آگیا تو اس کا نکلنا محال ہے۔ اور اس طرح اسلام کا آفاقی تصور آہستہ آہستہ گم ہو جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

انہوں نے اس ضمن میں ایسے اشعار بھی کہے جن سے قومیت اور وطنیت کے بجائے مذہب و ملت کی خوشبو آتی ہے ؎

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری
قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں
دین ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلمان کا خسارہ

اقبالؒ نے ملتِ اسلامیان ہند کے دلوں میں اسلام کا حقیقی تصور اجاگر کر کے مسلمانوں کی خودی کو بیدار کرنے کی سعی کی اور انہیں ذہنی غلامی سے نجات دلائی۔ اقبالؒ مردِ مومن کی صفات کے گرویدہ تھے۔ ان صفات کی اثر انگیزی سے وہ فرد کی زندگی کی تعمیر و تہذیب کرنا چاہتے تھے کہ فرد کی خوبی سے حیاتِ اجتماعی میں خوبیاں پیدا ہوں، ذرا مردِ مومن کی شان ملاحظہ ہو

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں۔ کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امین بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اقبال کی شاعری میں یقین کا سوز اور شخصیت کا گداز شامل ہے جس کے ذریعے انھوں نے ملّتِ اسلامیہ ہند کے کردار میں خود اعتمادی پیدا کرکے عظمت کی نئی راہیں تلاش کیں۔ اور روحِ عمل کو نئی پہنائیاں بخشیں ؎

یقین پیدا کر اے غافل یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

اقبال رح کے کلام میں رازی کا پیچ و تاب اور رومی کا سوز و گداز اور جمال الدین افغانی رح کی فکر و نظر سب کچھ گھل مل گئے تھے ؎

باز برخوانم زفیضِ پیرِ روم — دفترِ سربستۂ اسرارِ علوم
پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد — از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

اقبال رح انسانیت کی رہنمائی کے لئے قرآن کریم کو نسخۂ کیمیا

قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی فکری اساس در اصل قرآن حکیم کو بنایا ہے اور وہیں سے بندہ مومن کو خودی اور فقر کا خیال ملتا ہے۔ عظمت قرآن کا احساس ان کے انگ انگ میں سرایت کئے ہوتے ہے وہ قرآن کی جلالتِ قدر اور رفعت شان کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

آں کتابِ زندہ قرآن حکیم — حکمت او لایزال است و قدیم
از یک آئینی مسلمان زندہ است — پیکرِ ملّت ز قرآں زندہ است
نسخۂ اسرار تکوین حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرف او را ریب نے تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوع انساں را پیام آخریں — حاملِ او رحمۃ للعٰلمین

اقبال عشق الٰہی اور حبِ رسول صلعم میں سرشار رہے ان کا فلسفہ خود اسی سرشاری، اسی جذبہ و اثر اور اسی وابستگی و عقیدت سے بھرا تھا اقبال نے عشق و عقل اور خودی کو نئے معنی عطا کر کے دین مصطفوی کو دنیائے جدید کے بلند ترین معیار پر عکس ثابت کیا۔ انہوں نے اسلام کی آفاقیت کو اختیار کر کے شاعری کا مفہوم بدل دیا

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست
زیر گردوں سرّ تمکین تو چیست
غنچہ از شاخسار مصطفےٰ
گل شو از بادِ بہار مصطفےٰ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت

بہرہ از خُلقِ او باید گرفت
فطرتِ مسلم سراپا شفقت است
در جہاں دست و زبانش رحمت است

شاعرِ مشرق جنگ طرابلس سے بے حد متاثر ہوئے اور اس پر دو نظمیں لکھیں، پہلی نظم "خونِ شہید" نامی تھی۔ جو انہوں نے بادشاہی مسجد لاہور کے ایک جلسہ میں پڑھی۔ اس میں رسالتمآب صلعم کے حضور طرابلس کے شہیدوں کو خون کی پیش کش کی گئی تھی۔

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
فرشتے بزمِ رسالتؐ میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیۂ رحمتؐ میں لے گئے مجھ کو
کہا حضورؐ نے اے عندلیبِ باغِ حجاز
کلی کلی ہے تیری گرمیِ نوا سے گداز
اڑا جو پستیِ دنیا سے تو سوئے گردوں
سکھائی تجھکو ملائک نے رفعتِ پرواز
نکل کے باغ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنّت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اِس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

دوسری نظم فاطمہ بنت عبداللہ کے متعلق تھی۔ چودہ سال کی یہ لڑکی طرابلس کے غازیوں کو پانی پلاتے شہید ہو گئی تھی۔ اس معصوم شہید کا تعلق سرزمین لیبیا سے تھا اور وہ طرابلس کی رہنے والی تھی۔ یہ دل ہلا دینے والی خبر جب برصغیر پہنچی تو اسلامی حلقوں میں کہرام مچ گیا اور اس بہادر لڑکی کا ہر گھر میں چرچا ہونے لگا۔ حکیم الامّت علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا:

فاطمہ! تو آبروئے اُمّتِ مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
کس قدر عزّت تجھے اے حورِ صحرائی ملی
غازیانِ مِلّتِ بیضا کی سقّائی ملی

فلسطین اور شام پر ترکوں کی حکومت تھی، عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی مگر آزادی کے بجائے مغرب کی غلامی کا شکار ہو گئے۔ اس پر علامہ اقبالؒ کہتے ہیں

جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل

تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدہ دشوار
ترکانِ جفا پیشہ کے پنجہ سے نکل کر
بے چارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو وفات پائی۔ اس سانحہ پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے قائد اعظم نے کہا۔

" علامہ اقبالؒ کی موت مسلمانانِ ہند کے لئے ناقابلِ تلافی صدمہ ہے۔ وہ میرے احباب میں سے تھے ان کا شمار دُنیا کے بہترین شعراء میں ہوتا ہے۔ اقبالؒ اسلام کا نقیب ہے۔ وہ اس وقت تک زندہ رہے گا۔ جب تک اسلام زندہ ہے۔ ان کی شاعری مسلمانوں کی حقیقی امنگوں کی ترجمان ہے۔ ہم اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں ان سے وجدان حاصل کرتی رہیں گی۔"

محمود رضوی

اقبالؒ کی اِجتہادی کاوشیں

آدم اور تکوینِ عالم کے بعد مشیتِ ایزدی نے ایسے عناصر کی تخلیق کی جس سے ایک ایسی مظہرِ فطرت اور ما فوق الادراک تخلیق وجود میں آئی کہ فطرت خود سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ اس سے پہلے محض قوتِ خمیر کے مظاہر اعترافِ ربوبیت ہمہ وقت کرتے رہتے تھے۔ اور جب انہیں عظمتِ آدم کے سامنے سرنگوں ہونے کے لئے کہا گیا تو وہ بے چون وچرا سجدہ ریز ہو گئے۔ مگر ایک قوت نے جس میں بغاوت کے عناصر غالب تھے صاف صاف انکار کر دیا ایسی سرکشی اور انکار سے قوتِ شر نمودار ہوئی ان دو قوتوں کے مابین خلقت وظہور کے لئے کُن کی صدا بلند ہوئی وہ معمورۂ ارض کے لئے ہنگاموں کی نوید لائی۔ اب چار محسوسات ایک کالبد کے اندر کارفرما تھے۔ ملک و بشر، خیر و شر اس اجتماعِ ضدین کے لئے اعتدالِ حقیقی کی ضرورت تھی۔ وگرنہ فسادِ عالم لازم ہوتا۔ چونکہ ان چاروں کیفیتوں کے پیچھے حکیم مطلق کا امر موجود تھا۔ اس لئے ان کے اختیارات جبر کے تحت تھے یہی وجہ تھی کہ دنیا میں جب بھی فراعین مصر اور شدّادانِ وقت نے اپنی طاغوتی قوتوں سے

تہذیب انسانیت کا مزاج بگاڑنا چاہا۔ تو اس کے ساتھ ساتھ پروردگارِ عالم نے ایک مرسل طبیب کو بھیج کر ان کے مزاج کے فساد کا ازالہ کر دیا۔ اور انہیں مرسلین کے ذریعے سے قانونِ فطرت کی ایسی کتابیں امتوں کے لیے بھیجیں کہ جن سے وہ ہر مرحلہ پر نور و ہدایت کی راہیں تلاش کر سکتیں۔ تاآں کہ بشریت کے معراجِ کمال کا وہ عہد آگیا کہ جس کے لئے اب تک انسانی اذہان و ادراک کی قوتوں کو بیدار و بالغ کیا جا رہا ہے۔ معاً وسطِ عالم کی بستی میں جسے مکّہ کہا جاتا ہے۔ قریش کے ذی حشم قبیلے میں عبداللہ کی صلب سے ایک آفتابِ عالم تاب طلوع ہوا۔ اور تیئس سال کے اندر اندر تہذیب و تمدّن کا ارتقار اور استیلاءِ نفس کی جملہ منزلیں انسانوں نے ان کی اقتداء میں طے کر لیں۔ قرآنِ حکیم کی بلا نمتوں نے انسانی کردار کی وہ عظمتیں اُجاگر کیں کہ اب اسے اپنے خلیفہ ارض ہونے پر ایک گونہ فخر و انبساط محسوس ہونے لگا۔ شمعِ اسلام نے انسان کے حجابِ اکبر میں وہ ضیاکاریاں کیں جن کو احاطہ تحریر میں لانا ناممکن ہے۔ سب سے پہلے عرفانِ ذات اور خود شناسی سے اور مدد سے آدم کو فوراً نوازا گیا۔ جس کے لئے پہلی حجتِ قاطع معراجِ نبویؐ تھا۔ جس نے ثابت کر دیا کہ بشر کی مادرائیت کی زد میں زمین تو کیا آسمان کی بلندیاں بھی پاؤں چومنے کے لئے بے قرار نظر آتی ہیں اور حدودِ فطرت کے فاصلے سمٹ کر قابَ قوسین تک محدود ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے مطلعِ انوار سے جو پہلی کرن اولادِ آدم پر پڑی، وہ تھی خود شناسی یا خود آگہی کا کشف۔ یہی بحث تھا کہ وہ دختر کشانِ عرب اور رہزنانِ سفاک کے جاہل بلکہ

ابوجہل عرب، حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی چند دنوں کی تعلیم و تربیت اور فیض نظر سے اقوامِ عالم کے لئے مینارِ نور اور مشعلِ ہدایت بن گئے یہ تھی قلبِ ماہیت اس نظریہ حیات کی۔ کہ جس سے ان لوگوں نے مقام خودی پہچان لیا تھا۔ تاریخ عالم کے اوراق پلٹ کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دُنیا بھر کی تہذیبیں خود شناسان اسلام کے پاؤں چومتی نظر آتی ہیں اقبالؒ کی نظر میں خودی و خوشناسی کا مقام دیکھئے ؎

اعتبارِ کوہ بخشد کاہ را   قوّتِ شیراں دہد روباہ را

خاک را اوجِ ثریّا می دہد   قطرہ را پہنائے دریا می دہد

خامشی را شورشِ محشر کند   پائے کبک از خونِ باز احمر کند

مسلمان جب تک ہادیٔ دو عالمؐ کے ارشادات کی روشنی میں قرآنِ حکیم سے اپنی خود شناسی و خودنگری کے مسائل تلاش کرتے رہے۔ اس وقت تک، دُنیا کی کوئی قوم انہیں شکست نہ دے سکی اور وہ عروج و کمال کے تمام کٹھن مراحل طے کرتے چلے گئے۔ مگر جب ان کی خودشناسی نے تاویلوں کا سہارا ڈھونڈ لیا۔ اور آنا و لاغیری کو خودشناسی کے معانی پہنا دیئے۔ تو یہی قوم ہلاکو اور چنگیز کی غارت گری کا شکار ہو گئی تا ورجس علم الکلام نے ان پر تاویلوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ انہیں ہلاک ہونے سے نہ بچا سکے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

تو خودی از بے خودی نشناختی
خویش را اندر گماں انداختی

خویش دار و خویش باز و خویش ساز
نازہا می پرور د اندر نیاز

اِس حقیقت سے انکار کی قطعی گنجائش نہیں کہ قرآن حکیم کی تعلیم اور اسلام کی اقدار کو جس چیز نے مجروح کرنے کی کوشش کی وہ نفی متکلّمین یونان کی مایوسیوں میں گھری ہوئی زندگی کے افکار یونانی فلسفہ میں دُنیا اور اس کے ہنگاموں سے فرار، قنوطیت اور مابعد الموت غیر یقینی کے اندھیرے کارفرما تھے۔ مسلمان مفکّرین نے جب اِس فلسفہ کو اسلامی شکل دے کر اپنی اجتہادی موشگافیوں سے اسے بڑھا چڑھا کر اپنی ضخیم تصانیف پیش کیں۔ تو تھوڑی ہی مدت میں متشکّکین اور ملاحدہ کا ایک گروہ پیدا ہو گیا۔ اور ان کے پیدا کرنے میں اشعریہ اور معتزلہ اشتراقین کے قیل و قال اور بحث و جدال کا ایک بہت بڑا حصّہ ہے اور یہ بدعت سیّدہ معلّم ثانی ابو نصر فارابی کے توسط سے اسلامی تعلیمات میں شامل ہوئی آگے چل کر اس کے نتائج مُہلک اور دُور رس تھے۔

یہ نوان دیار و امصار کی کیفیت تھی جہاں اسلام کا اثر و نفوذ بہت ہی جلد ہو گیا تھا جو لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے وہ اپنے موروثی عقائد کو بھی اسلامی لبادہ پہنا کر اپنے سینوں سے لگائے رہے۔ یہ تھی وہ عجمی سازش کہ جس نے اسلام کی حقیقی روح کو بری طرح متأثر کیا اور عصبیت کا وہ قلعہ جو اقوامِ عالم اور مذاہب کی حفاظت کے دفاع کے لئے ناگزیر ہوتا ہے متاثر ہو گیا اور ایسا ہی وہ قلعہ تھا جو اسلام نے بھی تعمیر کیا تھا۔ مگر مختلف عقائد کی آمیزش

نے کچھ دیر کے لئے اس کے در و دیوار میں دراڑیں ڈال دیں۔ جس کے نتیجے میں وہ ہولناک واقعات اُبھرے کہ جن کو بیان کرنا از بس مُشکل ہے۔ ہندوستان میں اسلام مسلمان فاتحین کے توسط سے پہنچا مفتوحہ اقوام ہمیشہ فاتح قوم کے اثرات و عقائد قبول کر لیتی ہیں۔ پھر اسلام کی تعلیمات وہ حقیقت مبینہ تھی کہ جس کو تسلیم کرنے کے لئے ذہن ہر وقت آمادہ تھے۔ بیشتر مسلمان حکمران اسلام کے سچے مبلغ بھی تھے اور کردار و صفات کے لحاظ سے خالصتہً اسلامی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ لیکن اکبرِ اعظم کے دینِ الٰہی نے پھر اسلام کے سنگھاسن کو ہلا دیا۔ شہنشاہ اکبر قطعی طور پر ناخواندہ تھا۔ مگر قدرت نے اسے فراستِ خسروانہ سے بے حد نوازا تھا۔ اس دینِ الٰہی کے پیچھے مُلّا مبارک کے دونوں بیٹوں ابوالفضل اور فیضی کی بے پناہ ذہانتیں اور فطانتیں کام کر رہی تھیں۔ در اصل یہ لوگ فلسفہ زدہ اور الحاد و تشکیک کا بُری طرح شکار تھے یہ چیز بھی اسلامی مفاد کے لئے ضعف کا باعث بنی تا آں کہ حضرتِ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کا دور آیا۔ وہ طبعاً سچے مسلمان اور سنتِ رسولؐ پر سختی سے کاربند تھے۔ لیکن اکبر اعظم نے جن ذہنوں میں آزادہ روی پیدا کر دی تھی اس کا یہی نتیجہ تھا کہ عوام انہیں متعصب اور تنگ دل مسلمان خیال کرنے لگے۔ انگریز کی تقلید و نقالی مسلمانوں کے لئے سرمایۂ افتخار بن گئی۔ اور اپنی موروثی تابندہ روایتوں سے وہ متنفر اور بیزار ہو گئے تھے یہ تھے وہ حالات کہ جن میں علامہ اقبالؒ شہودِ عالم پر تشریف فرما ہوئے۔

قدرت نے ان کو ایک خاص مشن دے کر دُنیا میں بھیجا۔ ان کی اجتہادی فکرِ اسلام اور بانیٔ اسلامؐ سے بے پناہ شیفتگی طبعاً سلیم الفطرت۔ خُدا نے ان کی ذات میں جملہ صفات کو سجادیا تھا۔ ان کی عمیق نظروں نے مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب تلاش کر لئے۔ علامہ مرحوم کی جہاں قرآن اور اسلام پر نہایت گہری نظر تھی۔ وہاں ان علوم اور متکلمین کے عقائد کو بھی بہ نظرِ غائر دیکھ رہے تھے جو زوالِ امّتِ محمدیہؐ کا باعث بن گئے تھے۔ مغربی فلسفہ کی ہر اُس شق سے جو روحِ اسلام کے منافی تھی۔ وہ برسرِ پیکار تھے۔ آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کے اجتہاد کے اندر خودی کی روح کو بیدار کیا جائے تاکہ عرفانِ نفس کی روشنی میں وہ ذلّت و رسوائی کے ناسُور دیکھ لے اور ان کا چارہ ہو سکے۔ انگریز سامراجیت، استحصال اور سرمایہ پرستی کی خوفناک ذہنیت اور عزائم کا وہ مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے میدانِ قرطاس میں آ گئے۔ ان کی فکری کاوشوں اور ادراک کی غیر معمولی صلاحیتوں نے شعر کے قالب میں ڈھل کر مسلمانوں کے خفتہ ذہنوں کو جگا دیا۔ ۱۹۲۴ء میں ترکی نے خود ہی خلافتِ عثمانیہ کو ختم کر دیا۔ اس سے مسلمانانِ ہند کو سخت قسم کا دھچکا لگا اور وہ اپنے آپ کو یاس و بے بسوں کے اندھیروں میں ڈوبتا ہُوا محسوس کرنے لگے۔ علامہ مرحوم اس کو خوب سمجھتے تھے۔ یہ ہے مختصر قصّہ علامہ مرحوم کی کاوشوں کا۔ خود شناسی اور فلسفہ خودی کی ضرورت کو امّتِ مُسلمہ کے لیے پُر شگاف اور مؤثر الفاظ میں پیش فرما کر "ضربِ کلیم" میں بعنوانِ مرگ خود ہی فرماتے ہیں۔۔۔

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہُوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
خودی کی موت سے پیرِ حرم ہُوا مجبور۔
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام۔

مسلمانوں کی بے بسی اور بے چارگی کو کس انداز میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے عنوان ہے "ہندی مسلمان" اس کے دو شعر ہیں ۔ ؎

غدّارِ وطن اِس کو بتلاتے ہیں برہمن
انگریز سمجھتا ہے مسلمان کو گداگر
پنجاب کے اربابِ نبوّت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر

بلاشبہ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی دلآویز شخصیت مسلمانانِ عالم کے لیے عموماً اور مسلمانانِ پاکستان کے لئے ایک مینارِ نور کی حیثیت رکھتی ہے اور آنے والی نسلیں ان کے فرمودات کی روشنی میں ہمیشہ زندگی کی منزلیں تلاش کرتی رہیں گی۔

▲▲

شاهد انیس خان

اقبال اور عشقِ حُسین رضؓ

تاریخِ اسلام میں صبر و رضا، قربانی و ایثار کی سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن ان سب کا مجموعہ حضرتِ امام حسین رضی اللہ عنہ کی قربانی ہے جو انہوں نے گھر سے سینکڑوں میں دُور دیارِ غیر میں اپنی اور اپنے بہتر (۷۲) جاں نثار ساتھیوں کو شہید کروا کے دی ہے۔ آپ کے ساتھیوں پر کون سا ظُلم ایسا تھا جو نہ ہوا لیکن پائے استقامت میں لغزش نہ آنے پائی۔

لیکن یہاں ہمیں مفکرِ اسلام اور شاعرِ مشرق حضرتِ علامہ اقبالؒ کے اس قربانی کے بارے میں خیالات کا مطالعہ کرنا ہے۔ علامہ کی زندگی کا مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچنے میں مدد دیتا ہے کہ ہم دنیاوی علوم کے ساتھ ساتھ دینی علم سے بھی اپنے آپ کو سیراب کریں۔ علامہ کے دور میں مادیت کا مکمل آغاز ہو چکا تھا۔ انہوں نے فرنگی تہذیب و تمدن کو یورپ میں بغور دیکھا۔ انہی کے دور میں اشتراکیت نے سر اٹھایا۔ لیکن علامہؒ کی ذات پر دونوں میں سے کوئی بھی اثر نہ کر سکا۔ آپ خود کہتے ہیں ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اقبالؒ نے مختلف تہذیبوں کا گہرا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام ہی زندگی

گزارنے کا بہترین ضابطۂ حیات ہے۔ اور قرآن ہی وہ مجموعۂ علوم ہے جس میں دُنیا و مافیہا کے تمام اسباق پوشیدہ ہیں۔

علامہؒ موصوف کے نزدیک اِسلام اور قرآن کی عملی تفسیر رسولِ خدا صلی علیہ و آلہ وسلم، صحابۂ کبار اور اہلِ بیت اطہار ہیں۔ صحابہؓ کرام اور اہل بیت اطہار کا ذکر اس وقت تک اپنی تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ جب تک نواسۂ رسولؐ جگر گوشۂ فاطمۃ الزہرؓ کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہاں میری مراد حضرتِ حسینؓ سے ہے جنہیں رسول اللہ صلعم نے اپنی حیات طیبہ میں جوانانِ جنّت کا سردار پکارا۔ انہیں کے متعلق حضرت علامہؒ یوں رقم طراز ہیں۔ کہ ؎

آں امامِ عاشقاں پورِ بتولؓ
سروِ آزادے ز بستانِ رسولؐ

یعنی حضرتِ حسینؓ عاشقانِ حقیقی کے امام حضرتِ فاطمہؓ خاتونِ جنّت کے صاحبزادے اور چمن رسول صلعم میں ایک بلند درخت ہیں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اقبال کو حضرتِ حسینؓ سے کتنی عقیدت ہے۔ ان کے سارے کلام میں حضرت حسینؓ سے خطاب ملتا ہے۔ حضرتِ حسین کی بڑائی اور عظمت اِس طرح بھی بیان کرتے ہیں

فقرِ عُریاں گرمیٔ بدر و حُنینؓ
فقرِ عُریاں بانگِ تکبیرِ حُسینؓ

جہاں حضرت اقبالؒ سید الشہداءؓ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ وہاں

انہوں نے حضرتِ حسینؓ کے متعلق مختلف روایتوں کو بھی اشعار کا لباس پہنایا ہے۔ مثال کے طور پر ایک روایت ہے کہ ایک دفعہ رسولِ خدا صلعم حضرتِ حسینؓ کو کاندھے پہ سوار کیے ہوئے تھے کہ ایک صحابیؓ نے عرض کی، کیا اچھی سواری ہے، تو رسول اللہ صلعم نے برجستہ جواب دیا کہ سوار بھی خوب ہے۔" علامہ اس روایت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ؎

بہرآں شہزادۂ خیرُ الملل دوشِ ختم المرسلین نعم الجمل

اِس روایت کو ان حدیثوں سے بھی صداقت کی سند ملتی ہے۔ "حُسین میرا ہے اور میں حُسین سے ہوں۔" اور یا پھر "خُدا اُس سے محبت کرتا ہے جو حسینؓ سے محبت کرتا ہے۔"

ان تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے بے مثال تصورِ موت، شہادت پیش کیا ہے اور شہیدوں کا خون کبھی رائگاں نہیں جاتا۔ خداوند قدوس اپنی کتاب عظیم میں خطاب فرماتے ہیں کہ "شہید کو مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے" علامہ اقبال نے اِسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ؎

زندہ حق از قوتِ شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

اور تاریخِ اسلام گواہ ہے کہ وقتی طور پر تو امام مظلوم جبر کی بے پناہ قوت کے مقابلہ میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے۔ لیکن آخر کار فتح انہیں کو ہوئی اور حق کا بول بالا ہوا۔

یہ کوئی غیر حقیقی بات نہیں، بلکہ اگر سانحہ کربلا کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ

بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت حسینؓ نے خاک و خون میں لوٹ کر توحید کے قیام کی سعی کی ہے۔ امام حسینؓ نے عظیم قربانی پیش کر کے دینِ اسلام کی روح کو زندہ کر دیا وہ اِس بات کے حقدار ہیں کہ آپ کو آپ کے نانا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کا دوسرا بانی قرار دیا جائے۔ بے شک آپ نے دین اور توحید کی جڑوں کو مضبوط کیا ہے اور اس کے مجدّد ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی مشہور تصنیف "شہادتِ حسین اور اسلام" میں ایک جگہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ "وہ ذات جو حضرتِ اسماعیلؑ کے روپ میں ظاہر ہوئی اور ترقی کرتے کرتے حضرت عیسےٰ علیہ السلام تک پہنچ کر گم ہو گئی اس کو حضرت حسینؓ نے اپنی سرفروشی سے مکمل کر دیا۔" علامہ اقبالؒ نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے۔ کہ ؎

غریب و سادہ رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اِس کی حسینؓ ابتدا ہے اسماعیلؑ

یعنی جس کام کو حضرتِ اسماعیلؑ نے شروع کیا تھا حضرتِ حسینؓ نے بے مثال قربانی سے اس کا انجام کیا اور وہ کام تھا حرم سے شروع ہونے والی تحریکِ اسلام کی حفاظت۔

کفر و اسلام میں تو ابتدائے دنیا و عالم ہی سے کشمکش جاری ہے اور دینِ اسلام کے لئے قربانیاں بھی جاری ہیں۔ تاریخ اسلام میں جہاں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام آگ میں کودتے نظر آتے ہیں وہاں حضرت عیسےٰؑ بھی مصلوب ہوتے ہوئے ملتے ہیں کہیں تپتی ریت پر حضرت بلالؓ گھسیٹے ملتے ہیں اور کہیں حضرت حبیبؓ صلیب پر

نیز سے کہانتے ہیں۔ انجام کار اسلام کی تاریخ کی سب سے بڑی قربانی نواسۂ رسول حضرت امام حسینؓ کو پیش کرنے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ جو معصوم بچوں سمیت بہتر جاں نثاروں کو حق و صداقت کا بول بالا کرنے کے لیے شہید کرواتے ہیں۔ اس مضمون کو علامہ اقبالؒ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ؎

موسیٰ و فرعون، شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید

یا

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اور پھر

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

علامہ اقبالؒ اس ذبحِ عظیم سے مندرجۂ ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں کہ قرآن ایک مجموعۂ علوم ہے۔ اور اسلام کو سمجھنے کے لئے قرآن کو سمجھنا نہایت ضروری ہے اور قرآن سمجھانے کے لئے حضرتِ حسینؓ نے عملی سبق دیا ہے

رمزِ قرآن از حسین آموختیم

دوسرے نمبر پر سانحہ کربلا سے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا مطلوب تھا اور یہ بتانا مقصود تھا کہ حق و صداقت کی سربلندی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑے تو کوئی حرج نہیں۔

علامہؒ کے نزدیک فقر کی دو اقسام ہیں ایک تو بہادر کو بزدل بنا دیتی ہے اور دوسری شاہانہ تمکنت عطا کرتی ہے۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا فقر دوسری قسم کا تھا۔ لہٰذا لکھتے ہیں ؎

اک فقر ہے شبّیری اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبّیری

علامہ نے ساری عمر عمل کا سبق دیا ہے۔ علامہ کی زندگی میں عالمِ اسلام گوناں گوں مشکلات سے دوچار تھا۔ ان حالات میں علامہ اپنے کلام میں جابجا عمل کا درس دیتے ہیں اور رسم شبیری کو ادا کرنے کی تلقین کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے نزدیک عمل ہی سب کچھ ہے، کہتے ہیں۔ ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبّیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

علامہ اُن لوگوں سے خطاب کرتے ہیں جو خانقاہوں میں تسبیحِ خداوندِ قدوس میں مصروف ہیں اس وقت کے حالات اور موجودہ حالات کا مطالعہ و موازنہ یہ سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ مسلمان آج بھی انتشار و افتراق کا شکار ہیں۔ تاریخِ اسلام میں سقوطِ بغداد کے بعد سب سے بڑی اسلامی مملکت کو اپنی اور غیروں کی اندرونِ خانہ سازشوں سے کاٹ کر رکھ دیا گیا اور باقی ماندہ کو بھی سازشوں کا سامنا ہے ان حالات میں اقبال کے اشعار آج بھی پیغام ہیں کہتے ہیں کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر

اور اِس مقصد کے لئے گفتار کے غازی نہیں بلکہ کردار و عمل کے مجاہدوں کی ضرورت ہے۔ علامہ اقبال رحؒ کی حضرتِ حسینؓ سے عقیدت پوشیدہ نہیں۔ بلکن ایک جگہ پر اپنی عقیدت کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں کہ اقبالؒ کو شہیدِ کربلاؓ سے اس طرح کی عقیدت اور پیار ہے جس طرح خداوندِ دو جہاں یتیموں سے پیار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یتیموں کی دعا سے عرشِ معلٰے کی کرسی بھی ہل جاتی ہے اور یہ پیار کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ حضرت اقبال رحمۃ اللہ کی زبان میں۔

جس طرح مجھ کو شہیدِ کربلا سے پیار ہے
حق تعالےٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک ہے ”حسینؓ مجھ سے ہیں۔ اور میں حسینؓ سے ہوں“ خداوندِ قدوس اُس سے محبت کرتے ہیں۔ جو حسینؓ سے محبت کرتا ہے۔ اقبالؒ بھی اس حدیث کا سہارا لیتے ہوئے اپنے پیار کا برملا اعلان کر کے گوہرِ مقصود پانا چاہتے ہیں اور بخشش کے طلب گار ہیں۔ فرماتے ہیں

روتے والا ہوں شہیدِ کربلا کے غم میں، میں
کیا دُرِ مقصد نہ دیں گے ساقیِ کوثر مجھے۔

بشیر حسین ناظم

علامہ اقبالؒ کی کُتب

تجربہ اور تاریخ کے اوراق کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ناشرین و کاتب حضرات، کا مصنفین کو بدنام کرنے میں بڑا حصہ ہے۔ کاتب حضرات چاہیں تو ولدیت کو ولدیت لکھ دیں۔ پرانے زمانے میں اکثر کاتب تمام علوم متداولہ سے آراستہ و پیراستہ ہوتے تھے اور ان میں سے قلیل تعداد پڑھ کم پڑھوں کی ہوتی تھی جو اکثر ایک نقطے کے ایزاد سے سلطنتوں میں جنگ کرا دیتے تھے۔ لکھنا "خوانین" (خان کی جمع) ہوتا تھا اور یہ اپنے تبحر علمی کا اظہار کرتے ہوئے "خواتین" (عورتیں) لکھ دیتے تھے۔ نظامی عروضی سمرقندی نے اس ضمن میں اپنی معروف کتاب "چہار مقالہ" میں ایک حکایت لکھی ہے۔

پرانے زمانے میں شعبہ "تراجم"، شعبہ "تحقیق و مراجع" اور شعبہ "تصانیف و تالیف" میں بہت پڑھے لکھے حضرات ہوتے تھے اور کتاب کو چھپنے سے پہلے نظر ثانی اور تصحیح اغلاط کے لئے کم از کم تین چار متبحر عالموں کی نظروں سے گزرنا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اگر ایک شخص کی نظر سے کوئی غلطی بچ جاتی تو دوسرا پکڑ لیتا اور دوسرے سے رہ جاتی تو تیسرا انشاءاللہ ہی کر دیتا۔ اس طرح کتاب جملہ اغلاط سے پاک و منزہ قارئین تک پہنچتی اور وہ اس کے مطالعہ سے لطف اندوز ہوتے اور اپنی روحانی و ادبی ضیافت کرتے۔ اتنا اہتمام کیوں کیا جاتا تھا؟ محض عزتِ نفس کی خاطر، لوگوں کے طعنوں

سے محفوظ رہنے کے لئے تنقیص و تکفیر سے بچنے کے لئے۔ لیکن وا حسرتا! آج دن ایسے آ گئے ہیں کہ ایسی باتوں کی کوئی پرواہی نہیں کرتا۔ آج تو بس پیسہ کماؤ" کے ماٹو ہی پر عمل ہو رہا ہے۔ کہاں کا اخلاق اور کہاں کی مروّت!

یا وش بخیر! علامہ اقبالؒ کی کتب کے ناشرین نے ہمارے ایک عظیم محسن اور ملی کرم فرما کو اپنے ادارے کی کوتاہیوں کے سبب بدنام کرنے کے بعد ہمارے ذہنی مُرشد حکیم الامت، ترجمانِ حقیقت، شاعرِ ملتِ اسلامیہ حضرتِ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی دستِ ستم بڑھایا ہے۔ یہ معلوم نہیں اُن کی نیت کیا ہے۔ لیکن انھوں نے علامہ اقبال کے معاندین، حاسدین اور دشمنوں کو ایسا مواد مہیا کر دیا ہے جس سے وہ آئندہ بیس تیس سال یا چالیس پچاس سال کے بعد حکیم الامت پر ایسی ایسی الزام تراشیاں اور اتہام طرازیاں کریں گے جن سے اُن کے عُشاق میں بے چینی و اضطراب پھیلے گا۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے ایک مخصوص گروپ نے علّامہ کے خلاف ان کی شاعری میں کیڑے نکالنے کی مہم چلائی تھی اور خود کو علّامہ کہلوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ مگر وہ الفاظ کی تذکیر اور تانیث کے چکّر سے باہر نہ نکل سکے۔ پھر اُن کے علّامہ کہلوانے کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہُوا اور فیّاضِ ازل نے علّامہ اقبال کے لئے ہی علّامہ کا شرف و مجد مخصوص کر دیا۔

وہ دَور تو ختم ہو گیا اب اس فرم نے یہ بیڑا اُٹھایا ہے کہ وہ اپنی شائع کردہ کتابوں کے حوالوں سے علّامہ کے خلاف یہ پراپیگنڈہ کرائیں کہ انھیں اوزان و بحُور سے واقفیت تھی نہ علمِ عروض سے۔ بس وہ تو بے تکے شعر کہا کرتے تھے۔

چند دن ہوئے میرے دوست جناب اقبال احمد فاروقی نے جو حضرتِ علامہ

اقبال کے شیدائیوں میں سے ہیں مجھے دو کتابیں "بانگِ درا" اور "بالِ جبریل" ارسال کیں۔ میں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور شکر کیا کہ حضرت علامہ کے کلام بلاغت نظام کے سستے ایڈیشن بھی عوام تک پہنچیں گے اور وہ اسے پڑھ کر اپنے ذوق کی تسکین کرنے کے بعد نظریاتی رہنمائی حاصل کریں گے۔ میں نے کتاب کو پڑھنا شروع کیا۔ ترتیب کے لحاظ سے کتاب کی ایڈیٹنگ کا کام کسی صاحب "رب نواز ملک" کے سپرد ہے اور مجلسِ مشاورت میں اے حمید، ایم ایس ناز، محمد حنیف اور ع ک خالد شامل ہیں۔

اِس ضمن میں ایک واقعہ یاد آگیا جو پیش کر کے آگے چلتا ہوں۔ ایک گاؤں میں ایک مولوی صاحب قبلہ نماز پڑھایا کرتے تھے۔ وہاں کے لوگ اتنے ستم ظریف تھے کہ وہ مولوی صاحب کے جائز مطالبات بھی تسلیم نہیں کرتے تھے یعنی دو وقت کی روٹی دینے سے بھی گریزاں تھے۔ نماز پڑھاتے ہوئے مولوی صاحب کو کئی ماہ گزر گئے لیکن گاؤں والوں کو ان کی حالت پر رحم نہ آیا۔ آخر ایک دن مولوی صاحب آگ بگولا ہو گئے غصے کے عالم میں اجابت کے لئے باہر گئے اور بغیر استنجے کے اور وضو کے صبح کی نماز پڑھا دی۔ کوئی صاحب مولوی صاحب کا تعاقب کر رہے تھے انھوں نے اس طرح نماز پڑھانے کی وجہ پوچھی تو مولوی صاحب نے فرمایا "میاں یہ مجھے کچھ نہیں نہیں دیتے میں ان کو کافر کر کے ماروں گا۔"

تو شاید ان شعروں کے ساتھ بھی جناب ناشر نے ایسا ہی سلوک کیا ہو۔ ویسے مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ ایک پبلشر صاحب نے مجھے ایک کتاب کے عوض صرف ایک روپیہ دیا تھا۔ یہ چند ضمنی باتیں تھیں۔ اب آیئے دیکھیئے علامہ کے اشعار کا کس

طرح حلیہ بگاڑا گیا ہے جنھیں پڑھ کر ذہن میں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر میں سطورِ بالا میں بیان کر چکا ہوں۔

(۱) غزل نمبر ۱۳۔ اصل مصرع:۔

اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی،

نقل مصرع:۔

اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ رسم شاہبازی

رہ اور رسم کی واؤ عاطفہ گم۔

(۲) حضرت اقبالؒ نے جب حضرت حکیم سنائیؒ کے ایک قصیدے کی پیروی میں نہایت پُر مغز اشعار کہے۔ ان اشعارِ عالیہ میں ایک مصرع یوں ہے ع

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی

مگر یار لوگوں نے حضرتِ اسرافیل سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے حضرتِ اسرائیل سے دوستی پیدا کر لی اور "اسرافیل" کے بجائے "اسرائیل" لکھ دیا۔

(۳) املا بدل دی۔ "قرطبہ میں لکھے گئے" کے زیرِ عنوان غزل کا دوسرا مصرع یوں ہے:۔

بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب

مبدّل املاء:

بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بر کاب

غزل نمبر ۳۲ کے مقطع کا مصرع اول یوں ہے!

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک

مگر نقلی مصرع یہ ہے

اُٹھائیں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک

غزل نمبر ۲۸ کی غزل کے مقطع کا دوسرا مصرع یوں ہے :۔

مقامِ شوق میں کھو یا گیا وہ فرزانہ !

مگر اسے یوں لکھوایا گیا ہے

مقامِ شوق میں کھو گیا وہ فرزانہ !

دیکھئے مصرع میں خواہ مخواہ "امامِ دینیت" پیدا کر دی گئی ہے۔

غزل ۳۳ کے ایک مصرع میں "مجذوبِ فرنگی" کا ذکر ہے جس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے "فلسفی نطشہ" لکھا ہے۔ لیکن اڑھائی روپے والی کتاب میں نقل بھی بمطابق اصل نہیں ہے۔ یار لوگوں نے صحیح املا و تلفظ کہیں سے ڈھونڈ نکالا اور بڑے اہتمام سے "نیٹشا" لکھوا دیا۔ غزل نمبر ۳۶ کے دوسرے شعر کا مصرعِ ثانی یوں ہے :۔

ابھی محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی

اِس ایڈیشن کے ایڈیٹرز نے اِسے یوں صحیح سمجھا اور لکھوایا

اہلِ محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا پیدا

غزل نمبر ۴۰ "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" حضرت علامہ کی مشہور غزل ہے۔ اس کا ایک مصرع یوں لکھا گیا ہے :۔

اسی روز و شب میں الجھ ہیں کر نہ رہ جا

سبحان اللہ مصرع میں کیا شان پیدا کی گئی ہے اسب عروضی قربان ہو رہے ہیں۔ اب اصل مصرع ملاحظہ ہو :۔

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا

غزل نمبر ۴۹ کا ایک اصل مصرع یوں ہے :۔

وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی

نقل دیکھئے :۔

وہ خاک کے پروائے نشیمن نہیں رکھتی

غزل نمبر ۵ کا اصل مصرع یوں ہے :۔

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو

ملاحظہ ہو نقلی مصرع :۔

یہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو

رباعیات میں سے ایک رباعی کا اصل مصرع یوں ہے :۔

نشانِ جادہ ہوں منزل نہیں ہیں

نیازی مصرع دیکھئے :۔

نشانِ جادہ ہوں منزل ہوں ہیں

ایک اور رباعی کا مصرع کچھ ایسا ہے :

سمن ہے، سبزہ ہے، بادِ سحر ہے

اس اڑھائی روپے والی "بالِ جبریل" کا مصرع ملاحظہ ہو :۔

سمن ہے، سبز ہے، بادِ سحر ہے

ایک معروف رباعی کا اصل مصرع یوں ہے :۔

شریکِ زمرۂ لایحزنوں کر

اب اس نسخے والا مصرع ملاحظہ ہو :۔

شریک در زمرہ لایحزنوں کر

حضرت علامہ اقبالؒ کی ایک مشہور نظم کا جو آپ نے اپنے سوزِ دروں سے تخلیق کی تھی ایک مصرع یوں ہے:۔

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک

اب ادارت کا کمال دیکھیے "گِل" کو "گُل" بنوا دیا ہے۔ اور "پیکرِ گُل" لکھوا کر مصرع بے معنی کر دیا ہے۔

"آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا"، اسی نظم ایک مصرع یوں ہے

لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں۔

اِس مصرع میں چوں کہ "لذت" مؤنث ہے اس لئے مدیر صاحب نے سمجھا اس کا مضاف بھی مؤنث ہی ہونا چاہیے۔ چنانچہ انھوں مصرع یوں لکھوا دیا:

"لذتِ تجدیدہ" سے وہ بھی ہوئی پھر جواں۔

"مُلّا اور بہشت" والی نظم کا ایک مصرع ملاحظہ ہو:۔

خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کِشت

نقلی مصرع:

خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب لبِ کِشت

"ابو العلا معرّی" پر علامہؒ کا نوٹ جو اصل نسخوں میں ہے اس نقل نسخے میں موجود نہیں۔

ایک مشہور قطعے کا مصرع اصل کتاب میں یوں ہے:۔

کل اپنے مریدوں سے کہا پیرِ مغاں نے

نقلی نسخے میں دیکھیے

کل اپنے مریدوں سے پیرِ مغاں نے

کتاب "بالِ جبریل" کے اشعار کی ترتیب میں گڑبڑ

حضرتِ علامہ مرحوم نے کتاب کو جس نہج پر ترتیب دیا وہ اُن کے ذوقِ سلیم کا مظہر ہے۔ لیکن زیرِ بحث ایڈیشن کی "ترتیب" پتہ نہیں کس بات کی مظہر ہے۔ علامہؒ نے بڑے اہتمام سے پہلے حصے میں ہر غزل کے بعد ایک شاندار، پُر مغز، سبق آموز اور دلآویز رُباعی لکھوائی ہے۔ مگر اس ایڈیشن میں یہ ترتیب بدل کر کتاب کا حُسن و جمال ختم کر دیا گیا ہے۔ اب خیر سے ان رباعیوں کو ایک جگہ اکٹھا لکھوا دیا گیا ہے۔ "قطعات" سے جو ظلم ہوا ہے وہ بھی دیدنی ہے بجلسِ ارادت کی دیکھا دیکھی ترتیب و ترکیب میں کاتب صاحب نے بھی اپنا اجتہاد برتا ہے۔ بس جہاں اُن کا جی چاہا قطعات کو لکھتے چلے گئے ہیں۔ تاخیر و تقدیم کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔

علاوہ ازیں اڑھائی روپے والی کتاب میں ایڈیٹر صاحب نے یہ کوشش کی ہے کہ جہاں جہاں اعراب کی ضرورت تھی وہاں سے اعراض برتا ہے اور جہاں جہاں اعراب کی ضرورت نہیں تھی وہاں اہتمام سے زیر، زبر، پیش لگوائی ہے۔ جہاں نُونِ غُنّہ کی ضرورت نہیں تھی وہاں بھی نونِ غُنّہ کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔

یہ اغلاط "مشتے نمونہ از خروارے" ہیں۔ اس ایڈیشن کو اگر سابقہ ایڈیشنوں سے ملایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ موجودہ سستا ایڈیشن نقل بھی صحیح نہیں ہو سکا اور جا بجا اشعار کو جھول دار، غیر موزوں اور بے معنی بنا دیا گیا ہے۔ آخر میں جناب ڈاکٹر جاوید اقبال مدظلہ سے اپنے نیازمندانہ تلمذ اور حضرت علامہؒ سے کمزوری کی حد تک اپنی والہانہ عقیدت کا واسطہ دے کر عرض کرتا ہوں کہ وہ کسی بھی ادارے کو حضرت علامہؒ کی کسی کتاب کو اس بیدردی سے بازار میں نہ لانے دیں جس بے دردی سے اس ناشر نے جرأت کی ہے۔

▲▲▲

محمد حنیف اعوان

علامہ اقبالؒ کے کلام میں نظریۂ تعلیم

علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ حیات میں ایک خاص نظریۂ تعلیم پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ فلسفے کو تعلیم سے بالکل الگ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس کو دور رکھا جاسکتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی درست ہے کہ ہر فلسفۂ حیات اپنے ساتھ ایک نظریۂ تعلیم بھی لاتا ہے۔

اقبالؒ چونکہ ایک بہت بڑے مفکّر اور فلاسفر تھے۔ اور انہوں نے اپنے تمام فلسفیانہ کلام میں خودی کی تکمیل پر بہت زور دیا ہے۔ بلکہ اُن کے فلسفے کا مرکزی نقطۂ نظر ہی "خودی" ہے۔ اس لئے اُن کے نزدیک ہر شے کا معیار خودی ہے۔ جو چیز انا کو کمزور کرے وہ بُری ہے اور جو اُسے مضبوط کرے وہ اچھی ہے۔ چوں کہ خودی مذہب کے بغیر پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس لئے جو تعلیم انسان کو مذہب سے بیگانہ کرے اقبالؒ اُسے اُمّت کے حق میں زہرِ قاتل سمجھتے ہیں موجودہ تعلیم سے ایمان کی کمزوری کا ظہور ہوا ہے۔ اقبالؒ نے اُسے کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اقبالؒ ہمیں عصرِ حاضر کی تعلیم سے روکتے نہیں بلکہ اُس کے بُرے نتائج سے آگاہ کرتے ہیں۔ مغرب میں جس چیز کو کھرا سمجھا جاتا ہے۔ وہ سراسر کھوٹ سے پُر ہے۔ اُن کے نزدیک اکمل تعلیم صرف وہی ہے۔ جو ہمیں عمل کرنے پر مجبور کرے۔ علاوہ ازیں اقبالؒ نے جدید تعلیم پر ایک اور اعتراض کیا ہے کہ

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

اقبالؒ سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء کی کاغذی ڈگریاں نہیں دیکھنا چاہتے بلکہ اُن میں تربیتِ خودی کا رجحان پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب اُنہیں ایسا ہوتا نظر آتا تو پھر مجبور ہو کر اُنہیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ؎

اقبالؒ یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات

اقبالؒ کے نزدیک سب سے بڑا اُستاد "تجربہ" ہے۔ اُن کے نزدیک اُستاد کے تھکا دینے والے لکچر اور نظر کو کمزور کر دینے والی ضخیم کتابیں غور و فکر کی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا سکتیں۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ

"درستی صرف سعی و خطا کے تجربے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے خطا جسے ہم ذہنی بُرائی گنتے ہیں تجربے کی تعمیر میں ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔" تجربے کے ذریعے علم حاصل کرنے میں اصل زور غلطی کرنے پر ہے۔ جب

طالب علم پہلے پہل درس و تدریس میں غلطی کرتا ہے تو دراصل یہ غلطی ہی اُسے سب کچھ سکھاتی ہے۔ ذوقِ جستجو غلطی اور شک و حیرت سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ رٹا لگانے سے۔

پس حقیقی علم تجربے یعنی کوئی کام کرنے کی کوشش کرنے، اس میں غلطی کرنے اور پھر کامیاب ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ طالب علم اس طرح اپنی ذاتی کوشش سے علم حاصل کرتا ہے وہ خود فی نفسہٖ اس عمل میں شریک ہوتا ہے اور چوں کہ اسے اس میں ذاتی دلچسپی ہوتی ہے اس لیے حصولِ علم میں اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو پوری طرح ابھرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہی وہ علم ہے جس سے فکر و عمل میں ندرت پیدا ہوتی ہے اور جو کسی قوم کی مادی اور روحانی ترقی کے لیے ازحد ضروری ہے۔

علامہ اقبالؒ بے شک علم پر کافی زور دیتے ہیں۔ لیکن وہ علم برائے علم کے ہرگز قائل نہیں۔ بلکہ علم عمل کے لیے ایک آلے کی حیثیت رکھتا ہے ہم سوچنے کے لئے زندہ نہیں رہتے بلکہ زندہ رہنے کے لیے سوچتے ہیں۔ المختصر اقبال کے نزدیک سائنسی تعلیم کے ساتھ ساتھ دین کی تعلیم بھی اشد ضروری ہے کیونکہ علم بغیر عشق کے اور خبر بغیر نظر کے ہمیں منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ علم میں عمل کا جذبہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں عشق کی حرارت موجود نہ ہو۔ اور جو تعلیم مذہب سے بیزاری سکھائے اقبالؒ اس کے سخت مخالف ہیں۔ اقبال اُس تعلیم کے حامی نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے انسانوں کی کایا پلٹ کی جا سکتی ہے اور وہ اس قسم کا عارفانہ نظر پیدا کرتی ہے جس سے انسانی شخصیت میں انقلاب پیدا ہوتا ہے۔

پروفیسر محمد مظہر الدین صدیقی

اقبالؒ کا سیاسی کا فلسفہ

اقبالؒ کے سیاسی فلسفے کے متعلق مختلف خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے مخالفین اسے فسطائیت کا علمبردار بنا کر پیش کرتے ہیں، کیوں کہ انہوں نے اپنے کلام میں ایک جگہ مسولینی کی تعریف کی ہے اور ویسے بھی اقبالؒ اعلیٰ اور پرعزم شخصیتوں کے جنہیں وہ کبھی مردِ مومن، مردِ قلندر اور مردِ حُر کہتے ہیں، بڑے مداح ہیں۔ بعض لوگ اقبالؒ کے کلام میں سوشلسٹ یا اشتراکی رجحانات بھی تلاش کرتے ہیں کیوں کہ انہوں نے کہیں کہیں سرمایہ داری کی مخالفت کی مثلاً وہ کہتے ہیں۔

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

ایک اور جگہ وہ کہتے ہیں: ؎

اٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو۔

لیکن یہ دونوں زاویہ ہائے نظر اقبالؒ کے مجموعی کلام اور ان کی نثری تصانیف کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی بڑے شاعر یا مفکّر کے سیاسی خیالات کو اس کے عمومی افکار سے علیٰحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے اگر اقبالؒ کے

سیاسی فلسفے کو سمجھنا ہے تو ان کی شاعری اور فلسفے کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ صرف چند منتشر خیالات و افکار پر ان کے سیاسی فلسفے کی بنیاد رکھنا ایک سنگین غلطی ہے۔

اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت عقیدۂ توحید کا مظہر ہے۔ چنانچہ اپنے خطبات میں لکھتے ہیں:۔

> "اسلام ذاتِ باری کے ساتھ وفاداری کا مطالبہ کرتا ہے نہ کہ تختِ شاہی کے ساتھ اور چوں کہ ذاتِ باری روحانی زندگی کی اساس ہے۔ اس لئے خداوند تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی مثالی فطرت کے ساتھ وفادار ہے۔"

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ لاہور ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۴۷)

اس کے معنی یہ ہیں کہ اقبال مملکت پرستی کی تمام شکلوں کے مخالف ہیں۔ وہ فرد کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ مملکت کے فیصلوں سے اختلاف کر سکے۔ اس نقطۂ نظر کی تائید اقبالؒ کے اس جملے سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں اسلام جذباتی وحدت کا ایک ایسا نظام ہے جو فرد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ہے اور خونی اور نسلی رشتوں کو انسانی وحدت کی بنیاد قرار نہیں دیتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اقبال جغرافیائی قوم پرستی کے بھی مخالف ہیں جو انسانی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ یہ امر بالکل فطری ہے کیوں کہ اگر اقبالؒ کے الفاظ میں اسلامی مملکت اصولِ نظر سے توحید کا عملی مظہر ہے تو اسے ان دیواروں کو منہدم کر دینا

چاہیئے جو انسانیت کے ایک حصّے کو دوسرے حصّے سے جدا کرتی ہیں۔ اس موضوع پر اقبالؒ نے رموزِ بے خودی میں بہت کچھ لکھا ہے مثلاً ؎

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست
رومی و شامی گلِ اندامِ ماست
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست
مرز بوم او بجز اسلام نیست

ایک اور جگہ کہتے ہیں:۔

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود ۔۔۔ از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد ۔۔۔ بر اساسِ کلمہ تعمیر کرد
تا ز بخششہائے آں سلطانِ دینؐ ۔۔۔ مسجدِ ما شُد ہمہ روئے زمیں

اقبالؒ کا سارا سیاسی فلسفہ ان دو بنیادوں پر تعمیر ہوا ہے۔ یعنی فرد کی اہمیت اور قدر و قیمت اور جغرافیائی قوم پرستی کی مخالفت، جہاں تک فرد کی اہمیت کا تعلق ہے۔ اقبال ہر ایسے سماجی نظام کو مسترد کر دیتے ہیں جس میں فرد کی شخصیت کو ابھرنے کا موقع نہ مل سکے۔ مثلاً اپنے خطبات میں ایک جگہ وہ مسلمان فقہا پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان کا بنیادی تصوّر یہ تھا کہ معاشرے میں نظم قائم رہے۔ ایک حد تک ان کا یہ خیال صحیح بھی تھا کیوں کہ تنظیم زوال و انحطاط کی

قوتوں کے لئے سدِ راہ بن جاتی ہے مگر انہوں نے یہ محسوس نہ کیا۔ اور ہمارے موجودہ علماء بھی اس احساس سے خالی ہیں کہ کسی قوم کی قسمت کے آخری فیصلے کا انحصار تنظیم پر اتنا زیادہ نہیں ہوتا جتنا انفرادی شخصیتوں کے کردار پر ہوتا ہے۔ جب معاشرے میں تنظیم ایک خاص حد سے آگے بڑھ کر غلو کے درجے تک پہنچ جاتی ہے تو فرد کی خودی بالکل مٹ جاتی ہے۔ وہ ساری دنیا کو تو سمیٹ لیتا ہے۔ لیکن اپنی روح سے عاری ہو جاتا ہے۔"

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ۔ صفحہ ۱۵۱)

یہاں اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ زوال و انحطاط کی قوتوں کو روکنے میں سب سے زیادہ موثر طاقت یہ ہے کہ ایسے افراد کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے جو اپنی خودی کے مرکز سے وابستہ ہوں۔ ایسے افراد نت نئے معیارات کا انکشاف کرتے ہیں جن کی روشنی میں ہمیں نظر آنے لگتا ہے کہ ہمارا ماحول اس لائق ہے کہ اس میں تبدیلی کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ انفرادیت کی نشوونما کا تصور اقبال کا ایک مرکزی تصور ہے۔ حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بھی ایک فرد قرار دیتے ہیں جو بے مثل اور بے نظیر ہے۔

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صفحہ ۶۲-۶۳)

اقبال خدا کے ایسے تصور کے قائل نہیں ہیں جس کی رو سے اس کو ایک مبہم اور منتشر طاقت بنا دیا جائے۔ اسی وجہ سے وہ ہمہ اوستی نظریہ کے خلاف ہیں کیونکہ اس نظریہ میں خدا کی انفرادیت کا انکار کیا جاتا ہے۔ اپنے اس استدلال کے ثبوت میں کہ خدا فرد واحد ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ قرآن نے خدا کو اللہ کے نام سے

موسوم کیا ہے جو ایک اسم معرفہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن خداوند تعالیٰ کی انفرادیت پر زور دیتا ہے اس کے ساتھ وہ سورۂ نور کی اس آیت کا بھی حوالہ دیتے ہیں جس میں اللہ کو آسمانوں اور زمین کا نور فرمایا گیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس آیت کے پہلے جملے سے انفرادیت کی نفی کا رجحان مترشح ہوتا ہے۔ لیکن آگے جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس سے اس رجحان کی تردید ہو جاتی ہے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کے نور کی جو مثالیں دیتا ہے اس سے یہ تصور غلط قرار پاتا ہے کہ وہ ایک نئی تشکل وصورت کا کائناتی عنصر ہے کیوں کہ قرآن صاف کہتا ہے کہ اس کا نور ایک چراغ کی طرح انفرادیت کا حامل ہے اور پھر مزید انفرادیت اور تشخص پیدا کرنے کے لئے قرآن کہتا ہے کہ چراغ بھی ایک شیشہ میں ہے۔ (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۶۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالؒ کو کوئی ایسا معاشرہ پسند نہیں ہو سکتا جس میں فرد کی آزادی محفوظ نہ ہو۔ یہ صحیح ہے کہ انفرادیت اور شخصی آزادی کی بھی حدود ہیں اور جب ان حدود کی پابندی نہیں کی جاتی تو معاشرے میں تصادم اور فساد کی کیفیات رونما ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مملکت فرد پر حاوی ہو کر اس کی آزادی کو مٹا دے اور زندگی کی تنظیم اس طرح عمل میں لائی جائے کہ انسان کی اپنی خودی باقی نہ رہے اقبالؒ افراد کی بڑی عزت کرتے ہیں۔

اس طرح سیاسیات میں اقبال جمہوری طرز حکومت کے علمبردار ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک جگہ اقبالؒ نے اپنے مجموعی افکار کے برعکس جمہوریت کی مذمت بھی

کی ہے چناں چہ وہ کہتے ہیں:—

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ شعر اقبال کے مجموعی فلسفے سے ٹکراتا ہے۔ اس لئے ہمیں ذرا غور سے دیکھنا ہوگا کہ اقبالؒ دراصل چاہتے کیا ہیں۔ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اقبالؒ کو جمہوریت پر اتنا اعتراض نہیں جتنا اس پر کہ حکومت اور اقتدار چند جاہلوں اور بے عقل لوگوں کے ہاتھ میں آجائے۔ غالباً اقبالؒ اپنے زمانے کے سیاسی ماحول سے متاثر تھے۔ اقبال کے زمانے میں جاگیرداروں زمینداروں اور نوابوں کو نمائندہ اداروں میں غالب اکثریت حاصل تھی۔ اور کسی دانشور یا فلسفی کے لئے ناممکن تھا کہ وہ انتخابات میں کامیاب ہو کر مقننہ کا رکن بن جائے۔ اس صورت حال کے پیشِ نظر اقبال ان رئیسوں اور زمینداروں کو دو صد خر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مگر اقبال کا یہ اعتراض جمہوریت کی ایک مخصوص صورت پر وارد ہو سکتا ہے۔ جمہوری نظام حکومت کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے نقائص کو رفع کرنے کا خود ہی انتظام کر سکتا ہے۔ اگر دانشوروں اور اعلیٰ صلاحیت کے افراد کو آگے لانا ہو تو انتخابی قواعد میں تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔ نمائندگی کے نئے اصول وضع کیے جا سکتے ہیں۔

اسلامی جمہوریت کے خدوخال سے بحث کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

"ان باتوں پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام ابتدا ہی سے اس اصول کو تسلیم کر چکا تھا کہ فی الواقع اور عملاً سیاسی حکومت کی کفیل وہ ہیں

ملت اسلامیہ ہے نہ کہ کوئی خاص فردِ واحد ہاں جو عمل انتخاب کنندگان اس معاملے میں کرتے ہیں۔ اس کے معنے صرف یہی ہیں کہ وہ اپنے متحدانہ اور آزادانہ عمل انتخاب سے اس سیاسی حکومت کو ایک ایسی منتخب اور معتبر شخصیت میں ودیعت کر دیتے ہیں جس کو وہ اس امانت کا اہل تصور کرتے ہیں۔ لیکن ایسے فرد کا مسندِ حکومت پر متمکن ہونا شریعت کے نزدیک اُسے کسی برتری یا ترجیح کا مستحق ہرگز نہیں بناتا، شریعت حقہ کی نگاہ میں اس کی شخصی اور ذاتی حیثیت وہی رہے گی جو ایک عام دوسرے مسلمان کی ہے۔ اس کو ان افراد پر جن کا وہ نمائندہ ہے سوائے اس حکومت کے جو خصوصاً آئین کے نافذ کرنے کی غرض سے اُسے حاصل ہے اور کوئی اختیار و اقتدار نہ ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب اسلام میں قانون سازی کی بنیاد شریعت کے نصوص کی احکام کے بعد تمام تر اتحاد و اتفاق عوام آراء جمہوریت کے بنیادی اصول اور جائیداد کے اثرات کا مقابلہ کرنے کی تدبیریں اختیار کی جا سکتی ہے۔ غرضیکہ جمہوریت کی ایسی شکل پیدا کی جا سکتی ہے جس میں صاحبِ کردار اور صاحبِ عقل لوگ آگے آسکیں۔ اصلاح و تبدیلی کا یہ عمل کسی اور نظام میں ممکن نہیں۔

اس سے اگر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اقبالؒ جمہوریت کے مخالف تھے تو اس کی تردید اقبالؒ کی حسب ذیل تحریر پر قائم ہے

"مقالات اقبال" لاہور ۱۹۶۳ء ۸۸، ۸۹

جب اقبال یہ تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اسلام میں قانون سازی کی بنیاد شریعت کے نصوص کی احکام کے بعد جمہورِ ملت کی آراء ہیں۔ تو پھر یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ وہ جمہوریت کے مخالف ہیں۔

جہاں تک نسلی اور وطنی قومیت کا تعلق ہے ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ کہ اِس کی مخالفت اقبال کے سیاسی فلسفے کا دوسرا اہم ستون ہے۔ یہاں ہم اقبال کی تحریروں سے ایک اور اقتباس پیش کرتے ہیں۔ اقبالؒ کہتے ہیں:-

"شریعتِ حقہ، نسلی یا قومی امتیازات کو جو بظاہر قدرتی معلوم ہوتے ہیں، ہرگز تسلیم نہیں کرتی۔ نہ ہی قومیت کے تاریخی اختلافات اس کے نزدیک کوئی وقعت رکھتے ہیں۔ اِسلام کا، سیاسی منتہا یہ ہے کہ تمام قوموں اور نسلوں کے آزادانہ اختلاط و اتحاد سے ایک نئی جامع فضائل و کمالات قوم پیدا کی جائے۔ مذہبِ اسلام میں سیاسی ترقی کا معراج نسلی اور ملکی قومیت نہیں اور یہ اِسی بنا پر کہ ملّتِ اسلامیہ کے عام اساسی اصول فطرتِ انسانی پر مبنی ہیں نہ کہ کسی خاص قوم کی خصوصیاتِ نسلی پر۔ ایسی قوم کا اندرونی ربط و ضبط کسی نسلی یا جغرافیائی اتحاد پر قائم نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی زبان اور تمدنی روایات و تجارب پر۔"

(مقالاتِ اقبال۔ لاہور صفحہ ۷۹،۷۶۳، ۹۱)

●●

عبد اللطیف سیٹھی

جاوید نامہ کے معارف و بصائر

عارف ہندی کے نو سخن

۱۔ یہ عالم ذاتِ حق کے لئے کوئی حجاب نہیں ہوتا۔ نقشِ آب غوطے کے رستے میں حائل نہیں ہوتا۔

۲۔ کسی دوسرے عالم میں جنم لینا بہتر ہے۔ تاکہ کوئی دوسرا شباب ہاتھ لگے!

۳۔ حق ورائے مرگ ہے۔ اور عین زندگی! بندہ جب مرجاتا ہے تو اسے کچھ پتہ نہیں رہتا کہ وہ کیا ہے!! اگرچہ ہم مرغانِ بے بال و پر ہیں لیکن علم مرگ میں ہم خدا سے افزوں تر ہیں۔ (کیوں کہ خدا کو موت نہیں۔ انسان کو موت ہے۔

۴۔ وقت کیا ہے؟ زہر میں ملی شیرینی ہے۔ یہ قہر میں ملی ہوئی رحمتِ عام ہے۔ اگر کسی شہر و دشت کو اس کے قہر سے خالی دیکھے تو یہ اس کی رحمت ہے۔ جو کچھ گزر گئی۔

۵۔ اے روشن نہاد! کافری موت ہے اور کسی غازی کا پھر مردے کے ساتھ جہاد کرنا کیسے سزاوار ہے۔ مردِ مؤمن زندہ ہوتا ہے۔ اور اپنے آپ کے ساتھ برسرِ جنگ!! اور وہ اپنی تقدیر پر اس طرح جھپٹ پڑتا ہے۔ جس طرح باہو

پر چہیتا۔

۶۔ کسی بُت کے سامنے ایک بیدار دل کافر اس دیندار سے بہتر ہے جو حرم میں سویا پڑا ہو۔

۷۔ وہ آنکھ اندھی ہے جو صرف ناصواب کو دیکھتی ہے۔ کیوں کہ کہیں بھی رات کو سورج دکھائی نہیں دیتا۔

۸۔ مٹی کی صحبت دانہ کو درخت بنا دیتی ہے۔ لیکن آدمی مٹی کی صحبت سے تیرہ بخت ہو جاتا ہے! اور دانہ مٹی میں پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے حتیٰ کہ شعاعِ آفتاب کو شکار کر لیتا ہے۔

۹۔ میں نے پھول سے پوچھا کہ اے سینہ چاک بتا کہ تو مٹی سے رنگ و بُو کیسے لیتا ہے؟ پھول نے کہا اے ہوشمند رفتہ ہوش! بالکل اسی طرح جس طرح تو برقِ خاموش سے پیغام حاصل کرتا ہے۔

(یعنی بجلی سے پیغام رسانی ہوتی ہے۔ وہ خاموش ہے نظر نہیں آتی)

تن میں جان ہمارے لئے جذبِ اینداں کی وجہ سے ہے اور ہمارا جذب چھپا ہوا ہوتا ہے کہ ع

جب دل میں تمہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو۔

یہاں مردِ عارف نے اپنی بات بند کر دی اور اپنے آپ ہی میں مست ہو گیا اور دفعتہً اس عالم سے کٹ گیا۔ ذوق و شوق نے اُسے اپنے ہاتھوں سے چھین لیا اور شہود کی بیرنگی سے وجود میں آ گیا۔ اس کا ظہور تھا تو ذرات مانندِ طور تھے۔ اور اس کا حضور تو نہ نور تھا نہ ظہور (خدا دوست کے غائب ہونے کے بعد

(سروش ایک نازنین کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور ایک گیت گاتی ہے)

جلوۂ سروش

سروش کا سراپا اور تعارف

اس رات کے طلسم سے ایک نازنین ظاہر ہوتی۔ گویا وہ اس کالی رات کے لئے ایک درخشان ستارہ تھی اس کی زلفوں کے سنبلستان کمر تک پہنچ رہے تھے۔ اور اس کی پلک سے کوہ و کمر جگمگا اٹھے تھے۔ وہ جلوہ مستانہ میں غرق تھی اور بے پیمانہ مست! بہت خوش سرود تھی اس کے سامنے فانوسِ خیال چکر کاٹنے لگا۔ اس خوردسال کے گرد سپہرِ سال خوردہ کرتب دکھانے لگا۔ اس فانوس پیکر نازنین کے اندر کئی رنگ سننے گویا کہ بنجشک پر شکرہ اور آہو پر چیتا چھپٹا ہوا ہے۔ مسافر نے رومیؒ سے پوچھا اے دانائے راز! ———— اپنے رفیق کم نظر پر یہ راز کھول! اس نے کہا کہ یہ پیکر جو چاند کی طرح تابناک ہے یزدان پاک کے کسی خاص ہی اندیشہ و فکر کی پیداوار ہے لیکن اب ذوقِ نمود سے بیتاب ہو کر شبستانِ وجود میں اتر آئی ہے۔ ہماری طرح آوارہ و غربت نصیب ہے۔ تو غریب، میں غریب اور یہ غریب بھی غریب! شان اس کی جبرئیلی ہے۔ اس کا نام سروش ہے۔ کبھی ہوش اڑاتی ہے اور کبھی ہوش میں لاتی ہے۔ ہمارا غنچہ بھی اس کی شبنم سے کھلا اور ایک بجھی ہوئی آگ اس سے زندہ ہو گئی۔ زخم شاعر اس کے دل کے ساز سے ہے اور پردہ محمل میں جو چاک پڑے ہیں وہ بھی اس کی وجہ سے ہیں۔ میں نے اس کے نغمہ میں ایک عالم کو دیکھا ہے۔ ذرا تو بھی تھوڑی دیر کے لئے اس کی آگ سے بہرہ ور ہو جا۔

نوائے سروش

(مفہوم)

مجھے ڈر ہے کہ تو سراب کے اندر کشتی چلا رہا ہے۔ تو حجاب میں پیدا ہوا اور حجاب کے اندر مرا! جب میں نے سرمہ رازی کو اپنی آنکھوں سے دھو دیا تو میں نے کتب کے اندر تقدیر اُمم کو دیکھ لیا۔ کِشت دخیابان اور کوہ و بیابان پر پیچ و تاب دیکھا کیوں کہ وہ بھی جو اپنے آپ پر پیچ و تاب کھاتی رہتی ہے۔ بادل میں جاکر مرجاتی ہے میں۔۔ اہلِ مغرب کے ساتھ رہا ہوں۔ میں نے انہی کے ساتھ پر تولے ہیں۔ لیکن میں نے بہت کم دیکھا ہے کہ وہاں کوئی ایسا مرد پیدا ہوا ہو جس کے مقامات حساب میں نہ آسکتے ہوں۔ دردِ جہانگیری کے بغیر وہ قرب میسّر نہیں آتا۔ اے بو گلاب اندر! گلشن کو گریبان میں کھینچ لے آ۔ اے زاہد ظاہر بین! مانا کہ خودی فانی ہے لیکن تو اس طوفان کو نہیں دیکھتا۔ جو بلبلہ کے اندر موجود ہے۔! یہ دلآویز نغمہ کسی مطرب کے زخم کا مرہون نہیں۔ یہ تو جنت سے بچھڑی ہوئی ایک حور ہے جو رباب کے اندر محوِ نالہ و فریاد ہوتی ہے !!!

ایں صوتے دلآویزے از زخمِ مطرب نیست
مہجورِ جناں حورے نالد بہ رباب اندر

وادیٔ یرغمید

چاندکی ایک وادی کی طرف روانگی جس کا نام یرغمید ہے اور جسے ملائکہ وادیٔ طواسین کے نام سے پکارتے ہیں۔
نوائے سروش سُن کر رومی۔ ہاں وہی عشق و محبت کا رہنما جس

کا کلام نشتر کا موں کے لئے سلسبیل ہے۔ کہنے لگا:۔

شعر اور ہندی شاعری

رومی:۔ وہ شعر جس میں آگ بھری ہے اس کی اصل "اللہ ہو" کی گرمی سے ہوتی ہے۔ یہ نوا وہ ہے جو خاشاک کو گلشن میں تبدیل کر دے۔ اور یہ نوا وہ ہے جو افلاک کو الٹ پلٹ کر دے۔ ایسی نوا جنوں پر گواہی دیتی ہے۔ اور فقیروں کو بادشاہی عطا کرتی ہے۔ اس سے بدن کے اندر خون کی حرکت زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اور قلب روح الامین سے زیادہ بیدار ہو جاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ بہت سے شاعر اپنے شعر کے جادو سے رہزن قلب اور ابلیس نظر ہو گئے۔ اور شاعر ہندی خدا اس یار بادا خدا کرے اس کی جان لذّتِ گفتار سے محروم ہو جائے۔ اس نے تو عشق کو ڈومنی بنا سکھا دیا ہے۔ مگر آج ان کی شاعری نے خلیلوں کو آزادی کا سبق پڑھا دیا ہے۔ باتیں اس کی فرسودہ پس خوردہ اور چبائی ہوئی ہیں۔ اور بے سوز اور بے درد و بے اثر! اہلِ درد اسے فردہ کہتے ہیں ناکردہ! اس کی نام نہاد نوائے خوش سے جو بے "مقام" ہو۔ وہ بات بھی بہتر ہے۔ جو نیند کی حالت میں کہی گئی ہو! لیکن ایک حقیقی شاعر کی فطرت سراپا جستجوئے حق ہوتی ہے اور وہ آرزو کا خالق اور پروردگار ہوتا ہے۔ حقیقی شاعر اپنی ملت کے سینے کا دل ہوتا ہے اور وہ ملت جو حقیقی شاعر سے محروم ہو وہ مٹی کا ایک ڈھیر ہوتی ہے۔

سوز مستی ایک عالم کی نقشبند ہوتی ہے اور اس کے بغیر شاعری محض ماتم!

اگر شعر کا مقصود آدم گری ہو تو ایسا شاعری وارث پیغمبری ہوتی ہے (سافر پیغمبر کا لفظ

سُن کر چونک پڑتا ہے۔ اور رومی سے پیغمبری کی بابت سوال کر لیتا ہے۔

پیغمبری کیا ہے؟

مسافر:۔ کچھ پیغمبری کی بابت بتاؤ اور مردِ محرم پر یہ راز بھی کھولو کہ یہ کیا چیز ہے؟

رُومی:۔ اقوام و مِلل پیغمبری کی نشانیاں ہیں۔ اور ہمارا زمانہ تو اس کی مخلوقات میں سے ہے پیغمبری کے دم سے سل پتھر اینٹ بول اٹھتے ہیں! اور وہ اگر کھیتی ہے تو ہم سب اس کے حاصل! پیغمبری ہڈی اور ریشہ کو دانوں سے پاک صاف کرتی ہے۔ اور انسانی فکر کو بال جبریل بخش دیتی ہے۔ کائنات کے اندر "ہائے ہو" برپا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے لب پر نجم و نور و نازعات (سورہ ہائے قرآنی کے نام) جاری ہو جاتی ہیں۔ پیغمبری کے آفتاب کو زوال نہیں اور پیغمبری کا منکر بے نصیب کمال ہوتا ہے۔ پیغمبری کے احرار کی صحبت رحمتِ حق کا حکم رکھتی ہے۔ اور اس کرار کی ضربت قہرِ یزداں بن کر مرکزِ عالم کو ہلا دیتی ہے۔ اس لئے خواہ تو عقل کل ہی کیوں نہ ہو پیغمبری سے دُور نہ بھاگ کیونکہ وہ تن و جاں کو باہم دیکھتی ہے۔

پیغمبری کے رموزِ خاص بیان کرنے کے بعد رومی مسافر کو کہتا ہے:۔

اے مسافر! چاند کی اس وادیٔ یرغمید تک جلد پہنچنے کے لئے قدم تیز کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ جو کچھ دیکھنا چاہیئے۔ اس سے محرومی ہو جائے اور یہ دیکھ کر سنگِ قبر پر کیا کندہ ہے؟ یہ لکھا ہے کہ "چار طاسین

بغوت اس لکھے کو دیکھ ۔

شوق کیا ہے؟

مسافر سنگ قبر کی تختی کو دیکھتا ہے۔ اور تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ کیوں نہ ہو یہ شوق کا معاملہ ہے شوق کو اپنے رستہ کا بخوبی پتہ ہے وہ بے دلیل رواں دواں چلا جاتا ہے اور شوق کو بالِ جبریل کی پرواز ملتی رہتی ہے۔ شوق کے لیے راہِ دراز قدم دو قدم ہو جاتا ہے کیوں کہ یہ رہ نوردِ شوق اگر منزل سے تھک جاتا ہے سفر سے نہیں ع

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول

یرغمید کی بلندیاں

مسافر کہتا ہے :-

میں نے جلدی جلدی قدم بڑھایا اور مستانہ وار یرغمید کی وادی کی طرف لپک گیا۔ یہاں تک کہ اس وادی کی بلندیاں دکھائی دینے لگیں۔ میں اس مقام کی شان و شوکت کی بابت کیا بتاؤں کہ وہ کیا تھی۔ سات ستارے اس وادی کے گرد سرگرم طواف تھے فرشیاں اس کے نور سے روشن ضمیر اور عرشیاں اس کی مٹی کے سرمہ سے روشن بصر! اللہ تعالےٰ نے مجھے آنکھ دی۔ دل دیا اور گفتار دی۔ اور

مجھے عالم اسرار کی جستجو کا شوق عطا کیا۔ اب میں ان سب اسرار سے پردہ اٹھاتا ہوں اور تمہیں طواسینِ رسل کی بابت بتاتا ہوں کہ وہ کیا ہیں۔

چاند کی ایک غارِ عمیق

چاند کی یہ ایک غارِ عمیق تھی۔ مسافر نے اندھوں کی طرح دوشِ رفیق پر ہاتھ رکھے ہوئے اس غار کے اندر قدم رکھا۔ یہ غار اس قدر تاریک تھی کہ اس کی ظلمت سے چاند کی دل داغ داغ تھا اور اس کے اندر خورشید خود محتاجِ چراغ تھا۔

مسافر کے تأثرات

مسافر:۔ اس تیرہ و تار ہولناک غار نے مجھ پر دہشت و وحشت طاری کر دی، وہم اور شک نے مجھ پر شبخون مارا کہ گویا میری عقل و ہوش کو دار پر لٹکا دیا۔ میں رستہ پر چل تو پڑا لیکن راہزن گھات میں تھے اور دل اس ہولناک منظر کی وجہ سے صدق و یقین سے خالی ہو گیا یہاں تک کہ نگاہ کے لیے جلوے بے حجاب ہونے لگے اور طلوعِ آفتاب کے بغیر ہی صبح روشن ہو گئی۔

یہ ایک وادی تھی۔

اس کا ہر پتھر زنار بند تھا۔ اور اونچے اونچے دیو سار درختوں کی موجودگی سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مقام آب و خاک کی سرشت سے ہے یہاں ایسا معلوم ہوا کہ یا تیرِ خیال عالم خواب میں کوئی نقشبندی کر رہا

تھا یا پھر اس وادی کی ہواؤں میں شراب کی طرح کا ذوق و سُرور تھا۔ یہاں سایہ اس کی مٹی کی تقبیل سے عین نور ہو رہا تھا۔ نہ اس کی زمین کا کوئی سپہرِ لاجوردی تھا اور نہ ہی اس کا کنارہ شفقوں سے سُرخ و زرد، وہاں نور پابندِ ظلام نہ تھا اور نہ ہی اس کی صبح و شام کے گرد کوئی دھواں تھا۔

عارفِ ہندی یا جہاں دوست سے ملاقات

چاند کی اس غار کی اس وادی میں ایک درخت کے نیچے ایک شخص بیٹھا تھا اس کی آنکھیں سرمہ سے روشن سواد تھیں۔ بال سر پہ باندھے ہوئے تھے۔ بدن عریاں تھا اور اس کے گرد ایک سانپ نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ وہ آدم زاد تھا لیکن آب و گل سے بالاتر۔ اور دُنیا اس کے خیال کے بُت خانہ کا ایک پیکر تھی۔ اس کے وقت کے لئے کوئی گردشِ ایام نہ تھی اور چرخِ نیلی فام سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس نے رومی سے دریافت کیا کہ تیرے ساتھ کون ہے؟ میں اس کی آنکھ میں آرزوئے زندگی دیکھتا ہوں؟

رومی ـ اقبال کا تعارف کراتا ہے۔

رومی ـ یہ مردِ آوارہ جستجو ہے۔ ثابت ہے، لیکن اس کی فطرت سیار ہے اس کی خامیوں کی بہ نسبت اس کا کام پختہ تر ہے اور میں خود بھی اس کی ناتمامیوں کا شہیدِ ناز ہوں اس نے اپنے شیشہ کو آسمان کے ساتھ طاق بستہ کر رکھا ہے۔ اور اس کا فکر جبریلِ امین سے صداقت اور رونمائی کا خواہاں ہے۔ یہ عقاب کی طرح مہر و ماہ کے شکار کو جھپٹتا ہے اور نو آسمانوں کے طواف میں ہر دم گرم رو

رو ہے اہل زمین سے رندانہ بات کرتا ہے۔ حور و جنت کو بُت خانہ بتاتا ہے لیکن مجھے اس کے دھوئیں کی موج میں شعلہ نظر آتا ہے۔ اور اس کے سجود کے اندر کبریا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہر وقت فرطِ شوق سے بانسری کی طرح نالہ زن رہتا ہے۔ اور اسے فراق و وصال دونوں ہلاک کرتے رہتے ہیں نہ معلوم اس کے آب و گل میں کیا چیز ہے اور نہ ہی مجھے اس کے مقام منزل کا کچھ پتہ ہے۔ ؎

من ندانم چیست در آب و گلش
من ندانم از مقام و منزلش

رُومی اور خدا دوست کا مکالمہ

خدا دوست (عارف ہندی) کے سوالات

عالم رنگ سے ہے اور بے رنگی حق سے ہے، عالم کیا ہے؟ آدم کیا ہے؟ حق کیا ہے؟

رومی:۔ آدمی شمشیر ہے اور حق شمشیر زن اور عالم سنگ ہے، مشرق نے حق کو دیکھا، مغرب صرف عالم میں گھستا، چبھتا چلا گیا اور حق سے دور جا پڑا۔ حق پر آنکھ کھولنا بندگی ہے اور بندہ جب زندگی سے حصہ حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس بندے پر خدا بھی درود بھیجتا ہے اور جو کوئی اپنی تقدیر سے آگاہ اس کی مٹی سوزِ جان سے بیگانہ ہوتی ہے ؎

ہر کہ از تقدیرِ خویش آگاہ نیست
خاک او با سوزِ جاں ہمراہ نیست

خدا دوست:۔

اگرچہ یہ وجود و عدم بر پیچ و تاب کھا تا رہا لیکن افسوس کہ اس مشرف نے اپنے رازوں کو نہ پایا۔ ہم افلاکیوں کا کام سوائے دید کے اور کچھ نہیں لیکن میری جان مشرق کے فردا یعنی مستقبل سے نا امید نہیں۔ یہاں کوہستان قمر میں ایک پہاڑ ہے جس کا نام قشمرود ہے اس کے فراز میں کل میں نے ایک فرشتہ کو آسمان سے اترتے دیکھا تھا۔ اس فرشتہ کی نگاہ سے شوق دیدار ٹپک رہا تھا اور سوائے ہمارے خاکدان کی طرف کے اور کسی طرف نہیں دیکھتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اپنے محرموں سے راز نہ چھپا اور بتا کہ اس خاک خاموش کے اندر تجھے کیا نظر آتا ہے؟ یا کیا جمال زہرہ کھل گیا ہے؟ یا بتا کہ کیا تو نے بھی اپنا دل چاہ بابل میں لٹکا دیا ہے۔

فرشتے کا جواب

سرزمین مشرق کا روشن مستقبل

طلوع خاور کا وقت قریب ہے اور ایک تازہ آفتاب اس کے سینے میں موجود ہے۔ اور اس کے سنگ راہ سے لعل و جواہر باہر نکل رہے ہیں۔ اور اس کے سنگ راہ سے لعل و جواہر باہر نکل رہے ہیں۔ اور اس کے تمام یوسف اب کنوؤں سے باہر آنے والے ہیں۔ اس کی بغل میں مجھے رستا خیز نظر آتی ہے۔ اور اس کے کوہسار میں مجھے لرزہ دکھائی دیتا ہے۔ اس نے مقام آذری سے رخت سفر اٹھا لیا ہے تاکہ ترک بت گری کا خوگر ہو سکے۔ اور کیا کہتے ہیں اس قوم کے جس نے اپنی جان کو تڑپا یا اور اپنی مٹی سے اپنے آپ کو پھر پیدا کیا۔ جب کبھی چشم ملت کہیں بیدار ہوتی ہے تو وہ گھڑی ہم عرشیوں کے واسطے صبح عید کا حکم رکھتی ہے ۵

عرشیاں را صبحِ عیدآں ساعتے
چوں شود بیدار چشمِ ملتے

فرشتہ کی اس تقریر کے بعد خدا دوست نے مسافر کی طرف دیکھا اور بہت ہی بے تابی سے دیکھا اور پھر مسافر کو مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوا۔

اقبال اور جہاں دوست کا مکالمہ

بولا: مرگِ عقل؟ میں نے کہا ترکِ فکر! پوچھا مرگِ قلب؟ میں نے کہا ترکِ ذکر! بولا: تن؟ میں نے کہا: زادہِ گرد راہ! پوچھا کہ جان؟ میں نے کہا۔ رمزِ لا الٰہ۔ پوچھا: آدم؟ میں نے کہا اس ذاتِ پاک کے رازوں میں سے ایک راز۔ بولا: عالم؟ وہ خود ہی روبرو ہے! کہا کہ علم و ہنر؟ میں نے کہا پوست۔ کہا کہ حجت کیا ہے؟ میں نے جواب دیا: روئے دوست! اس نے پوچھا، عامیاں؟ میں نے کہا کہ شنیدہ اس نے پوچھا: دینِ عارفاں؟ میں نے کہا کہ دید۔ اس گفتگو سے مجھ میں لذتِ جان بڑھ گئی اور مجھ پر نکتہ ہائے دلنشیں کھل گئے۔

از کلامش لذتِ جانش فزود
نکتہ ہائے دلنشیں بر من کشود

عقل و دل کی موت۔ ترکِ فکر و ذکر۔ تن و جان۔ آدم عالم و علم و ہنر
حجت دینِ عامیاں، عارفاں کی بحث کے
بعد خدا دوست اپنے مخصوص انداز میں زندہ رود کو کام کی نو باتیں
بتاتا ہے۔ ؎ ؎

دیکھا بھی، دِکھایا بھی، سُنایا بھی، سنا بھی!
تسکین مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں

اب اقبال اپنے اس خلائی سفر میں آسمان عطارد پر پہنچ گیا ہے! وہاں پہلے سید جمال الدین افغانی اور ترک سالار سعید حلیم پاشا کی روحوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان ملاقاتوں میں حالاتِ حاضرہ اور تعلیمات اسلام کی روشنی میں وقت کے چند اہم مسائل پر بات ہوتی ہے۔ دین کیا ہے؟ وطن کیا ہے؟ اشتراکیت کیا ہے؟ ملوکیت کیا ہے؟ شرق و غرب کی نظریاتی آویزش کیا ہے؟ اس سلسلے میں چند محکماتِ عالم قرآنی کا مفہوم کیا ہے؟ خلافتِ آدم کے کیا معنی ہیں؟ حکومت الٰہی کیا چیز ہے؟ ارض ملکِ خدا ہے! احدیثِ نبی ﷺ کہ حکمتِ خیرِ کثیر ہے کیا معنی ہیں؟ ان مسائل پر ڈایالاگ کے بعد سید السادات مولانا جمال الدین افغانی ملتِ روس کے نام ایک خاص پیام دیتے ہیں اور رومی اقبال کو کہتا ہے کہ اس وقت کوئی شعر سناؤ۔ اقبال غزل گاتا ہے۔

معنیٔ تازہ کہ جوئیم و نیابیم کجاست؟
مسجد و مکتب و میخانہ عقیم اند ہمہ
مشکل این نیست کہ بزم از سرِ ہنگامہ گذشت
مشکل این است کہ بے نقل و ندیم اند ہمہ

زیارات ارواح جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا
فلکِ عطارد کی بابت اقبال کے تاثرات

اور حضرت فضیل، بوسعید، جنید اور بایزید کے ساتھ نماز باجماعت کی سعادت، اس خاک کی مٹھی نے اپنی تجلیات کے دیکھنے میں اپنا کام سامنے رکھا! یا تو یہ ہوا کہ میں ہست و بود کے دام میں پھنس گیا۔ یا پھر یہ بات ہوئی کہ وجود خود میرے دام میں اسیر ہو گیا۔ میں سوچنے لگا . . . .

کہ کیا آسمان کی یہ نیلی چھت میری وجہ سے چاک ہے؟ کیا میں افلاک سے ہوں یا افلاک مجھ سے ہے؟ یا میرے ضمیر کو فلک نے دبا لیا ہے؟ یا میرے ضمیر نے فلک الافلاک کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے؟

کیا یہ اندرون ہے؟ کیا یہ بیرون ہے؟ یہ جو کچھ کہ نگاہ دیکھتی ہے وہ کیسے ہے اور کیا ہے؟ . . . . . پھر مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی دوسرے ہی آسمان پر پر مارتا پھرتا ہوں اور اپنے سامنے کسی دوسری دُنیا کو دیکھتا ہوں اور یہ ایک ایسی دُنیا ہے جس میں بھی پہاڑ ہیں، دہشت ہیں۔ سمندر ہیں اور خشکی ہے۔ یہ بھی ایک مٹی کی دُنیا ہے اور ہماری مٹی کی دُنیا سے زیادہ پرانی ہے۔ یہ دُنیا بھی ابر سے نشو و نما پاتی ہے۔ اس سے آدم کی دستبرد نہیں دیکھی اور دولوں کی لوح وجود پر کسی نے کوئی نقش نہیں باندھا اور نہ ہی دہاں اب معلوم ہوتا ہے کہ فطرت خوردہ گیری کرتی رہی . . . !

بلبل نے رومی سے کہا! یہ کرا بہت اچھا ہے۔ اور اس کوہستان میں تھوڑی دریا کیا بھلی لگتی ہے! لیکن مجھے یہاں زندگی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ لیکن پھر بھی یہ اذان کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟

رومی نے کہا یہ اولیاء کا مقام ہے اور یہ خاکدان ہماری مٹی سے آشنا ہے۔

حضرت ابو البشرؑ نے جب باغ بہشت سے رخت سفر باندھا تو ایک دو دن اس عالم میں قیام کیا یہ وہ فضائیں ہیں جس نے اس کی آہوں کا سوز دیکھا اور اس کے دردناک نالہ ہائے صبحگاہی کو سُنا۔ اس مقام ارجمند کی زیارت کرنے والے لوگ مردان پاک ہیں جن کے مقامات بہت بلند ہیں۔ حضرت فضیل اور بوسعید ایسے پاک مرد یہیں مقیم ہیں اور جنید اور بایزید جیسے عارف باللہ لوگ یہیں قیام فرما ہیں۔ ذرا اُٹھو اور چلو تاکہ ہمیں ان بزرگوں کے ساتھ نماز پڑھنے کا موقع مل جائے اور ایک دو دم کے لئے سوز و گداز مل جائے۔

میں چل پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مرد قیام میں ہیں۔ مقتدی تاتار ہے اور افغانی امام

پیر رومیؒ جو ہر وقت حضور میں رہتے ہیں اور جن کی روشنی ذوق و سُرور سے چمک اُٹھتی ہے کہنے لگے کہ سرزمین مشرق نے ان دو آدمیوں سے بہتر کوئی آدمی پیدا نہیں کیا۔ ہماری گتھیاں ان دونوں کے ناخن تدبیر سے کھل گئیں۔ ان میں ایک سید السادات جمال الدین افغانی ہیں۔ اور دوسرا ترک سالار حلیم درد مند ہے جس کا فکر اس کے مقام کی طرح بلند ہے۔ ایسے بزرگوں کے ساتھ دو رکعت نماز ادا کرنا عین طاعت ہے نہ کہ وہ کام کہ جس کی مزدوری جنت ہے ؎

با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است
ورنہ آں کارے کہ مزدش جنت است

اس مرد سخت کوش کو قراٗت سورہ و النجم اور یہ دشت خاموش!!

کیا کہنے! ایسے قراٗت کے کہ جس سے خلیلؑ اور جبرائیلؑ کی روح پاک وجد میں

آجائے۔ اور جس سے سینے میں دل ناصبور اور قبروں سے شور الا اللہ بلند ہو جائے۔ یہ قرأت وہ تھی جو دھوئیں کو اضطراب شعلہ بخش دے اور خود داؤد کو سوز و مستی عطا کر دے۔ ہر غیاب اس قرأت سے آشکارا۔ اور ام الکتاب بے حجاب ہو گئی . . . . میں نماز کے بعد اپنی جگہ سے اٹھا اور ازراہِ نیازمندی اس بزرگ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

اقبال کا تعارف

ان جلیل القدر ارواح سے رومیؒ نے اقبال کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میرے ساتھ ایک ذرہ گردوں نورد ہے اور اس کے دل میں درد و سوز کا ایک جہان آباد ہے اس نے نہ اپنے آپ کے سوا کسی پر آنکھ کھولی نہ اپنا دل کسی کے حوالے کیا۔ اور یہ ایک بندۂ آزاد ہے۔ اور فراخائے وجود کے اندر تنویر ہے اور میں اسے شوخی سے زندہ رُود کہتا ہوں۔

افغانی

اے زندہ رُود! ہمارے خاکدان کو کوئی بات سُنا۔ لِلّٰہ بتا، لِلّٰہ سنا کہ وہاں کی زمین اب کیسی ہے؟ وہاں کا آسمان کیسا ہے؟ اور اے خاکی! تیرا وجود قدسیوں کی طرح روشن ہے مجھے بتا کہ تمہاری زمین پر اب مسلمانوں کا کیا حال ہے . . . . !!

زندہ رُود

میں اس ملت کیتی شکن کے اندر دین و وطن کی آویزش دیکھتا ہوں لیکن افسوس کہ اس کے جسم میں روح مردہ ہو گئی ہے اور ضعفِ یقین کی وجہ سے وہ دین متین کی قوت سے مایوس ہے۔ ترک، ایران اور عرب سب مست فرنگ ہیں ان سب کے

حق میں افرنگ کا کانٹا چبھا ہوا ہے ۔۔۔۔ سارا مشرق سلطانیٔ مغرب کے ہاتھ خراب وخستہ ہو گیا ہے اور دین وملت میں اشتراک پڑ گیا ہے ۔

افغانی

دین وطن

وہ تو ایک مردِ مغرب تھا۔ سراپا مکر وفن جس نے اہلِ دین کو تعلیم وطن دے ڈالی لیکن وہ خود تو ایسے مرکز کی فکر میں ہے اور تو نفاق کی ۔ اس شام فلسطین اور عراق کو چھوڑ کیوں کہ اگر تجھ میں تمیز خوب وزشت ہے تو کلوخ وسنگ وخشت پر دل نہ لگا۔ دین کیا ہے روئے زمین سے اوپر اُچھلنا تاکہ جان اپنے آپ سے آگاہ ہوجائے ۔ وہ شخص جو اللہ ہو کہتا ہے اس نظام چار سو کی حدود میں نہیں سماتا۔ گھاس کا تنکا مٹی سے پیدا ہو کر مٹی سے اُٹھتا ہے لیکن حیف ہے اگر کوئی جان پاک مٹی میں مرجائے ۔ ع

حیف اگر در خاک میرد جان پاک

اگرچہ آدم آب وگل سے پیدا ہوا۔ لیکن اس نے پھول کی طرح آب وگل سے رنگ ونم وصول کیا۔ اس لئے حیف ہے اگر وہ ہمیشہ آب وگل میں غلطاں رہے اور حیف ہے اگر وہ اپنے مقام سے اوپر نہ اٹھے ۔ تن وجان کی رمز کو سمجھو تن کہتا ہے کہ خاک رہگزر بن کر رہ جائے لیکن جان کہتی ہے کہ پہنائے عالم کو دیکھو ۔ اے ہوشمند! جان ان جہات کے اندر نہیں سماتی اور مرد آزاد ہر قید و بند سے بیگانہ ہوتا ہے مرد آزاد اس خاک تیرہ سے چیخ اٹھتا ہے ۔ کیونکہ عقابوں سے چوہے کا کام نہیں ہو سکتا ۔

حر ز خاکِ تیرہ آید در خروش ! ۔ ۔ زانکہ از بازاں نیاید کار موش !

وہ کفِ خاک جسے تو نے وطن کا نام دے رکھا ہے اور یہ کہ جسے تو مصر ایران، یمن کہتا ہے کیا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ اہل وطن کو وطن سے ایک نسبت ہے کیوں کہ اس کی خاک سے کوئی ملت طلوع ہوتی ہے اور اس نسبت میں بھی اگر تو بہ نظر دیکھے تو بال ایک باریک نقطہ ہے جو بال سے باریک تر ہے۔ سورج کو نہیں دیکھتا۔ کہ اگرچہ وہ اپنی تمام تر شوخ تجلیوں کے ساتھ مشرق سے بے حجابانہ نکلتا ہے۔ لیکن اپنے سوز دروں سے اس تب و تاب میں ہے تاکہ مشرق و مغرب کی قید سے نکل جائے وہ جلوہ مست اپنے مشرق سے اٹھتا ہے تاکہ تمام آفاق کو اپنے قبضے میں لے آئے۔ اس کی فطرت مشرق و مغرب سے بری ہے۔ اگرچہ از روئے نسبت وہ مشرقی ہے لیکن مشرق و مغرب اس کی لپیٹ میں ہیں ؎

فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ رو از روئے نسبت خاوری است

مسلمانوں کی سوچ کی طرح طلوع ہو کر سارے مشرق و مغرب کو اپنی روشنی سے منور کرنا ہے۔ ؎

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لئے

اشتراک و ملوکیت

وہ کارل مارکس وہ صاحب کتاب سرمایہ وہ یہودی ارنس خلیل!
یعنی کہ وہ پیغمبر بے جبرائیل! حق بات اس کے باطل میں چھپی ہوئی ہے۔ دل اس

کا موئمن ہے دماغ کافر ہے۔ اصل میں اہلِ مغرب نے افلاک کو کھو دیا ہے! وہ جان پاک کو شکم میں تلاش کر رہے ہیں!! حالاں کہ جان پاک اپنا رنگ و بو تن سے حاصل نہیں کرتی ہے اور اس اشتراکیت کا تن کے ماسوا کوئی کام ہی نہیں اس پیغمبر حق ناشناس کے دین کی ساری بنیاد مساوات شکم پر قائم کی گئی ہے۔ ع

فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟!

چونکہ اخوت کا مقام دل میں ہے۔ اس کی جڑیں دل میں ہے نہ کہ آب و گل میں اور نیز یہ ملوکیت یہ بھی بدن کے موٹاپے کا نام ہے جس کا سینہ بے نور ہے اور دل سے خالی ہے۔ یہ ایک زنبور بھڑ ہے، جو ہر پھول پر سے ہو کر گزرتی ہے اور اس کا شہد چوس لیتی ہے۔ یہ شاخ و برگ اور رنگ و بوئے گل سب ظاہری ہیں اور بلبل ان سب کے ظاہری جمال پر ہر دم نالہ زن رہتی ہے! اس ملوکیت کے طلسم رنگ و بو کو چھوڑ کر صورت کو ترک کر اور معنی کو دیکھ اگرچہ باطن کی موت کا دیکھنا مشکل ہے لیکن تو اسے پھول نہ سمجھ سلہ کیوں کہ وہ اصل و حق میں مٹی ملا ہے ۔

مرگ باطن گرچہ دیدن مشکل است

گل مخواں او را کہ در معنی گل است

دونوں کی جان ناشکیب و ناصبور ہے۔ دونوں یزداں نشناس ہیں ۔۔۔ دونوں آدم فریب ہیں ایک کے لئے زندگی خروج ہے دوسرے کے لئے خراج اور ان دونوں پتھروں کے بیچ آدم کا تیج کی طرح پسا چلا جا رہا ہے ایک کا کام یہ ہے کہ جسم سے جان نکال لینا ہے ہاتھ سے روٹی چھین لیتا ہے۔ دونوں کو آب و گل میں غرق

دیکھتا ہوں دونوں کا فن روشن نظر آتا ہے لیکن دل تاریک ہے زندگانی کیا ہے؟ سوختن یا ساختن! اور مٹی کے اندر دل کی تخم ریزی کرنا! ؎

زندگانی سوختن یا ساختن = در گلے تخم دلے انداختن

سعید حلیم پاشا

مشرق و مغرب کی آویزش! اہلِ مغرب کے لئے زیرکی ایک سازِ حیات ہے۔ لیکن اہل مشرق کے لے عشق رازِ کائنات ہے!

اور یہ زیرکی صرف عشق سے حق شناس اور محکم ہوتی ہے اور جب عشق زیرکی کا ہمسر ہو جاتا ہے تو ایک دوسرے ہی عالم کی نقشبندی ہونے لگتی ہے۔ اس لیئے اٹھ کھڑا ہو اور کسی دوسرے ہی عالم کا نقش جما دے اور عشق کو زیرکی کے ساتھ ملا دے۔ افرنگیوں کا شعلہ نم خوردہ ہے البتہ ان کی آنکھ صاحب نظر ہے اور دل مردہ!

انہوں نے اپنی ہی تلوار کا زخم کھایا ہے اور اپنے ہی خنجر کے بسمل ہو کر رہ گئے ہیں ان کی تاک میں سوز و مستی تلاش نہ کر۔ ان کے ادراک میں کوئی دوسرا عصر موجود موجود نہیں۔!

لیکن تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ زندگی سوز و ساز صرف تیری آگ سے ممکن ہے اور ایک تازہ عالم پیدا کرنا صرف تیرا ہی کام ہے!!

مصطفیٰ کمال جس نے تجدد کا گیت گایا تھا نقش کہنہ کو مٹا دینا چاہئے لیکن یاد رہے کہ کعبہ کا رخت حیات نیا نہیں ہو جائے گا خواہ وطن افرنگ لات و منات ہی لا کر کیوں نہ رکھدے!!

ترک کے لئے چنگ میں کوئی نئی آہنگ نہیں ہو سکتی اور وہ جس چیز کو تازہ کہتا ہے وہ افرنگ کا کہنہ یا پرانا ہو چکا ہے!

اس کے سینہ میں کوئی دوسرا دم نہیں اور اس کے ضمیر میں کوئی دوسری دُنیا موجود نہیں!

بے شک اس نے عالم موجود کے ساتھ سازگاری کی اور اس عالم کو اپنی آگ سے اس طرح پگھلا کر رکھ دیا۔ جس طرح موم پگھل جاتا ہے۔ تقدیم حیات تقلید سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی نہاد میں پہلو داریاں اور طرفگیاں اور تنوع رکھے گئے ہیں زندہ دل وہ ہوتا ہے جو زمانوں، عصروں اور دہور کا خالق ہو اور جس کی جان تقلید سے بے حضور ہو جاتی ہو اک دل، جگر موجود ہے تو مسلمانوں کی طرح اپنے ضمیر اور قرآن میں دیکھو گے کہ اس کی آیات میں ایک نہیں بلکہ سینکڑوں جہان تازہ موجود ہیں۔ اور اس کے ایک ایک لمحہ میں کئی زمانے پیچ و تاب کھا رہے ہیں اور اس کا ایک ہی جہان عصر حاضر کو بس کرتا ہے۔

اگر سینہ میں دل معنی رس موجود ہے تو اسے پکڑلے بندہ مؤمن خدا کی آیات و نشانیوں میں سے ہوتا ہے اور ہر جہان اس کے سینہ میں قبا کی طرح ہے اور جب یہ ایک جہان اس کے جسم پر قبا کی طرح پرانا ہو جاتا ہے تو قرآن ایک دوسرا ہی جہان اُسے عطا کر دیتا ہے۔ ؎

چوں کہن گردد جہانے در برش

می دہد قرآں جہانے دیگرش

زندہ رود

اُس وقت ہم خاکیوں کی کشتی کا کوئی ناخدا نہیں ہے۔ اور یہاں کوئی نہیں جانتا ہے۔ کہ یہ عالم قرآن کیا ہے؟

افغانی

وہ عالم قرآن ابھی ہمارے سینہ میں گم ہے اور یہ وہ عالم ہے جو ابھی کسی "قسم" کے انتظار میں ہے اس عالم میں رنگ و بو کا امتیاز نہیں ہے۔ اس عالم کی شام صبح افرنگ سے زیادہ روشن ہے وہ عالم سلاطین و عبید، شاہ و گدا راجہ پرجا، حاکم و محکوم سے پاک ہے اور جس طرح مؤمن کے دل کا کوئی کنارہ نہیں اسی طرح وہ عالم بھی بے کنار ہے وہ ایک خوبصورت عالم ہے جس کا بیج عمر فاروقؓ کی جان میں بو دیا گیا تھا! وہ لازوال ہے اس کی واردات نو بنو ہیں اس کے محکمات کے برگ و بار ہر دم نئے ہیں اس باطن کو تغیّر و تبدّل کا غم لاحق نہیں اس ظاہر ہر دم انکا سراپا انقلاب ہے اور وہ عالم تو تیرے اندر بھی موجود ہے آؤ اس کے محکمات کی تمہیں خبر دوں۔

محکماتِ عالم قرآنی

خلافت آدم - حکومتِ الٰہی - الارض لِلّٰہ - حکمت خیر کثیر کی - بابت افغانی کی تشریحات ::

رحیم بخش شاہین

تصوّر ریاست اقبالؒ کی نظر میں

مملکت کے جدید مغربی تصور کی نمایاں ترین خصوصیت لادینیت یا مذہب و اخلاق سے لاتعلقی اور بے اعتنائی ہے اور اس کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ اس کا آغاز سولھویں صدی میں ہوا۔ اور غالباً سب سے پہلے میکیاولی نے لادینی تصورِ حکومت کا علم بلند کیا۔ یہ وہ دور تھا جس میں یورپ میں شہنشاہیت اور پاپائیت میں جنگ زوروں پر تھی۔ خود کلیسا بھی بدنظمی اور انتشار کا شکار تھا۔ اس کے باوجود وہ لوگ جو عام انسانی اخلاق سے بھی عاری تھے۔ خدا کی مرضی کو نافذ کرنے والے اور بزعم خویش دُنیا میں خدا کے نمائندے بن کر حکومت کرنے کے دعویدار تھے مختلف اجتماعی اداروں کی اس باہمی کشمکش اور عیسائیت کے علمبرداروں کی کوتاہ اندیشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میکیاولی نے دین و دُنیا کی جدائی کو سیاسی مسائل کے حل کے طور پر تجویز کیا۔ اس نے کہا کہ مذہب و اخلاق نجی اور شخصی معاملہ ہے مملکت کو اس سے بالاتر رہنا چاہیئے۔ تاہم اگر مذہب و اخلاق سے سیاسی فوائد حاصل ہوں تو ان سے مدد لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میکیاولی نے قومی مقاصد کے لئے ہر قسم کی جعل سازی اور غیر اخلاقی حربے کو جائز قرار دیا۔ اس طرح مملکت جو قوت و اقتدار کی مالک ہوتی ہے۔ بے قید آزادئ عمل کی لذّت سے آشنا ہوئی۔ لیکن مملکت کے

ہمہ گیر اقتدار نے فرد کو قطعی بے دست و پا بنا کر رکھ دیا۔ قدرتی طور پر ضمیرِ انسانی نے جبر و تشدد اور حکمرانوں کے کلی اقتدار کے خلاف آواز بلند کرنا ضروری سمجھا۔ اسی عالم میں مارٹن لوتھر نے مسخ شدہ عیسائیت اور پادریوں کے تسلط ناروا کے خلاف آواز بلند کی جس سے پاپائیت کے قلعے میں زبردست شکست و ریخت ہوئی۔ اور مملکت کو مزید توسیع اقتدار کا بہانہ ہاتھ آیا لیکن صنعتی انقلاب کے بعد مطلق العنان حکمرانی کا دور تقریباً ختم ہو گیا۔ جدید جمہوری نظام کو فروغ ہوا جس میں فرد کی اہمیت پر زور دیا گیا۔

جدید سیاسی تصوّر کے اس تمام ارتقائی عمل میں وحی کو ہمیشہ نظر انداز کر دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں جدید معاشرہ کی تشکیل میں مذہب و اخلاق کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ دین و سیاست کو دو جداخانوں میں بانٹ دیا گیا۔ اقبال کو مغربی تصورِ مملکت کے اس پہلو سے شدید اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک دین کی رہنمائی کے بغیر سیاست اپنی ذمہ داریوں سے صحیح طور پر عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے تیرہ سو سال پیشتر اس حقیقت تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اسلامی معاشرہ میں دین و سیاست کی علیٰحدگی کا تصوّر ناقابلِ قبول ہے۔ اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے روح اور مادہ کی طرح ملک و دین کی دوئی کو ختم کر کے زندگی کی فطری وحدت و ہم آہنگی کو قائم رکھا ہے۔ اس نے اخلاق و اقتدار کو باہم مربوط رکھا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی نظم "دین و سیاست" میں مغربی طرزِ سیاست اور اسلامی نقطۂ نظر کی عکاسی کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ مغرب میں سلطنت اور کلیسا دو بالکل متوازی بلکہ حریف قوتوں کی حیثیت رکھتے تھے جس میں بالآخر سلطنت کو فتح حاصل ہوئی لیکن اس کا نتیجہ بھی کچھ اچھا نہ نکلا

دراصل اس مسئلہ کا بہترین حل حضور صلعم کے اُسوۂ حسنہ میں مضمر ہے کہ آپؐ نے سلطانی و درویشی کو یکجا کر کے انسانیت کی خدمت کا کارنامہ سرانجام دیا۔ ؎

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی مُلک و دین کے لئے نامرادی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے اک صحرا نشینؐ کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہو اک جنیدی و اردشیری

اس بات کو سمجھنے کے لئے کسی خاص قسم کی عقل کی ضرورت نہیں کہ جس طرح فرد کی قوتوں کو معاشرہ اور انسانیت کے لئے مفید بنانے کے لئے مذہب و اخلاق کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح جماعت اور مملکت کو بھی مذہب و اخلاق کی پابندیوں سے مفر نہیں اور جونہی وہ اس کے برعکس رویہ اختیار کرے گی وہ انسانیت کے حق میں انتہائی تباہ کن ثابت ہو گی۔ اقبال کہتے ہیں ؎

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جو سیاست دین و اخلاق سے بے نیاز رہنے کی کوشش کرتی ہے وہ "ڈبونے والی"

کی طرح ہے۔ یہ دیو جدھر رخ کرتا ہے تباہی اور بربادی ہمراہ لے کر جاتا ہے۔

اقبالؒ اپنی ایک نظم "لادین سیاست" میں کہتے ہیں ؎

مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادین
کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مُردہ ضمیر
ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیوِ بے زنجیر

اس لادین سیاست کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ یہ ابھی تک فرد اور جماعت کے حقوق و فرائض میں توازن قائم رکھنے سے محروم ہے انتہا پسندی اس کا شیوہ ہے اس طرزِ سیاست کے علمبردار کبھی فرد کی بے قید آزادی کا نعرہ لگاتے ہیں کبھی جماعت کو ہمہ مقتدر قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام نے فرد اور جماعت دونوں کے حقوق کو متوازن خطوط پر طے کرنے پر زور دیا ہے اور اس سلسلہ میں توحید کا اصول پیش کیا ہے۔ جس کی رُو سے انسان پر غیر مشروط اطاعت صرف خالقِ کائنات ہی کی فرض ہے۔ دُنیا میں کوئی فرد یا گروہ یا افراد اس لائق نہیں۔ کہ اس کو مطاعِ مطلق تصوّر کیا جائے۔ بلکہ فرد اور جماعت دونوں خدائے واحد کی اطاعت کی مکلّف ہیں۔

اقتدار کا نظریہ اس معاہدۂ عمرانی کے بالکل خلاف ہے جو لاک اور روسو ایسے مغربی مفکرین کے ذہن کی اختراع ہے جس کی رو سے عوام کی مرضی جو کثرتِ رائے سے متعین ہوتی ہے اقتدار کا سرچشمہ ہے۔ اس نظریہ کی اختراع میں یہ مفروضہ کارفرما ہے کہ اکثریت کی رائے ہمیشہ حق و صداقت پر مبنی ہو گی۔ اس حالت میں

تو بر نظر یہ اور بھی محل نظر ہے کہ اس رائے کی تشکیل میں وحیٔ ربّانی سے اخذِ فیض کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ انسانی ضمیر کی آواز جماعتی اغراض اور جذباتی فیصلوں کے بوجھ تلے دب جاتی ہے اور جماعت کے غلط فیصلوں کی اصلاح کی آخری گنجائش بھی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

اقبال نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں واضح کیا ہے۔ کہ اگر اقتدار یا حاکمیت کا ماخذ اصولِ توحید کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے انسانی ضمیر کی آزادی کا اصول بھی قائم رہتا ہے اور اس سے جماعت کی ترقی کی راہیں بھی مسدود نہیں ہوتیں۔ اس کے اعمال و افعال کی اصلاح کے امکانات ختم نہیں ہوتے پس اقتدار کا ماخذ ذاتِ باری ہے نہ کوئی فرد اور نہ کوئی جماعت چاہے وہ کسی خاص نقطہ نظر کے متعلق کتنی ہی اکثریت کیوں نہ رکھتی ہو۔ ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

توحید کے علمبردار معاشرے کے افراد کا فرض ہے کہ وہ مملکت اور جماعت کی غلط روی پر بے خوف ہو کر تنقید کریں جیسا کہ حضرتِ حسینؓ کی مثال سے واضح ہے۔ آپ نے آئندہ نسلوں کو حریت و آزادی کا سبق دیا ہے۔ خود خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عوام کے حقِ تنقید کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی۔

اقبالؒ نے اپنے مضمون "خلافتِ اسلامیہ" میں اسلامی تصورِ ریاست کے اس امتیازی پہلو پر بحث کرتے ہوئے حضرتِ ابو بکر صدیقؓ کا وہ خطبہ نقل کیا

ہے جو آپؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد ارشاد فرمایا۔ اس میں حضرت صدیق اکبرؓ نے واضح کر دیا کہ مسلمانوں پر ان کی اطاعت اس وقت تک واجب ہے جب تک وہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرتے رہیں۔ جس معاملہ میں وہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت سے انحراف کریں مسلمانوں پر ان کی اطاعت سے خالی نہیں۔ اس طرح اقبالؒ نے اسلامی طرزِ حکومت کا یہ اصول بیان کیا ہے کہ "(حکمران) کی شخصیت بھی شریعت وحی کی ازلی و ابدی حکومت کے اسی طرح ماتحت ہے جس طرح اور باقی مسلمانوں کی" مختصر یہ کہ مسلمان حکمران اور حکومت کی تمام سرگرمیاں اصولِ توحید پر مبنی شریعتِ حقہ سے منضبط ہوتی ہیں۔ شرعی حدود و قیود مملکت کے لئے ایک الباطالطار اخلاق مہیا کرتی ہیں جس کی موجودگی میں وہ اپنے حقوق و فرائض کا تعین کرتی ہے دوسری طرف شریعت اسلامی فرد کی حیثیت کا تعین بھی کرتی ہے۔ بقول اقبالؒ:-

"اخلاقیات اسلام کا تمام دارومدار اس واحد مسئلہ پر ہے کہ فرد من حیث الفرد کیا حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کا کوئی طرزِ عمل یا رویہ جو فرد کے آزادانہ ارتقاء و عروج کے راستہ میں حائل ہو وہ شریعت اسلامیہ اور اخلاقیات اسلام کے قطعاً خلاف ہے۔ ہر مسلمان اپنے افعال و اعمال کے لحاظ سے مختار و آزاد ہے بشرطیکہ خلافِ قانونِ وحی اس سے کوئی فعل یا عمل سرزد نہ ہو۔"

عہدِ حاضر کو علومِ عقلیہ اور سائنس کی عدیم النظیر ترقی پر بڑا فخر ہے۔ انسان زمان و مکان کی کئی منزلیں طے کر چکا ہے لیکن اس تمام ترقی و عروج کے باوجود، ابھی تک ایک ایسے اجتماعی و سیاسی نظام سے بہرہ ور نہیں جو زندگی کو عدل و امن اور خوش حالی و مسرت

کی نعمت سے بہرہ ور کر سکے۔

علامہ اقبالؒ کے تصورِ ریاست کے سلسلے میں بتایا جا چکا ہے کہ وہ جدید مغربی تصور جس میں مذہب و اخلاق سے بے اعتنائی کو راہ دی گئی ہے۔ ناپسند ہی نہیں، بنی نوعِ انسان کے لیے نقصان دہ قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک دُنیا کی رہنمائی کے بغیر سیاست اپنی ذمہ داریوں سے صحیح طور پر عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جبکہ اسلامی معاشرے میں دین و سیاست کی علیحدگی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اسلام نے ملک و دین کی جدائی ہی کو ختم کر کے اخلاق اور اقتدار کو باہم مربوط کیا جب کہ مغربی تصورِ سیاست کے تحت انسانی ضمیر کی آواز جماعتی اغراض اور جذباتی فیصلوں کے بوجھ تلے دب جاتی ہے اور جماعت کے غلط فیصلوں کی اصلاح کی آخری گنجائش باقی نہیں رہتی۔ علامہ اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر اقتدار یا حاکمیت کا ماخذ اصولِ توحید کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے انسانی ضمیر کی آزادی کا اصول بھی قائم رہتا ہے۔ یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور ریڈیو سٹیشن سے علامہ اقبالؒ کا جو پیغام نشر کیا گیا اس میں آپ نے فرمایا تھا۔

اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دُنیا میں قدرِ حریت و شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا جن نام نہاد مُدبروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سپرد کی گئی ہے وہ خونریزی سفاکی اور زبردست آزادی کے دیوتا ثابت ہوئے ہیں جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق

انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں۔ انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی و عملی سطح کو بلند کریں۔ انہوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا صرف اس لیے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اقبال کے تصورِ ریاست کو نہ تو سرمایہ دارانہ جمہوری نظام سے کوئی تعلق ہے نہ یہ اشتراکی آمریت و استبداد سے موافقت رکھتا ہے۔ اور نہ اس کو فاشزم یا نازی ازم سے کچھ واسطہ ہے بھر اس تصور کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ وطنیت و قومیت کے جدید تصور کی بھی تردید کرتا ہے جس نے لادینی تصورِ ریاست کو استحکام مہیا کیا۔

جب مذہب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تو کسی ایسے مسلک یا نظریہ کی ضرورت محسوس ہوئی جو مذہب کی جگہ لے سکتا۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے قومیت کو اپنا یا گیا۔ یہ نظریہ انسانی سعی و جہد کو وسیع تر انسانی اور روحانی نصب العین کی بجائے قوم اور وطن کے مفادات میں محدود کر دیتا ہے۔ اس نے نہ صرف مغربی عیسائی معاشرے کو ٹکڑے ٹکڑے کر بلکہ دُنیا کے دوسرے معاشروں کو بھی متاثر کیا۔ اس نظریہ نے انسانیت کے ارتقا کی فطری منزل سے انسان کی توجہ ہٹانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ وہی منزل ہے جس کی نشان دہی اسلام نے نسلی یا قومی امتیازات کی تردید سے کی۔ اقبال کہتے ہیں کہ "ملتِ اسلامیہ کے تمام اساسی اصول فطرتِ انسانی پر مبنی ہیں کہ کسی خاص قوم کے خصوصیاتِ نسلی پر۔ ایسی قوم کا اندرونی رابطہ و ضبط کسی نسلی یا جغرافیائی اتحاد پر قائم نہیں ہو سکتا نہ ہی زبان

اور تمدنی روایات و تجارات پر۔" اپنے مضمون "خلافتِ اسلامیہ" میں اقبالؒ نے واضح کیا ہے کہ اسلام کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ تمام نسلوں اور قوموں کے آزادانہ اتحاد و اختلاط سے ایک نئی جامع فضائل و کمالات قوم پیدا کی جائے۔" اور زمانے کی رَو بتا رہی ہے کہ بھٹکے ہوئے انسان کے غلط اقدامات کے باوجود انسانی فطرت اسی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اور وہ دن دُور نہیں جب ساری دنیا عملاً اسلام کے فطری اصولوں پر متحد و مجتمع ہو جائے گی۔

"زمانہ حال کی سیاسی جماعتوں کی زندگی کا نشو و نما زیادہ تر آئین و حکومت کے مشترک اصولوں پر مبنی ہو رہا ہے یہ مختلف و متعدد نظام آئے دن اس طریق پر وسعت پکڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے سے قریب ہوتے جاتے ہیں کہ بالآخر کسی وقت ایک دوسرے میں جذب و مربوط ہو کر ایک ہی صورت و شکل میں رونما ہوں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ایسے عالمگیر نظام کا قائم ہونا انفرادی سلطنتوں کے حقوق اقتدار کے منافی نہیں ہو سکتا، لہٰذا نتیجہ یہ ترتیب ہوا کہ ایسے نظام کی تعمیر کی بنیاد دُنیا کی مادی قوتوں پر کھڑی نہیں ہو گی اس کا تمام تر دار و مدار ایک منتہائے مشترک و واحد کی روحانی قوت پر ہو گا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؒ کے نزدیک ریاست و مملکت بذاتِ خود مقصود نہیں بلکہ ایک عظیم تر بلند نصب العین کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ نصب العین عالمی اخوت کا قیام اور دین اسلام کا غلبہ ہے۔ یہ نصب العین اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک زندگی کے تمام شعبوں کو خالق کائنات کے بتائے ہوئے لازوال اور ناقابل تغیر اصولوں کے مطابق استوار نہ کیا جائے۔

یہ وہ اصول ہیں جو وحی کی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے جو قرآن مجید کی صورت میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو چکے ہیں اور جن پر حضور صلّے اللہ علیہ وسلم اور ان کے تربیت یافتہ خلفاء رضی اللہ عنہم نے بطریقِ احسن عمل کر کے دکھایا۔ اس اعتبار سے ان کا پسندیدہ نظام "خلافت" قرار پاتا ہے۔ جس کی تشکیل و تعمیر میں خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں۔ اور "ارمغان حجاز" میں کہتے ہیں ؎

خلافت بر مقامِ ما گواہی است
حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ!
خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است!

⁂

محمد نواز خان سیال

اقبالؒ ۔ حرکت و عمل کا پیامبر

مفکر اسلام علامہ اقبالؒ کی شاعری کا اہم ترین اور عظیم ترین عنصر حرکت و زندگی ہے۔ شعرِ اقبالؒ کا حسن و امتیاز اور اس کے پیغام کی سطوت و صولت اسی حرکت و عمل کے جمال سے مستنیر اور جلال سے آفاق گیر ہے۔ روزِ آفرینش سے لیکر آج تک جن قوتوں نے فکرِ انسان کو موجودہ عروج تک پہنچایا ہے وہ فقط تین قوتیں ہیں علم و حکمت و جذب و شوق اور سعی و عمل۔ انسان کے ارتقاء کی تاریخ دراصل انہی عناصر کی ارتقائی تاریخ ہے۔

حکیم الامتؒ کا کہنا ہے کہ انسان کو اس کائناتِ ارضی پر بے مقصد جنت سے نکال کر نہیں بھیجا گیا۔ ارشادِ خداوندی سیروفی الارض کے مطابق اقبال انسان اور خاص کر مسلمان سے کہتا ہے کہ اس دُنیا کو غور سے دیکھ کہ ہر شئے میں تیرے لئے بہت کچھ فائدے اور عبرت کے سامان ہیں تو تسخیر و مشاہدہ کائنات کے لئے پیدا کیا اور بھیجا گیا ہے۔ سو اقبالؒ نے اپنے کلام بلاغت نظام میں اس گلشنِ کُن میں سے چند ایک اشیاء کو بطور علامات استعمال کیا ہے اور ان کی ہر علامت حرکت، تحریک، حرارت اور زندگی کی حامل ہے۔

ہر وہ شئے جس میں زندگی کی رمق پائی جاتی ہے۔ اقبال کو اپنی طرف متوجہ

کر لیتی ہے کہ یک شب تاب یا جگنو ایک معمولی سا کرم ہے لیکن اپنی حرارت اور نورِ زند کے سبب اندھیرے میں خضرِ راہ بن جاتا ہے۔

اقبالؒ کے ہاں شاہین ایک امتیازی مقام رکھتا ہے جو زمین کی پستی کی بجائے آسمانوں کی بلندیوں پر نگاہ رکھتا ہے اقبال کا شاہین زورِ قوت، تیزی، وسعت نظری، بلند پروازی و سخت کوشی کے ساتھ دنیوی اغراض سے بے نیازی، قلندری و خودداری اور فقر و غنا کی صفاتِ عالیہ سے متصف ہے۔ شاہین اپنی ان اصلی خصوصیات کا مالک ہونے کے سبب پرندوں کی دُنیا کا درویش کہلاتا ہے اور اس کی فلک سیر اڑان دراصل اس کی روحانی بلند پرواز کا دوسرا نام ہے۔ اس فقر کی صفات کے حامل کو اقبال نے اپنے نوجوانوں کے لئے نمونہ بنایا ہے۔ کیوں کہ شاہین کے نزدیک ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام۔ شاہین کی زندگی اتنی متحرک ہے کہ اسے شب میری کے لئے آشیاں بنانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔

پرندوں کی دُنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

علامہ اقبال کے ہاں عشق کسی مہ جبین سے تعلق کا نام نہیں، بلکہ عشق وہ اعلیٰ و ارفع قدر ہے جو انسانیت کی تمام اعلیٰ قدروں پر حاوی ہے۔ عشق حیات افروز اور زندگی بخش جذبہ کا نام ہے۔ عشق سراپا حرکت و عمل ہے اور سکون و جمود کا دشمن ازلی ہے۔ بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑنے کے جذبہ صادق کا نام عشق ہے۔ عشق وہ کارنامے سرانجام دے چکا ہے کہ عقل

ابھی تک لبِ بام محوِ تماشا ہے۔ عشق گرمیِ دل اور جذبہ کامل ہے جس سے مالامال ہو کر انسان ایک بلند، روشن، پاکیزہ اور باعمل اور صحتمند زندگی بسر کرتا ہے۔ عشق اصلِ حیات ہے اور نورِ حیات اور نارِ حیات اسی جذبہ پاکیزہ سے روشن ہے۔ ؎

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

ملتِ اسلامیہ کے حدی خوان علامہ اقبالؒ کی دنیائے فکر میں صحرا کا تصور ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ صحرا کی وسعت حدِ نگاہ کے پار تک پھیلتی اور بڑھتی گئی ہے۔ قدرت نے انسان کو صحرا کی صورت میں آرزوؤں کی تگ و دَو کے لئے ایک وسعت بے پناہ اور روح کی تسکین کیلئے ایک خلوتِ بے کنار عطا فرمائی ہے۔ دشت یا صحرا میں صبح کا سماں ان یخ گانہ، کیفیت کے باعث اہلِ بصیرت کے واسطے ہزار سودا در قلب و نظر کی زندگی کا حاصل ہے (۱) صحرا ممکنات زندگی کی بے حد وسعتوں کی علامت ہے۔ (۲) ذوقِ سفر اور سرعتِ رفتار جو صحرا کی وسعت ہی سے مخصوص ہے (۳) وہ حرارت جو صحرا کے آتشناک سینے سے زندگی بن کر ابلتی ہے اور صحرائیوں کو پیام تگ و تاز دیتی ہے۔ (۴) وہ پیغامِ حیات افروز جو پیغمبرِ عربی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے درماندہ اور مایوس انسانیت کو دیا۔ اور کیفیت کاروانِ ملتِ اسلامیہ جو صحرا کے سینے سے نکل کر جادہ عالم پر رواں ہوا۔ اور اپنے نقوش پایہ تہذیب و تمدن کی نئی

بستیاں آباد کرتا گیا۔ خضرِ راہ سے ایک شاداب گلستان صحرا کا نظارہ کریں شاید کہ چشمِ بصیرت وا ہو۔ ؎

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگا پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

اقبالؒ کا محبوب پھول گُل لالہ اس کے گلشن شاعری میں اس کثرت سے کھلا ہے کہ چراغ لالہ سے کوہ و دمن روشن ہو گئے ہیں لالہ صحرا حرارت زندگی کا زمینی مظہر ہے اور سوز دروں و زندگی کا مجسمہ ہے اقبال اس شعلہ سینائی سے ملتِ اسلامیہ کے ہر فرد کو شہید جستجو کرنا چاہتے ہیں۔ وسیع صحرا میں یہ نرم و نازک پھول اپنی نمود ہستی کی خاطر سرکشاں کھڑا بگولوں اور بادِ صرصر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ ؎

بھٹکا ہوا راہی میں بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

اقبالؒ نے اپنی زندگی کو ایک سفر مسلسل سے تشبیہہ دی ہے۔ اس کے ہاں تصور سفر وہ حرکت پیہم ہے جس کا مقصود تسخیر کائنات ہے اور سفر حرکت اور حضر یعنی منزلِ سکون موت کا دوسرا نام ہے کائنات کا ذرہ ذرہ حرکت سے زندہ اور عمل سے ہر سو انقلاب و تغیر برپا ہے ؎

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوق پرواز ہے زندگی

اقبالؒ کا مسافر منزل او ر آرام سے نا آشنا ہے۔ وہ ایک دُنیا تسخیر کرنے کے

بعد کسی دوسرے جہان کو مسخر کرنے کے لئے سفر جاری رکھتا ہے کہ وہ زندگی کی امکانی بلندیوں اور صحرا اس کی بے نہایت وسعتوں کی علامت ہے۔ اِن دونوں منزلوں کی تسخیر کے بعد شاعر کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھتی ہے۔ اس کی نگاہِ دُوربیں ماہ و خورشید سے بھی آگے ایک نئی دُنیا نہیں بلکہ کئی دُنیا ئیں دیکھتی ہے۔ اور اس کی ہمتِ مردانہ عالم رنگ و بو کو چھوڑ کر ان دُنیاؤں کی تسخیر کی دعوت دیتی ہے۔ ؎

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

ہر لحظہ نئے زمان و مکان کا متلاشی شاعر زندگی موت سے متعارف ہی ہیں۔ موت اگر کہیں ہے بھی تو اس کے نزدیک نشانِ منزل کے سوا اس کی کوئی حقیقت نہیں کہ اس منزل پر پہنچ کر زندگی نئی قبا بدل لیتی ہے۔ اور اقبال اسے تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام دیتا ہے۔ بیج کبھی دانہ کبھی پودا کبھی تنا اور درخت اور کبھی پھول کے روپ میں زندگی کا سفر جاری رکھتا ہے۔ ؎

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

شاعر اعظم نے نورِ سحر اور شفق شام سے اپنے کلام کو وہ رعنائی اور زیبائی بخشی ہے کہ دُنیائے شاعری میں اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ شعر اقبال میں نمودِ صبح اول تا آخر نمودِ زندگی کی علامت ہے۔ اور شام،

ایک حسین لطیف وقفہ ہے جو اس نمود کی بار بار تجدید کرتا ہے۔ اور صبح کے ساتھ ہی ایک خفتہ کائنات کا ذرہ ذرہ ہنگامۂ محشر بن جاتا ہے۔ ایک مقام دل کش ملاحظہ فرمادیں کہ چشم بصیرت وا ہو جاتی ہے توسیع زندگی کی اس سے بہتر مثال شاید ہی مل سکے۔

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامن آفاق سے دھوتی ہے صبح

حرکت و حرارت جن سے زندگی عبارت ہے یہ دو خوبیں شاعر مشرق کے ہاں بڑی شدت اور کثرت سے جلوہ گر ہیں۔ اور یہی زندگی کی علامت ہے۔

---

۱۲۸ صفحہ کا بقیہ

اقبال عشق کو لازمۂ حیات قرار دیتے ہیں اور خصوصاً نوجوانوں کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ وہ اپنی ذات میں عشق کا عنصر بیدار کریں۔ یہ عشق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات سے ہو اُن کے اسوۂ حسنہ سے ہو اگر نوجوانوں نے ایسا کر لیا تو وہ اپنے لئے ایک نیا جہاں پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ نوجوانوں سے اس طرح مخاطب ہیں۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

عثمان علی خان

اقبالؒ اور جمہوریت

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

اقبالؒ کا کلام روحِ اسلام کے لئے الفاظ کا جسم فراہم کرتا ہے۔ مگر نادان اسلام پسند اُسے عاشق، مجذوب شاعر اور فلسفی کہتے ہیں اور یوں محض یہ کہ اس کے کلام کے مطالعہ کا حق بزعمِ خود ادا کر ڈالتے ہیں جب کہ نام نہاد "ترقی پسند" اسے اشتراکی اور ڈکٹیٹر پسند جذباتی قرار دیتے ہیں۔ سبھی ماہرِ فطرت بنتے ہیں ؎

ولیکن کس نہ دانست ایں مسافر
چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود

اس طرح سب نے حقیقت سے آنکھیں موند لی ہیں۔

دینِ اکمل اسلام اصل میں ایک وحدت لاینجزی ہے بحث کی خاطر ہم مان لیتے ہیں کہ یہ دستور اور مذہب دو اجزاء پر مبنی ہے جس طرح انسان جان اور جسم دو اجزا پر مشتمل ہے دستور قومی اور اجتماعی ہے اور قائم یعنی مقتدر رہنے کے لئے ہے۔ مذہب انفرادی ہے اور دستور کے قیام سے مذہب تو قائم ہو سکتا ہے مگر مذہب اولیت پا کر دستور کو قائم یا مقتدر نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ بغیر دستور کے مذہب ایک لاش ہے۔

دین اکمل اسلام والے لوگ ایک صدی ٹھیک رہنے کے بعد دستور سے غدّاری کرکے 'خالی مذہب' کے پجاری بن کر رزم گاہ حیات میں لمبی تان کر سو گئے۔ ہم مشربانِ اقبالؒ اور اقبالؒ کئی کئی صدیوں کے بعد پیدا ہو کر انہیں جگانے کی کوشش کرتے رہے اس ضمن میں ماضی قریب میں دو شخص حالیؔ اور اقبال قریباً اکٹھے آئے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے ملاقات بھی کی۔ اسلام کی شاہراہ پر انہیں غائبانہ یا حاضرانہ کچھ اور ہم سفر مثلاً جمال الدین افغانی، سید محمد خان سلیمان ندویؒ، ظفر علی خان، محمد علی جوہر وغیرہم بھی ملے مگر اقبالؒ اُن میں بدرالدجیٰ ہو کر چمکے۔

اقبالؒ جب اشتراکیت اور مغربی جمہوریت کے بطن میں اسلام کے بیج کی نشاندہی کرتے ہیں تو اشتراکیت اور مغربی جمہوریت کے شیدائی "کالے لوگ" اقبالؒ کے متعلق یہ گمان کرنے لگ جاتے ہیں کہ اقبال اشتراکیت اور مغربی جمہوریت کے تند مزاج اور جذباتی عاشق ہیں کبھی روٹھ کر اسے بے نقط سنانے لگ جاتے ہیں اور کبھی پھر اس کا طواف کرنے لگ جاتے ہیں۔ ع

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اقبالؒ نے خود آپ بھی اپنا مطالعہ کرنے کی کوشش کی۔ ابتداء میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ؎

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

لیکن جب دریائے حیرانی کو پار کر چکے اور حیرت سے قرار آ گیا

متاع گراں مایہ اپنے دامن چھپائے رکھتا ہوں۔ حالات مساعد پاؤں تو دُنیا کو دکھاؤں اگر حالات مساعد نہ ملے تو اقبالؒ کو خیالات ناگفتہ کا ایک متحرک مزار سمجھ لیجئے گا۔"

("امروز" لاہور ۳۰ جنوری ۱۹۷۷ء صفحہ آخر کالم آخر)

میں تو بسا اوقات قحط خریدار سے تنگ آجاتا ہوں۔ میں تو اپنا سامان یعنی قاش ہائے دل صد پارہ ایسے وقت بازار میں لے کر آیا جب سوداگروں کا قافلہ رخصت ہو چکا تھا۔"

سرکشن پرشاد کے نام خط

(بحوالہ امروز ملتان ۳۰ جنوری ۱۹۷۷ء)

وہ اسلام کے والہ و شیدا تھے۔ اس لئے ملائیت کے دشمن تھے (توبہ ۳۱/۹) وہ قرآن حکیم کی حج الہٰ پر عمل درآمد چاہتے تھے جس کی مختصر تشریح یوں ہے:۔

اسلام کی سیاسی مساوات یا سلطانی جمہور قائم کرنا جس میں چند سو منتخبہ ارکان نہیں بلکہ جمیع المسلمین جمعہ کے جمعہ اپنے اپنے علاقائی حاکم کے زیر امامت و خطابت جمعہ میں مرکز کی جاری کردہ قرآن و سنت کی ہدایات سیاسی ہدایات، معاشرتی ہدایات، اقتصادی ہدایات نافذہ صورت میں سن لیا کریں اور عند الضرورت خطبہ روک کر علاقائی حاکم سے یا علاقائی حاکم کی وساطت سے مرکزی حاکم سے یا براہ راست ہی مرکزی حاکم سے اپنا اعتراض اپنی تجویز اپنا سوال کہہ کر جواب طلب کر لیا کریں۔ ظاہر ہے یہ سب دین کی روشنی میں اور مسجد کی فضا میں اللہ کی حضوری میں فی سبیل اللہ ہوگا۔

فی سبیل اللہ بغض نہیں۔ اسے خلافت بنو آدم اور سلطانی جمہور کہتے ہیں۔ اسی کو اَلْمُلکُ لِلّٰہِ (حکومت اللہ کی ہے) کہتے ہیں۔ کوئی شخص فرعونی طرز کا حاکم نہیں ہو سکتا بلکہ جمہور (حکومت الٰہیہ کو جواب دہ اور حکومت جمہور کی وساطت سے اللہ کو جواب دِہ ہے۔ ؎

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

۲۔ نظام زکوٰۃ و صدقات اور نظام "قُلِ العفو" کا قیام ؎

جو حرف "قُلِ العفو" میں پوشیدہ ہے ابتک
اِس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

یہ نظام اگر بیسویں صدی عیسوی میں بروئے کار ہوتا تو دُنیا کمیونزم اور سوشلزم (بے خدا) کی طرف نہ جاتی اس کی طرف آتی اور نظام صلوٰۃ اگر ہوتا تو مغربی جمہوریت کی طرف نہ جاتی۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا نظام توڑ کر ہم نے دُنیا کا قبولِ اسلام خود روکا اور مغرب کے دیتے ہوئے اس کھلونے پر خیال رہے۔ کہ "ایک عمرؓ اور ہوتا تو ساری دُنیا مسلمان ہو جاتی"

۳۔ اچھے کام قوم سے حکماً کروانے اور بُرے کام قوم سے حکماً رکوانے کا کام۔

یہ کام حکومت کے کرنے کرانے کے ہیں ملّا کے نہیں۔ علماء اگر موجود ہیں تو حکومت اسلام انہیں بلند سرکاری مناسب پر فائز کرے گی۔

اقبالؒ نے اسلامی مملکتوں سے مایوس ہو کر فرمایا:۔

؎ مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر

ع ہو اپنے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا

ع وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا

سب سے پہلے قوم کو حاضر و موجود کی مذمت کرنی پڑے گی اس کا خاتمہ کرنا ہوگا۔

ع بُتانِ حاضر و موجود تا چند؟

ے ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

ے گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اوّل آں بُنیاد را ویراں کنند

ے ہر ہلاکِ امّت پیشیں کہ بود = زانکہ بر جندل گماں بردند عُود

پھر ح اہم کے پہلے جز قیام صلوٰۃ یعنی مولوی صاحباں کی امامت و خطابت، کہ جگہ حکّام کی امامت و خطابت لانی ہے تا کہ اللہ کی مخاطب جماعت ذ یاایہا الذین آمنوا عملی طور پر معرض وجود میں آجائے ے

شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن

ے سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

ؔ تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گذر

ؔ غلط نگر ہے تری چشم نیم باز اب تک
کہ ہے قیام سے خالی تری نماز ابتک

پھر ہر طرح کی فرقہ بندی جغرافیائی سیاسی، دستوری مذہبی کا خاتمہ کرنا ہے۔ تاکہ یا ایھا الذین آمنوا کو ثبات ملے۔ ع
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی۔

اور مسلمان تو پھر یہی ہوتی ہے! اس وقت تو مائدہ ۴۴ کے مطابق ہم مسلمان ہی نہیں ہیں۔ ؎

مصلحتاً کہہ دیا میں نے مسلماں تجھے
تیرے نفس میں نہیں گرمیٔ یوم النشور

ؔ یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا۔

٭٭٭

عبدالغفار نظمی

اقبالؒ کا تصورِ عشق

اقبال کوئی روایتی شاعر نہیں تھے اور نہ ہی وہ شاعری کی تہمت کے متحمل تھے۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں قوم انہیں شاعر سمجھ کر ان کے کلام کو ضائع نہ کر دے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

اقبال نے شاعری تحسین و آفرین کے پھول سمیٹنے کے لئے نہیں کی بلکہ اپنی طبیعت کے اقتضاء کے تحت انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے، جو کہ ان کے قلب کی انتہائی گہرائیوں کی مظہر ہے۔ اپنی قوم کو ایک ایسا پیغام دیا ہے جس سے وہ دونوں جہاں میں سرخرو اور سربلند ہو سکتے ہیں۔ تمام علوم و فنون اس وقت تک نامکمل اور ادھورے ہیں جب تک ان میں خلوصِ دل شامل نہ ہوں خلوصِ دل ہی ہر فن اور علم کو ہدایت بخشتا ہے ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اس شعر کے خالق نے اپنے اشعار اور اپنی پوری شاعری کو بھی خونِ جگر دے کر صرف اس لئے ابدیت کے مقام پر فائز کیا ہے کہ ان کی قوم ان کے کلام

کا بغور مطالعہ کرے اور ان کے خونِ جگر سے رقم ہونے والے اشعار میں ان کا جو ازلی و ابدی پیغام پوشیدہ ہے اس پر عمل کرے۔ ع

کر کسی سینۂ پُرسوز میں خلوت کی تلاش

یوں تو اقبال کے کلام میں بہت سے نظریات پیش ہوئے ہیں مثلاً نظریۂ خودی، نظریۂ ملت، نظریۂ مومن اور نظریۂ آرزو وغیرہ۔ لیکن ہم یہاں اقبال کے صرف "تصورِ عشق" سے بحث کریں گے۔

اقبال کے یہاں "عشق" کا تذکرہ اکثر ملتا ہے اور جہاں کہیں یہ تذکرہ ہے وہاں کم و بیش اس کا "عقل" سے موازنہ کیا گیا ہے اور "عشق" کی برتری کو بڑے استدلال کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ عقل کا مفہوم اقبال کے قریب یہ ہے کہ عقل کے اجزائے ترکیبی حواس خمسہ میں ہیں۔ حواس خمسہ کی مدد سے ہم کسی چیز کے بارے میں جو فیصلہ صادر کرتے ہیں، اسے ہم عقل کہتے ہیں لیکن عقل ہماری کامل رہنما نہیں ہے۔ بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں عقل کی ہدایت کا چراغ گُل ہو جاتا ہے۔ اور وہ گنگ ہو جاتی ہے۔ جب آتش نمرود میں کودنے کا مرحلہ ہو تو سوائے اس کے کہ عقل تذبذب کا شکار ہو جائے، سود و زیاں کے پیمانے سے سوچے یا بزدلی کا فوری فیصلہ صادر کر دے کچھ نہیں کر سکتی۔ پھر عقل ہماری مادی بیماریوں کی معالج تو ہے لیکن ہماری روحانی بیماریوں کا عقل کے پاس کوئی علاج نہیں۔ اگر اس کے لئے ہم نے عقل کا سہارا لیا تو مرض بڑھتا ہی جائے گا۔ اسی لئے اقبال کہتے ہیں۔

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے۔

خرد کیا ہے چراغ رہ گذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہ گذر کو کیا خبر ہے

عقل کی دُنیا محدود ہے۔ فلسفہ بھی جس کی ابتداء حیرت سے ہوئی وہ بھی زندگی کی اصلیت اور گتھیوں کو سمجھنے سے نہ صرف قاصر رہتا ہے بلکہ مجسم حیرت بن جاتا ہے ؎

انجام خرد ہے بے حضوری | بے فلسفہ زندگی سے دُوری
ہیگل کا صدف گہر سے خالی | ہے اس کا طلسم سب خیالی

انکشاف رازِ ہستی عقل کی حد میں نہیں ؎
فلسفی یاں کیا کرے اور سارا عالم کیا کرے

جہاں تک عشق کا تعلق ہے۔ عشق دراصل اقبال کے فلسفۂ خودی کا ہی ایک رخ ہے۔ خودی کا مختصر مفہوم اقبال کے نزدیک یہ ہے کہ خودی حیات کا دوسرا نام ہے۔ خودی یقین کی گہرائی ہے۔ ذوقِ تخلیق، عرفان ذات ہے۔ سوزِ حیات ہے۔ اس لئے اقبال خودی کی تعلیم کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں نوجوانوں کو خصوصاً خودی کے گوہر سے مزین ہونا چاہیئے۔ تربیت خودی کی وہ اس طرح تبلیغ کرتے ہیں۔ ؎

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اپنی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر

خودی دراصل ان قوتوں کی بیداری کا نام ہے جنہیں فطرت نے انسانی ذات کے لئے جنم دیا ہے۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

عشق جسے سچی لگن اور وجدان کا نام بھی دیا گیا ہے انسانی عمل میں دوام پیدا کرتا ہے انسان کو زمان و مکان کی قید سے نجات دلاتا ہے اور ذات کی تکمیل کرتا ہے۔ یوں خودی کی تکمیلِ عشق سے ہوتی ہے۔ اقبال کے خیال میں یہ موجودات سب کچھ عشق ہی کا کرشمہ ہے اقبال کے اس خیال سے دوسرے شعراء نے بھی اتفاق کیا ہے:۔

"یہ عشق وہ بلا ہے کہ حسنِ ازل کو بھی تخلیق کائنات پہ مجبور کر دیا"۔
(جگر مراد آبادی)

لایا ہے میرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتئ رازِ نہاں ہوں (میر تقی میر)

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں۔ (غالب)

اقبال کے نزدیک عشق میں فنا ہو نا ہی حیات کی تکمیل ہے۔ عشق ہی وہ جذبہ ہے جس کی بدولت حیاتِ جاودانی نصیب ہوتی ہے اور یہ عشق ہی ہے جو انسان کو زیست کی بلند ترین ارتقائی منزلوں تک پہنچاتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کہتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک عشق اس فطری میلان بقا اور ارتقا کا نام ہے جو قلب انسانی میں نہیں کائنات کے ذرے ذرے میں موجود ہے۔" (روح اقبال)

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔

"عشق مجاز و حقیقت دونوں پر حاوی ہے اور خودی کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے۔ عشق سے اقبال کی مراد وہ جوش وجدان ہے جو ایک قدر (VALUE) کی حیثیت رکھتا ہے جس کے تانے بانے سے ذات اپنی قبلے صفات بناتی ہے۔" (روح اقبال)

اقبال نے اپنے کلام میں ہمیشہ عشق کو عقل پر فضیلت دی ہے۔ علم و عشق کا یہ فرق ان کے درج ذیل شعر سے بڑی اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے ؎

علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

ایک اور جگہ وہ کہتے ہیں۔ ؏

علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

عقل و عشق کا ایک اور جگہ اقبال اس طرح تقابل کرتے ہیں

؎ بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

؎ گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور = چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے۔

اس ضمن میں خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں

عقل تشکیک میں گرفتار رہتی ہے۔ اور دل ایمان کا طالب ہوتا ہے

عقل نصح و خرد اور ننگ و نام کے پیمانوں سے سوچتی اور احتیاط برتنے کی تلقین کرتی ہے اور عشق پروانے کی طرح شمع پر گرتا ہے۔"

(فکر اقبال)

عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:۔

"عملی زندگی میں جو خطرناک مہالک پیش آتے ہیں ان کے مقابلے کے لئے جس جرأت، استقامت اور جانبازی کی ضرورت ہوتی ہے وہ عقل میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ عشق آگ میں نہایت بے باکی سے کود پڑتا ہے لیکن عقل دیکھ بھال میں رہ جاتی ہے۔"

(اقبال کامل)

اقبال نے عشق پر بڑا زور دیا ہے اور حیاتِ انسانی کے لئے اسے بڑا ناگزیر سمجھا ہے۔ لیکن انہوں نے جس عشق کی تبلیغ و اشاعت کی ہے وہ عشق حقیقی ہے۔ عشق کے لئے انہوں نے جس آئیڈیل کو تلاش کیا ہے وہ رہبر کامل۔ جامع الصفات، رحمۃ للعالمین، فخر موجودات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفےٰ، عقل تمام بولہب

اسی لئے "جواب شکوہ" میں عقل اور عشق کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے واضح طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کا رشتہ استوار کرنے ہی میں دونوں جہان کی شہنشاہیت کی ضمانت دی ہے۔ ۵

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری

مرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری

ماسوی اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری

تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

خودی اور طریقت کی ہم آہنگی اقبالؒ کو پیر رومی نے سکھائی اور عقل و عشق کا صحیح امتزاج بھی انہوں نے حضرت رومی قدس سرہ سے اخذ کیا۔ گو کہ دانشورانِ مغرب کے افکار و خیالات کا بھی انہوں نے کافی مطالعہ کیا اور کسی حد تک ان سے بھی متأثر ہوئے۔ بقول نیاز فتحپوری۔

"شوپنہار قنوطیت پسند تھا۔ اس لیے وہ بالکل متأثر نہ کر سکا کانٹ نے محض شعوری زندگی پر زور دیا۔ خارجی و عملی زندگی پر نہیں اس لئے اقبال اس سے بھی مطمئن نہ ہوئے۔ برگساں کو انہوں نے زیادہ پسند کیا کیوں کہ اس نے عملی ارتقا کا سبب خود جوشِ حیات کو قرار دیا۔ جس میں جذبۂ جستجو و تمنا بھی پایا جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات اقبال کو زیادہ پسند آئی لیکن دل کی وہ لگن جو زندگی کی تمام عنایتوں کو وا شگاف کر دیتی ہے۔ انہیں صرف رومی کے ہاں ملی۔"

(نگار پاکستان۔ شمارہ جنوری ۱۹۶۵)

عشق کے بارے میں اگر اقبال کے خیالات دیکھنے ہوں تو ان کی نظم مسجد

قرطبہ" کا مطالعہ کیا جائے۔ اقبال نے اپنی اس نظم میں جس طرح عشق کی کار فرمائی کو اجاگر کیا ہے۔ وہ ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اس نظم سے ایک طرف تو خود شاعر کی اپنی ذات میں عشق کا جو طوفان موجزن ہے اس کی عکاسی ہوتی ہے اور دوسری طرف اس نظم کے اشعار سے اقبال کا عشق کے بارے میں جو نقطۂ نظر ہے وہ اظہر من الشمس ہوتا ہے۔ عشق ایک لازوال ازلی وابدی حقیقت ہے عشق اَنمٹ ہے عشق کبھی فنا نہیں ہوتا ہے۔ عشق ہمیشہ تابندہ وجاوداں رہتا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ جس طرح عشق کبھی فنا نہیں ہوتا ہے اسی طرح عشق کے آثار و مظاہر بھی فنا نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح عشق کے آثار و مظاہر بھی فنا کے بعد حیات دوام اور نقش جاوداں حاصل کر لیتے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسولؐ عشق خدا کا کلام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

اقبال نے اپنی نظم "ذوق و شوق" میں بھی عشق کے مراتب واضح کئے ہیں اور بتایا ہے کہ روزگارِ حیات میں حق و باطل کے جتنے معرکے ہوئے ہیں

ان میں حق کا ہم رکاب جذبۂ عشق ہی تھا۔

صدقِ خلیل بھی ہے عشق ۔۔۔ بھی ہے عشق

معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

عشق ہی کا یہ جذبہ ہے جس کے تحت انسان زندگی کو بلندیوں سے آشنا کرتا ہے۔ اور ابدیت وجاودانی کی کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

اقبال اپنی قوم کو شرابِ عشقِ حقیقی میں مدہوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم "ساقی نامہ" میں جہاں تیر و نشتر بھی ہیں اور مرہم بھی، ماضی کی داستانِ الم بھی ہے اور حال کی نوحہ گری بھی۔ وہاں انہوں نے عشق کا ہی رونا رویا ہے۔

بجھی ہے عشق کی آگ اندھیر ہے ۔۔۔ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

لیکن آگے چل کر شاعر نے اسی بجھی راکھ اور بے روح جسم میں خدا سے جان ڈال دینے کی بھیک مانگی ہے اور ساقی ازل سے وہی شراب عشق طلب کی ہے جس کے نشے میں مسلمانوں نے چار دانگ عالم میں اپنا سیاست عدل و انصاف اور علم و حکمت کا مثالی نمونہ پیش کیا تھا۔

شراب کہن پھر پلا ساقیا

وہی جام گردش میں لا ساقیا

جگر سے وہی تیر پھر پار کر ۔۔۔ تمنا کو سینوں میں بیدار کر

(بر ص۱۱۳)

غبارِ یادہ

علامہ اقبالؒ کا نظریۂ قانون

اقبالؒ کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور قانونی نظریات، اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ انہوں نے دو قومی نظریہ رسوا پیش نہیں کیا تھا۔ بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کو ایک خوش حال، پُر امن، باوقار اور خود مختار قوم بنانے کے ضمن میں ان کے طویل مشاہدے اور فکر کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے بجا طور پر اندازہ لگایا کہ غیر ملکی تسلط نے مسلمانوں کے نظریات کو متاثر کیا ہے اور ان کی فکر کا دھارا بدل دیا ہے وہ اپنی حقیقی فلاح کے تقاضوں کے احساس اور ان کو پورا کرنے کی ہمہ نوع صلاحیتوں سے عاری ہیں اور یہ نتیجہ ہے اسلامی قوانین کی جگہ انگریزی کے ضابطوں کی تقلید کا۔ پھر انہوں نے پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) کے بعد خلافت عثمانیہ کو جمہوریہ ترکیہ میں تبدیل ہوتے بھی دیکھا۔ لیکن ہمیں ایسی اصلاحات نافذ کی گئیں جن سے ترکی اپنے شاندار مضمون سرگشتہ کردہ کیا اقبالؒ نے اس خطرہ کو شدت سے محسوس کیا کہ کہیں جنگ آزادی کے دوران دوسرے مسلم ممالک بھی حصولِ آزادی کے بعد اصلاح کے نام پر تقلیدِ فرنگ کا شکار نہ ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے برصغیر

کے مسلمانوں کو ہی نہیں دُنیا بھر کے مسلمانوں کو اسلام سے رشتہ استوار کرنے کا دردمندانہ مشورہ دیا۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اس ضابطہ کے بنیادی ستون قرآن وحدیث ہیں تاہم اجتہاد اور اجماع کی بھی اس میں مسلّمہ اہمیت ہے۔ علامہ اقبالؒ اجتہاد کے ذریعے اسلامی ضابطوں کی تدوین نو کے کچھ زیادہ داعی نہ تھے فرماتے ہیں۔ ؎

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

ان اشعار سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ دورِ انحطاط میں اجتہاد کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہوتا ہے لہٰذا ہمیں اجتماع پر زیادہ انحصار کرنا چاہیئے۔ اور پھر پچھلے ڈیڑھ ہزار سال میں اتنے فقہی تجربے ہوئے کہ ہر مسئلہ کی اچھائی اور برائی ظاہر ہوچکی ہے ان تجربات کیلئے جو اصول اور کسوٹی وضع کی گئی وہ آج بھی زندہ و تابندہ ہے اور ان سے آج بھی بخوبی استفادہ کیا جاسکتا ہے البتّہ فقہی اختلافات کے کسی موقعہ پر رکاوٹ بن جانے کے امکان کو اجماع کے ذریعہ ختم کیا جاسکتا ہے بلاشبہ ماضی میں فقہا میں اختلافات رُونما ہوتے رہے لیکن یہ کسی صورت میں بھی قانون کی تدوین و نفاذ میں رکاوٹ نہ بنے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:۔

"اسلام کی سیاسی ترقی کے ساتھ نظامِ قانون کا تصور ایک اشد ضرورت بن گیا تھا۔ اور ہمارے ابتدائی عرب اور غیر عرب فقہا نے انتھک کوششیں کیں حتّٰی کہ فقہی مسائل کے تمام جمع شدہ مواد کی آخری صورت پذیری ہمارے تسلیم شدہ مذاہب کی شکل میں ہوئی۔"

اقبالؒ کے نزدیک ایک جمہوری شعور ہی اجماع کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر من مانی کی جائے یا انفرادی تصورات کو ملک و ملت پر نافذ کر دیا جائے۔ یا اسلاف سے رشتہ توڑ کر "جدت" اختیار کی جائے تو وہ یقیناً ایک المیہ ہوگا۔ بلکہ المیہ سے بھی زیادہ "تسلیم شدہ مذاہب" سے انکار ہوگا۔ اقبال نے قومی استحکام کے لیے جس شئے کو سب سے زیادہ ضروری قرار دیا وہ سلف صالحین کا بنایا ہوا تابندہ راستہ ہے۔ ؎

راہ آباء رَو کہ ایں جمعیت است
معنیِ تقلید ضبطِ ملت است

لیکن آج قانون کی تدوین و نفاذ میں سلف کے بنائے ہوئے تمام اصولوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اور ہر موقع پر "فکرِ یورپ" کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ ؎

فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو

اقبال کے نظریہ قانون کے متعلق اور دوسری باتوں کے علاوہ کم از کم دو باتیں ظاہر ہیں۔ اول یہ کہ قانون کی تمام تر اساس قرآن، حدیث اور اجماع پر رکھی جائے اور اجتہاد کو بروئے کار نہ لایا جائے۔ البتہ ضرورت کے وقت قیاس اور اجتہاد سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اجماع کی موجودگی میں دراصل اجتہاد کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی لہٰذا اسے بالراست اصول کے طور پر اختیار نہ کیا جائے۔ دوسری بات اس نظریہ کا عملی پہلو ہے یعنی اسلامی قانون کی تدوین کیونکر ہو؟ ... اقبالؒ اس کے لیے قانون ساز مجالس کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ مجوزہ مجلس کی موجودگی میں اجتہاد خود بخود اجماع کی صورت اختیار کر لے گا۔ اقبال کے الفاظ میں

"مسلمانوں کی مجالس ہائے قانون ساز میں علماء کو ایک اہم اور مؤثر جزو ہونا چاہیئے اور وہ اس کے رکن کی حیثیت سے قوانینِ شریعت پر آزادانہ بحث و تمحیص میں معاونت اور رہنمائی کریں۔ احکام شریعت کے تعین میں غلطیوں کے سدباب کا مؤثر طریقہ ایک ہی ہے اور وہ مسلمان ممالک میں فقہی تعلیم کے موجودہ طریقہ میں ایسی ہمہ گیر اصلاح ہے جس سے اس کا دائرہ وسیع ہو جائے گا اور بجد یا اصول قانون سازی کو طلبہ کے درس میں لازمی جزو قرار دیا جائے۔

اسلامی معاشرہ میں گذشتہ کئی صدیوں سے غیر اسلامی قوانین جزوی طریقہ پر مفرز کیے جاتے رہے ہیں یہ دور زیادہ تر حکمرانوں کا تھا۔ جو ان کا مذہب تھا وہی رعایا کا لیکن اس زمانے میں بھی بے شمار عالموں نے غیر اسلامی شعائر و احکام کو نامطبوع قرار دیا تھا۔ حالات اور ان تقاضوں کے تحت قرآن واحادیث، اجماع وقیاس سے

استنباط کیا گیا۔ شیخ موفق الدین ابن قدامہ المقدسی کا خیال ہے کہ تمام احکام اور اصول جو قرآن وسنت کی روشنی میں ائمہ نے تجویز کر دیے ہیں ساری امت کے لئے قابلِ تقلید ہیں۔ اور نئی یا اختلافی بات کے اجماع کے طریقہ کو بروئے کار لانا چاہیئے۔ یعنی سب لوگ یا زیادہ سے زیادہ لوگوں کی متفقہ رائے سے ایک فیصلہ کرنا تاکہ فتنہ وفساد نہ ہو، اور اتحاد کو تقویت ملے۔ آج اسلامی قانون کی تشکیل جدید میں یہی اصول اپنانا پڑے گا۔ اقبالؒ نے تمام زندگی اسی کی کوشش کی کہ اسلامی قانون کی تشکیل جدید کیوں عمل میں آئے آج جب کہ ہم اپنے آزاد وطن میں اسلامی معاشرہ کے قیام کی جد وجہد کر رہے ہیں۔ ہمارے سامنے اقبالؒ کے قانونی نظریات مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ؎

ملت از آئینِ حق گیرد نظام
از نظامِ محکمے خیزد دوام

حسین کاظمی

فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں

دُنیا میں ہر انسان کی آمد اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ قدرت انسانیت کے مستقبل کی جانب سے پُرامید ہے۔ یہی امید اقبال کے کلام میں بھی ایک انبساط مسلسل بن کر جھلک رہی ہے۔ وہ بھی نئی نسل سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ انہیں ہمیشہ یقین رہا کہ ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

انھوں نے "ساقی نامے" میں بڑی دلسوزی سے دعا کی تھی۔ کہ ؎

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز
اُمنگیں مری، آرزوئیں مری
امیدیں مری، جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

اور ان کی یہ آرزو کسی نہ کسی حد تک پوری ضرور ہوئی بلکہ ان کی "دولتِ افکار" ان کے قافلے میں لٹی اور ٹھکانے لگی اور اسی دولت سے ہم نے برصغیر میں اپنے لئے آزادی جیسی نعمت خریدی۔

اقبال نے محض شاعری نہیں کی۔ پڑھنے اور سننے والوں کے ذہنوں تک اپنی بات پہنچانے کے لئے انہوں نے شاعری کی تاثیر اپنائی ہے ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

اقبال نے فلسفے کو شعر کی رعنائی میں ڈھال دیا، علم و عمل کی حقیقتوں کو نغمہ و آہنگ کا پیکر عطا کیا۔ ان کی شاعری بلاشبہ ادبِ عالیہ کا حصّہ ہے لیکن انہوں نے فنِ شعر گوئی کی لطافتوں اور نزاکتوں کے اظہار کے لئے شاعری نہیں کی۔ ان کے پیشِ نظر ایک بلند تر مقصد تھا یعنی اس ضابطۂ حیات کی تشریح و تفسیر جس سے انسانیت کی حقیقی فلاح وابستہ ہے۔ اپنے خطبات میں اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"ہمارے ہادیٔ برحق صلعم کی ذاتِ مبارک قدیم اور جدید دُنیا کا نقطہ اتصال ہے۔ سلسلۂ ہدایت کے اعتبار سے حضورؐ کا تعلق قدیم دُنیا سے ہے ہدایت کی تکمیل اور اس کے روشن اور ہمہ گیر نتیجوں کے اعتبار سے حضورؐ جدید دُنیا سے متعلق ہیں۔"

دُنیا جس نظریۂ حیات سے ہمارے حضورؐ ختمی مرتبتؐ کے وسیلے سے روشناس

ہوئی، اقبال نے اسی کی وضاحت دورِ حاضر کی زبان اور اصطلاحات میں پیش کرنے کی نہایت قابلِ قدر کوشش کی ہے۔ علم کی بلند سطح پر یہی سنت نبوی ص کی پیروی ہے جس ذاتِ گرامی ص کو ہم از روئے ایمان عالم انسانیت کا سب سے بڑا محسن سمجھتے ہیں اس کی سیرت مبارک کے اتباع کا حق محض ظاہری وضع قطع یا چند رسوم و عبادات کی تکمیل سے ادا نہیں ہوتا سنت نبوی ص کی پیروی یہ بھی ہے کہ جسے اختیار و اقتدار حاصل ہو، وہ انسانوں کے درمیان کسی رعایت و جانبداری کے بغیر معاشرتی انصاف قائم کرے۔ سنت نبوی ص کی پیروی یہ بھی ہے کہ افراد اپنے پاس اپنی ضرورت سے زائد وسائلِ دولت جمع نہ کریں کیوں کہ اس دولت کے متمکن ہونے جانے سے معاشرے میں محروموں کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے۔ سنت نبوی ص کی پیروی یہ بھی ہے کہ علم کو ساری انسانیت کی امانت سمجھا جائے اور اسے اس طرح عام کیا جائے کہ انسانوں میں باہمی رواداری اور احترام کے جذبات پیدا ہوتے چلے جائیں۔ اقبال کے خیال میں اللہ کی وحدت پر ایمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ ساری انسانیت کی حرمت و وحدت کو بھی جزوِ ایمان بنا لیا جائے۔ بلکہ انہوں نے تو تسخیرِ حیات و کائنات کی ساری کوششوں کو اللہ کی وحدت پر ایمان کا ثبوت قرار دیا ہے۔

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؛ فقط اک نکتۂ ایمان کی تفسیریں

عظمتِ انسانی کا یہی تصور اقبال کی فکر کا محور ہے۔ شعر و نغمے کی لطافتوں کے ساتھ ایک دستورِ حیات کی تشریح ایک بڑی اور دشوار ذمہ داری تھی جسے اقبال

نے انتہائی حسن وخوبی کے ساتھ پورا کیا۔ وہ ذاتِ گرامیؐ جسے اقبال کی نگاہ عشق و مستی نے اول و آخر سمجھا۔ ؎

وہ دانائے سُبل ختم الرّسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہی طٰہٰ

اس ذاتِ گرامیؐ نے اقبال کی فہم و فراست پر کرم بے حساب بھی کیا جس کی بناء پر اقبال کی فکرِ وطن زندگی کی عظمتوں سے پوری طرح آشنا ہوئے اور انھیں اس حقیقت تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ عقل اور ایمان میں مکمل ہم آہنگی کا نام اسلام ہے۔ ؎

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے؟
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمالِ جنوں

سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور ہدیہ عقیدت پیش کرتے ہوئے اقبال نے یہی بات اس انداز میں کہی ہے۔ ؎

تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل، غیاب و جستجو، عشق، حضور و اضطراب

اللہ کی وحدت پر ایمان کا اصل مقصد یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں میں انسان کی آزادی اور حرمت اور کائنات میں اس کی قوتِ عمل کے غیر محدود

ہونے میں کامل یقین پیدا ہو جائے۔ در حقیقت شرک اسی لئے سب سے بڑا گناہ ہے کہ اس سے نفسیاتی طور پر خود انسان کا شرف اور برتری متاثر ہوتی ہے ہمارے مشرکانہ خیالات سے اللہ کی وحدت تو کسی طرح متاثر نہیں ہوتی۔ کیونکہ نظامِ کائنات میں تو کوئی اس کا شریک ہو سکتا ہی نہیں اس سے ہوتا یہ ہے کہ انسان جسے اللہ کے سوا کائنات کی کسی دوسری طاقت کے آگے سر نہیں جھکانا چاہیئے وہ اللہ کے بجائے اور بہت سی دوسری قوتوں کے سامنے خود کو عاجز و بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔

بدل کے بھیس یہ آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اللہ پر ایمان کا حقیقی تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کی رنگ، نسل، قبیلے اور قوم کی تفریق کو ہم صرف باہمی تعارف اور جان پہچان کا ذریعہ سمجھیں۔ اس فرق کو ہم انسانوں کے مابین برتری اور کمتری کی بنیاد بنالیں تو یہی عملاً شرک ہے۔ ہمارے دین میں اللہ کی وحدت پر ایمان لانے کا جو بار بار مطالبہ کیا گیا ہے تو اس کا اصلی مقصد یہی ہے کہ نسل انسانی کی وحدت سے انکار نہ کیا جائے کیوں کہ خالق کی وحدت پر ایمان سے مخلوق کی وحدت پر ایمان لازم آتا ہے۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

اس کے سوا انسانی مساوات کے تصور کی کوئی اور بنیاد قائم ہی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ حیثیتِ مسلمان ہماری قومیت کی اساس بھی اسی فکر پر ہے

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بناء ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

مسلمان کی قومیت کا تعین تو اسی دن ہو گیا تھا جس دن ہمارے ہادیٔ برحقؐ نے اللہ کا یہ پیغام ہمیں عطا فرمایا کہ وحدتِ ایمان کی بنیاد پر سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس سے قبل انسانوں کے درمیان رشتے خون کی بنیاد پر قائم ہوتے تھے۔ اپنے خاندان، قبیلے اور نسل کا آدمی اپنا اور دوسرے خاندان، قبیلے یا نسل کا آدمی غیر سمجھا جاتا تھا۔ ان بندشوں سے آگے بڑھ کر انسان جغرافیائی سرحدوں تک پہنچا۔ اب اس نے خود کو ملکی حدود کی بنیاد پر متحد کیا یعنی آپس کے ذیلی اختلافات کے باوجود ایک ملک میں رہنے والے ایک قوم ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو انسان کو "سماجی جانور" سمجھتے ہیں، ان کے لئے اس سے آگے جانا ممکن نہیں ان کا نظامِ فکر اسی حد تک ان کی رہنمائی کر سکتا ہے اقبال کے خیال کے مطابق تہذیبِ حاضر کے "آذر" نے جو صنم تراشے ہیں ان میں "خدائے وطن" سب سے بڑا ہے۔ لیکن

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے

کیوں کہ :۔

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

ہم وحدتِ انسانی کے علمبردار ہیں ۔ وطنیت کا عقیدہ انسانوں کو جغرافیائی حدود میں مقید کر دیتا ہے بلا شبہ بحیثیت مسلمان ہمارا نظامِ فکر و عمل اہلِ مغرب کے فلسفے زندگی کے مختلف اور اعلیٰ ہے لیکن علم اور خود اعتمادی سے خودی کی بناء پر ایک طویل عرصے سے ہم مغربی افکار کے غلبے میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس غلبے کا طلسم ابھی ایک طویل عرصے تک اور نہ ٹوٹتا اگر ہمارے کانوں میں یہ آواز نہ آتی ۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اک زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اور برِصغیر کے مسلمانوں کے لئے مخصوصاً یہ آواز اس صدی کی سب سے اہم آواز ہے مغرب کے فلسفہ زندگی نے انسانیت کو مادیت پرستی کے جس عذاب میں مبتلا کر دیا ہے ۔ یہ آواز اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کا سب سے موثر اور محکم وسیلہ ہے ۔ اقبال کے افکار کے لئے قرآن کریم مشعلِ ہدایت اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی منارہ نور کی حیثیت رکھتی ہے ۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

یہی نور ان کے لئے حاصلِ حیات و کائنات ہے۔ اسی سے ان کو فکر کی دولت بھی ملی اور اظہار کی جرأت بھی وہ فرد ہیں لیکن اس ایمان کی بخشی ہوئی قوّت کی بناء پر وہ ایک پوری تہذیب اور ایک پورے نظامِ فکر کے مقابل آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ اسی نور نے ان کو دُور بینی عطا کی کہ اس مادی تہذیب کا عبرتناک انجام ان کی نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہو گیا۔ ؎

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

اقبال کا زمانہ عالمِ اسلام کے لیے بڑی ابتلاء اور آزمائش کا دور تھا ہر قدم پر ان کے لئے ذلّت و رسوائی اور ہر منزل پر ان کے روبرو ہزیمت و پسپائی تھی۔ محرومی و مایوسی کا وہ عالم تھا کہ احساس کی شدّت سے گھبرا کر حالی پکار اٹھے تھے۔ ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے

اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی

ہاں ایک دُعا تیری کہ مقبولِ خُدا ہے

یہی آرزو و امید میں ڈھل کر اقبال کی فکر نقطۂ آغاز بنی۔ اقبال عالمِ اسلام میں نئی زندگی کے جو تمنائی نظر آتے ہیں تو وہ محض اس جانب داری کی بناء پر نہیں کہ وہ خود بھی مسلمان تھے بلکہ اس ایمان کی بناء پر کہ وہ اسی سے عالمِ انسانیت کا روشن مستقبل وابستہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظریۂ زندگی انسان کے حقیقی احترام کا حامل نہیں۔ ان کی فکر نے اس حقیقت کا عرفان حاصل کر لیا کہ انسان پرتوِ ذاتِ خداوندی اور حاملِ صفاتِ خداوندی ہے۔

ہمت ہے اگر تو ڈھونڈ فقر — بس فقر کی اصل ہے حجازی

اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی

انہیں اس سچائی کا ادراک بھی حاصل ہو گیا تھا کہ انسانی زندگی کے دو اعلیٰ مقاصد ہیں، تسخیرِ کائنات اور معاشرتی نیک اعمال کے ذریعہ استحکامِ ذات

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں

یہی توحید ہے جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

اقبال کا یہ ایمان ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی نظر تمام فکرِ انسان کی حقیقی معنوں میں بلند آرزوؤں کی کفالت نہیں کر سکتا اور اسی لئے انہوں نے مغرب کے تصورِ حیات اور تصورِ قومیت دونوں کو انسانوں کے درمیان

فتنہ و فساد کا باعث قرار دیا ہے۔ ؎

اِس دَور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حِکمتِ افرنگ کا مقصود
اِسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم
مکّے نے دِیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیّتِ اقوام ؟ کہ جمعیّتِ آدم ؟

برِ صغیر کے تاریخی پسِ منظر اور سیاسی حالات نے فکر اور ایمان کی بنیاد پر مسلم قومیّت کے احیاء کا ایک موقع فراہم کیا تھا جو ایک زندہ پیام بن کر اقبال کی فکر میں ڈھلا اور شعر کی تائید کی صورت دل کی گہرائیوں میں اتر گیا اور برِ صغیر کے مسلمان جب اجتماعی طور پر یقین کی اس دولت سے مالامال ہوئے تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت ان کی آزادی کی راہ روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

۞ ۞

حکیم محمود رضوی

اقبالؒ اور عقلیت پسندی

فلسفیوں کے خانۂ حیرت میں تہذیبی شاخساروں پر خوش رنگ و نکہت پیر پھول نہیں کھلتے بلکہ تہذیبی موجد بہار میں باد مسموم کی طرح اپنے افکار ژولیدہ جسارت کے رگ و پے میں اتارتے رہتے ہیں۔ فکری سرابوں میں بھٹکنے والے تخیل زدہ لوگ عمر بھر اپنے لئے بھی کوئی واضح و روشن راہ تلاش نہیں کر پاتے چہ جائیکہ انبوہِ خلائق کو کسی منزل کا سراغ دے سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کا طلعت میں کسی بھی ایسے مفکر اور فلسفی کا نام عنوان نہیں بن سکا۔ کہ جسے کوئی فعال اور حیات افروز نظریہ یا کوئی ایسا پیغام دیا ہو کہ جس کی روشنی میں اقوام و ملل کی تشکیل و تعمیر ہوئی ہو۔ اس کے برعکس وہ نفوسِ قدسیہ جنہیں خلاق عالم ایک ایسا جذبۂ کامل ودیعت کرتا ہے کہ جس میں تذبذب و تامل کی قطعی گنجائش نہیں ہوتی اور وہ بارگاہِ احدیت کے تربیت یافتہ انسان اکمل اپنے عزائم کی راسخیت اور ذہنی توتوں کی پہنائیوں میں کچھ ہی عرصہ میں ایک انقلاب عظیم لے آتے ہیں اور ایک نئے تمدن کا آفتاب پھر مرکز اشراق سے طلوع کرتا ہے کہ جس سے ذہنی ظلمتیں اور تہذیبی رو سیاہیاں معاً لمعاتِ انوار میں ڈوب جاتی ہیں اور ان کا ماضی ایک ایسی گہری قبر میں

دفن ہو جاتا ہے کہ جس کا نشان تک سینۂ ارض پر نہیں ملتا۔ متشککین اور فلسفین کی فکری خلاؤں میں مضطرب و آوارہ روحوں کی کرب ناک چیخیں ہر تمدنی و تہذیبی موڑ پر سنائی دیتی ہیں اور یہی چیخیں ان اجسام میں حلول کر جاتی ہیں جو ذہنی جہنم زاروں میں تعقل پرستی کے مقفل دروازوں سے سر ٹیک ٹیک کر مر جاتے ہیں۔ اور کسی حالت میں ان سے نکل نہیں سکتے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ یہ لوگ ہر دور میں الہامی فرمودات اور کتب مقدسہ کی اساطیر کی قطع و برید اور تاویلوں کو فکری اجتہاد کا نام دیتے ہیں۔ اندازہ کیجئے انسانی سوچوں کی محدود پرواز اور پختگی اور لامتناہی معراج ابلاغ کا کیسے اور کس طرح احاطہ کر سکتی ہے۔ یہ لوگ تو خود ہی اپنے سلبی مسلمات کے بین السطور سے زندگی بھر نہ ابھر سکے تہذیبی عظمتیں اور اخلاقی اقدار جب تعقل پرستی کے سرطان میں مبتلا ہوتی ہیں۔ اور فکری گمراہیاں جب ان کا غلط مداوا کرتی ہیں اور ایسے ایسے معارج منصۂ شہود پر آتے ہیں کہ جن کی ذہنی تجویز بزعم خویش ان کی شفا بخش فراستیں اور ذہانتیں ان کی زندگیوں کے لئے پیغام موت اور مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن ان موت کے ہولناک سایوں میں بلکتی ہوئی انسانیت کو دیکھ کر فطرت خاموش نہیں رہ سکتی ہو۔ آیہ ہے کہ انہی میں سے ایک انسانِ کامل اُس ماہر تشریح الابدان استاد کی حیثیت میں منظر عام پر آتا ہے جو طبی درس گاہ میں صاحب استعداد طلب کی ایک جماعت کے ساتھ تشریحی رموز و اسرار کو سمجھانے کے لئے دار الموتیٰ DISECTION HALL میں تختۂ مشق stretcher پر پڑی ہوئی لاشوں کو قطع و برید کے ذریعے ان

امراض و اسقام کے نکتہ مرکز کی نشاندہی کرتا ہے کہ جس سے انسانوں کو حیاتِ نو ملتی ہے اور ان کی علاج و تدبیر کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ اور یہی ایک مقید نسل معاشرے کے امراض پر گہری نظر رکھتی ہے اور یہی تربیت یافتہ لوگ متوارث تہذیبی ورثوں کو ہر آن مہلک جراثیم و اسقام سے پاک وصاف رکھتے ہیں اور حدود و مکارم الاخلاق میں ایک صحتمندانہ ماحول پیدا کرتے ہیں۔ اور آنے والی نسلیں ان کے مجرب و شفابخش نسخوں سے استفادہ کرتی رہتی ہیں اور یہ تکرار عمل اس وقت ممکن ہو نا چاہیے کہ انسان کی انا کی تجسیم۔ ظن و تخمین کی نذر نہ ہو جائے جب تک انا کے وجود کی ایک علیحدہ مستقل حیثیت کو تسلیم نہ کر لیا جائے اور بہ نظر تفحص و یقین خلقت اشرف المخلوقات کی حقیقت بعینہ صورت و مادہ FORM AND MATTER کی تہہ اور گہرائی تک نہ پہنچ جائے اس کی فکری سلامت روی کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔ اور تصدیقات توضیحی کے بغیر فرقہ کی وجودیت کو اعتباری شکل نہ دے یعنی اس نظریہ کو ذہن میں رکھے کہ قطرہ کا وجود دریا سے علیحدہ کر بھی مسلّم ہے اور یہی فکر صالح خلقت بشر کی واضح اہمیت کا بہتر ادراک کر سکتا ہے لیکن تعقل پرستی کا بُرا ہو کہ اس نے انسانی فکر کی عنان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پس پھر کیا تھا۔ ہر آن فکری و ذہنی تغیرات اسے جادۂ حقیقت سے کوسوں دور لے جاتے گئے اور اس نے اعتبار نظر سے عالم محسوسات کی ہر شکل کو قطعی طور پر مسخ کر ڈالا۔

ذرا غور فرمایئے کہ سرزمین عرب ایک غیر متمدن سرزمین تھی اور بدویت کا ہر انداز انسانی کی قبائلی زندگیوں پر حاوی تھا۔ اور یہیں سے طلوع اسلام ہوتا ہے حضور اکرمؐ

کی فکر انگیز مصلحانہ دعوت اور غیر معمولی کردار کی عظمت اور قرآن کا نزول ہزاروں حقائق الہامیہ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا۔ صرف تئیس سالہ دَورِ نبوت نے بیشتر ملکوں اور قوموں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لےکر ان کے متوارث اور جامد عقائد کے اندھیروں کو معمورۂ انوار بنا کر رکھ دیا۔ یہ پیغام سرمدی اس قدر حیات افروز تھا کہ انسانی تقدیروں کے رخ بدل گئے۔ قرآن حکیم کی سہل الممتنع تعلیم اور سرورِ کائنات صلعم کی سیرتِ طیبہ کے روشن پہلو اتنے واضح تھے کہ ان کی تفہیم کے لئے قطعاً توجیہات و تاویلات کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ایران میں جب ظہورِ اسلام ہوا تو ان کا مذہبی عقیدہ فلسفۂ زرتشتی کا رہین منت تھا اور اس پر مستزاد یونانی فلسفے کی غارت گری تھی لاشعوری طور پر یہاں مفکرینِ اسلام کے اذہان میں ان متوارث عقیدتمندوں کی خاکستر ہمیشہ اڑتی رہی جس کا ایک ثبوت رازی کی وہ قرآن کی تفسیر ہے جس میں انہوں نے یونانی و زرتشتی فلسفے کو مشرف بہ اسلام کرکے اس کی بنیاد پر قرآنی مطالب کی دیواریں کھڑی ہیں۔ قرآن حکیم کی آیات محکمات و متشابہات کا ادراک تو کیا ہوتا اس کے برعکس دل و دماغ میں تشکیک کے کانٹے طنزاز و ہو کر رہ جاتے ہیں۔ درآں حالے کہ قرآن کا اندازِ بیان اس قدر دل نشین اور حقیقت پسندانہ ہے کہ مطلقات صاف ذہن و فہم رکھنے والوں کو دقت پیش نہیں آتی۔ مگر ان الجھے ہوئے ذہنوں کا کیا کیا جائے جو تعقل پرستی اور تعقیب کے بغیر الہامی دعوت کے واضح مفہوم کو بھی نہیں سمجھ پاتے۔ دار الحکمین عقل و فکر کی مادی حیثیت کو خود فلسفین نے ایک نہایت غیر معتبر وجدان اور

نظریات پر محمول کیا ہے۔ ایسی تعقل پرستی کہ جس کی بنیاد ہی سرے سے نہ ہو۔ اس
کی روشنی میں ذاتِ واجب الوجود کے قانون اور کائناتِ ارضی و سماوی کے
سربستہ رموز و اسرار سمجھنے کی سعی کرنا کس قدر مضحکہ خیز غیر فطری سوچ پر مبنی ہے
عقلیات اور فلسفہ کا سرچشمہ سرزمین یونانی ہے۔ اور اس کے مختلف ادوار میں
مکتبہائے فکر پر ایک نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ افلاطون اور ارسطو اس
عقیدہ ثنویت کے بانی اور داعی ہیں اور انھوں نے توجیہہ کائنات کے سلسلے
میں افلاطون کی فکر میں عالمِ محسوسات دو ہیں۔ عالم مثال اور عالم مادی اور جس
میں صورت توجیہہ بہ وجود موجود ہے۔ وہ صرف عالم مثال ہے اور جو اس
ظاہری میں جو کچھ ہم محسوس کرتے ہیں۔ اس رشتہ عالم مادی سے مربوط ہے۔
نظر بظاہر مادی حیثیت میں جو کچھ دیکھتے ہیں وہ صورتِ نوعیہ کا عالم مثالی میں
ایک عکس ہیں ارسطو کے نزدیک تدوین کائنات کے دو اہم اجزا ہیں ہیولیٰ
صورت اور کوئی صورت نوعیہ ہیولیٰ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جب تک کوئی ہیولیٰ
قوتِ فعلیت سے ہمکنار نہیں ہوتا صورتِ نوعیہ کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ ان ہر دو
فلسفیوں کے بعد جو اہلِ فلاسفہ منصۂ شہود پر آئے انہوں نے حقیقت اشیاء کا
ادراک عقل انسانی کے حوالے سے یکسر غلط قرار دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ عقلی دلائل اور
براہین سے نفی اور اثبات کے متعلق دلائل دیئے جا سکتے ہیں۔ اور یہ پیچ و تاب
فکری ذہنی سکون کے لیے سمِ قاتل ہے اور وہ مسائل جن کا تعلق مابعد الطبیعات
سے ہے ان توجیہات کا دخل انسانی فکر کے لیے مضر رساں ہے حقیقت یہ ہے کہ جس طرح
ارسطو معقولات اور غیر معقولات میں کائنات کی تقسیم کر کے ان کی ابتدا اور خبر میں الجھ گیا

اس طرح فلسفین کے نظریات کی غارت گری نے چاروں سمت فکری جمود پیدا کر رکھے ہیں اور کوئی واضح و روشن راہ کا تعین نہ کر سکے بعد یہی فکری ورثہ یونان سے ایران پہنچا اور اسی کو مفکرینِ اسلام نے مشرف بہ اسلام کرنے کی ناکام سعی کی۔ اس مکتبہ فکر میں وہ فلسفہ بھی شامل ہو گیا جو ہزاروں سال پہلے ہندو فلسفین کی سوچوں نے تخلیق کر رکھا تھا۔ اور اس تعقل پرستی کی بنیاد چھ عناصر پر تھی۔ ویدانت جو توحید وجودی و شہودی کا مبہم اور بے نشان تصور رکھتا، دہریت جس میں خدا کے وجود کی گنجائش نہ تھی اور یوگ ترکِ ماسوا کا عقیدہ مایا برہما اور نروان، کرم وغیرہ اور یہ صرف برہما کے نقطۂ نظر کے تابع تھے اور اسی ذات کی نفی کر کے جزو کل میں ملانے کے بعد ظاہر ہوتا ہے یونان کا فلسفہ مباطنیت، ہندومت کا ویدانت حقیقتاً تصوف کی تخلیق کا باعث تھے۔ مسلم مفکرین اور صوفیائے کرام نے انہی فلسفیانہ توجیہوں میں ایک تیسری صورت کو واضح کرنے کی کوشش کی اور مسئلہ وحدت الوجود پر ہزاروں کتابیں لکھ ڈالیں۔ غنوطیت یا سیت اور توکل، تقدیر پرستی ایسے غیر اسلامی نظریات کو تہذیبی وراثتوں میں سمونے کی سعی کرتے رہے اور ملتِ مسلمہ روز بروز قعرِ مذلت میں گرتی چلی گئی اور یہ **قطعاً اسلام جیسے** زندہ اور حیات افروز مذہب میں ان کی گنجائش نہ تھی تاریخ کے اوراق ایسے طوفان کی ہلاکت آفرینیاں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ اقبال اسی پُر آشوب علم الکلام کے دور میں کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں آئے ان کے آباؤ اجداد کشمیری برہمن تھے انہی میں سے ایک بزرگ نے اسلام قبول کیا ہندومت میں برہمنوں کا درجہ

بہت بلند ہے مذہبی تقدس فلسفہ و تعلیم کے لحاظ سے یہ گروہ پیشوا اور رہبر کی حیثیت کا حامل ہے۔ اقبال کو جب اس گھرانے کی روحانی اقدار اور تشفقت ورثے میں ملے۔ انہی نسبتی روایات کا لازمی تقاضا تھا کہ جو ذہنی فکر و یدانسے اور رہنما کا نسل در نسل اقبال تک پہنچا تھا۔ اس کی علمی و فکری حیثیت کو وہ اسلامی نظریہ کی کسوٹی پر پرکھتے۔ اقبال کا فلسفے سے بے پناہ شغف اسی نسبی اور تہذیبی ورثے کا مرہون منت ہے لیکن ان کے دل و دماغ میں سیرت طیبہ اور قرآن پاک کے روشن و واضح اصول کار فرما تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے مغرب و مشرق کے فلسفے کو بہ نظر غائر دیکھا اور ان کے اسقام امت مسلمہ پر واضح کرتے چلے گئے۔ گوئٹے اور نطشے کا فلسفہ انہیں اپنی طرف راغب نہ کر سکا بلکہ انہوں نے ان کی بے چارگی اور فکری کم مائگی پر تاسف کا اظہار کیا اور مشرق و مغرب کے فلسفیوں کی کوتاہی فکر اور ذہنی شعلہ سامانی کے لیے تعقل پرستی سے دوری اور انقطاع کو ضروری قرار دیا اور اسلامی شریعت کے پرسکون پیغامات سے ان کی روحوں کی تشنگی کو فرو کرنے کی کوشش کی۔ کہتے ہیں ؎

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است

دانش اندوختہ دل ز کف انداختہ
آہ ز آں نقد گراں مایہ کہ درباختہ

از من اے باد صبا گوئے بدانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است

برق را ایں بہ جگر مے زند آں رام کند

عشق را عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است

چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ

آں چہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است

اقبال فکری طور پر تاویلوں اور تعقل پرستیوں سے سخت بیزار اور متنفر تھے۔ انہوں نے تصوف کی لاش کو سرِ عام رکھ کر اس پر عملِ تقطیع کیا اور اسلامی اذہان میں راسخیت اور عرفانِ نفس کی تعلیمات سے معاشرہ اور تہذیبی وراثتوں کو تزئین بخشی وہ شریعتِ غرّا اور ابلاغِ قرآن کے سلسلے میں ایسا انداز بیان اختیار کرتے ہیں۔ کہ جس سے حسین و خوب صورت خطابت کے ہزاروں پُر سکون اور طمانیت بخش عنوانات ہوتے ہیں وہ بہر حال ر عقلِ سلیم اور عشق کی وارفتگی کے قائل ہیں اسی نظریہ کی بنا پر ان کے کلام میں دو واضح علامتیں ملتی ہیں تعقل پرستی اور فکری آوارگی کے لیے وہ رازی اور عشق یقین کامل جذب صدق کے لئے رومی کے ناموں کی مصطلحات عام استعمال کرتے ہیں۔ عشقِ صادق اور تعقل پرستی کی انتہائی کرب انگیز متشکک ذہنی جنم سے دور وہ عارف رومی کو نہایت بلند مقام اور پُر سکون عقیدوں کی علامت گردانتے ہیں کہتے ہیں۔ ؎

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی

جیتا ہے رومی، ہارا ہے رازی

فلسفہ و مذہب کے عنوان سے ان کی یہ نظم "ضرب کلیم" میں ہے اس کے ان

اشعار پر تفکر فرمایئے۔ ؎

کھلتا نہیں مرے سفرِ زندگی کا راز

لاؤں کہاں سے بندۂ صاحب نظر کو میں

حیران ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں

رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں

"جاتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"

آخر الذکر شعر مرزا غالب کا ہے جو انہوں نے موضوع کی مناسبت سے بطورِ تضمین صرف فرمایا ہے "پیامِ مشرق" میں "نیٹشا" کے نام سے یہ شعر ان کی فکری سلامت روی کو واضح کرتے ہیں ؎

از مستی عناصرِ انسان دِلش تپید

فکرِ حکیم پیکرِ محکم تر آفرید

افگند در فرنگ صد آشوبِ تازہ

دیوانہ بکار گہِ شیشہ گر رسید

اقبال کے آئینہ فکر میں آنے والی نسلوں کے روشن تر نقوش ہیں وہ اپنے مکتبۂ فکر سے ایسے ذہنوں کی بالیدگی کرتے ہیں جو تشکک آمیز افکار سے قطعی طور پر منزہ و پاک ہوں ؎

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے

آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

پھر کہتے ہیں۔

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری

ارسطو کا نظریہ سوفسطائیت دراصل تعقل پرستی کا انتہائی غیر معقول پہلو ہے۔ جس کی علامہ اقبالؒ نے دھجیاں اڑا کر رکھ دیں اسی فلسفہ نے تعقل پرستی کی لغویت کو برسرِعام برہنہ کر کے رکھ دیا۔

حضرت سلمان فارسیؓ سے ان کے مذہب و نسب کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا سلمان ابن الاسلام سلمان ابن الاسلام یہ تھا وہ محیط کل مذہب جو زندگی کے جملہ تقاضوں اور الجھی ہوئی معاشرتی نیرورتوں کو ہر آن بحسن وجوہ حل کر کے رکھ دیا۔ افکارِ عالم کا یہ تجزیہ اگر منطقی طور پر کیا جائے تو ہر معقول انسان کو یوں محسوس ہو گا کہ اذہان خفتہ کے پریشان خوابوں کو مختلف توضیحات کے پہلو دے کر نہایت پُرفریب مصطلحات کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ روحانیین کی جماعت بھی بتجربہ فکر و تعقل پرستی کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکی ہیگل، شیلانگ، برکلے، سپینوزا اور ان میں سے آخرالذکر روحانی فلسفہ الٰہیات کا سرخیل تصور کیا جاتا ہے۔ اس نے خدا کی صفات کو قائم بالذات کہا، اس نے کہا خدا ایک، لافانی قوت ہے۔ وہ ہمیشہ

سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ چونکہ یہ متشدد قسم کا وحدت الوجودی تھا۔ اس نے کہا اس جوہر کے نوعیت کے لحاظ سے دو اعراض ہیں۔ عرض روحانی، اور عرض مادی۔ خدا جب روحانی عرض کے لباس میں جلوہ نما ہوتا ہے تو روح کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ اور جب وہ عرض مادی میں حلول کر جاتا ہے تو وہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور حقیقتاً دونوں اعراض اس کے مظاہر ہیں نظر بظاہر روح و مادہ وجودِ کائنات ہیں اور یہ مختلف یا علیٰحدہ کوئی وجود نہیں۔ خدا نہ ہی تو روح کو تخلیق کرتا ہے۔ اور نہ ہی مادہ کو۔ ایک ہستی کے دو ظہور ہیں۔ شیلانگ ہستی یا ایفو کے متعلق ایک ارتقائی نظریہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایفو اور غیر ایفو دونو بہ لحاظِ مادی و ہیولائی صورت کے لئے ایک تیسری قوت کا محتاج ہے ایک صلبی و ایجابی فعالیت کا مرکز ہے۔ ان تمام علمی و فکری اشکال کے کوئی ایسی واضح حقیقت انسانی تخلیق کی وجہ نہیں بتاتی کہ اس کا کائنات محسوسات میں آکر ایک خاص وجہ نہیں بتاتی کہ اس کا کائنات محسوسات میں آکر ایک خاص وجود میں ڈھل جانا کیا معنی رکھتا ہے اور اس کی خلقت کن وجوہِ ممکنہ کی حامل ہے۔ یہی نقش پرستی نظریۂ وحدت الوجود کا فکری تصور دیتا ہے جو سر تا سر تعینات نظر سے آگے نہیں بڑھتا اور یہ محض چشم خفتہ کے وہ ہولناک خواب ہیں کہ جن کا شعور و حسیات سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

اسلام نظریۂ خلقت جو دیتا ہے وہ نہایت اہم اور استبلا فکری کا مظہر کامل ہے اس نے انسان کو اشرف المخلوقات کہا اور اس کے وجودِ معنوی کے اندر

حقائق کا ایک دفتر سجا دیا۔ اسے اسرار و رموزِ الٰہیہ کا قرار دیا۔ پھر بیان کیا گیا کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ یعنی جس نے اپنی ذات کا عرفان حاصل کر لیا۔ اس نے اللہ کو بھی پہچان لیا اب آیئے کہ ارسطو کے مکتبۂ فکر اور منطق نے انسانی تکلّم اور مفاہیم کا احاطہ مقولاتِ عشر میں کیا ان کی معقولیت پر نے بے حد زور دار تنقید کی اور معیارِ عقل پر پورا اترنے والے منطقی الفاظ وضع کیے وہ کیفیاتِ شعور، جوہر، عرض، کیف، کم، ، نسبت کے دائرے میں نطقِ کائنات محصور کر دیا۔ ارسطو کا اندازِ فکر سوفسطائیت ہے اور اعتماد کے ساتھ اس کی منطقی توجیہہ کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ مقولاتِ عشر کو فارسی زبان میں موزوں کیا گیا ہے وہ اس طرح سے ہے :-

موجود منقسم بہ دو راست نزدِ عقل
یا واجب الوجود یا ممکن الوجود
ممکن دو قسم گشت ہماں ہر دو عرض
جوہر بہ پنج قسم شد اے ناصح عفود
جسم دو واصل او کہ ہیولیٰ و صورت او
پس عقل و نفس ایں ہمہ را یاد گیر زود
نہ قسم شد عرض تو بداں ایں دقیقہ را
الحال بحث و جوہر عقل بہ من نمود
کیف و کم و اضافت این و متیٰ و وضع
ہم فعل و انفعال دگر ملک آنچہ بود

پس واجب الوجود از یں ہا منزہ است
کو ہست و بود در باشد و ایں ہا ہمہ نہ بود

ان منطقی تجزیوں کے بعد ان کی مبتدا و خبر میں اس قدر الجھاؤ ہیں کہ عقلِ سلیم اس کو قبول نہیں کرتی یہ حقیقت ہے کہ تعقل پرستی کسی حال میں بھی ہیولیٰ وصورت کا حتمی و معقول فیصلہ نہیں کر پاتی نتیجتاً کسی دور میں بھی فلسفی کو اپنے موہوم میں کامرانی نصیب نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ وہ وجود اور روح کے رشتہ کو انفصالی حیثیت دے کر انسانی ذہن کو سوفسطائیت کا جہنم بنا دیتے ہیں اور یہی منطق اور علم الکلام تصورِ توحید کو جو کہ اسلامی دائرہ میں ایک واضح حقیقت نظر آتا ہے ان کے لئے ایک لاینحل معمہ بن کر رہ جاتا ہے۔ فکری تجدید و تربیت کے لئے ذہنی الفاظ صرف اسلام دیتا ہے اور یہ ایک نظام عالم اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے کہ کوئی قدر مشترک اس کی دنیا بھر کے مذاہب کے بس نہیں ہیں۔ یہ ایک ترقی پسند تہذیبی وراثتیں بنی نوع انسان کو دیتا ہے کہ جن کے ذہن و فکر تعقل پرستی کا شکار نہیں ہوتا اور ایک بین اور جامع پروگرام کی طرف دعوت دیتا ہے زندہ مذہب وہی ہے کہ جس کی تعلیمات عصری تقاضوں کے مطابق ہیں۔ تعقل پرستی نے سرا سر انسان کو ایک عضوِ معطل بنانے کی سعی کی ہے وہ علوم و فنون جو محض ذہنوں کی بحث و بیر کا نتیجہ ہوں وہ کسی دور میں بھی کوئی سرمدی پیغام نہیں دے سکے بلکہ انہوں نے ذہنی سکون اور قلبی طمانیت چھین لی ہے حقیقت یہ ہے کہ غیر یقینی فضاؤں جن ممکنہ مسلمات کی تدوین کرنے میں وہ از حد مضحکہ خیز ہے اور انہی متشککین و فلسفیین کی بیمار و مضمحل سوچیں

اپنے ہی ذہنوں میں ان کی متعفن لاشیں اٹھائے پھرتے ہیں اور ان کا فکری و تجریدی ترکہ حنوط شدہ لاشیں ہیں کہ جنہیں دیکھ کر سامانِ عبرت تو ہے۔ مگر ان سے کچھ اکتساب واخذ کرنا ناممکن ہے آپ ان حنوط شدہ لاشوں پر عقیدتوں کے گلہائے رنگا رنگ بلاشبہ نچھاور کیجیے یہ ذہنوں کو قطعاً جلا نہیں دے سکتیں وہ شعروادب جو روحِ عصر کا ترجمان نہیں ہوتا ہرگز ہرگز ادبیات کی تاریخ میں اس کا عنوان زندہ نہیں رہتا شاعر یا ادیب اور مفکر جب تک معقولیت اور سنجیدگی کے ساتھ اجتہاد وفکر نہیں کرتا وہ کوئی ایسا پیغام تہذیبی و تمدنی ادوار کے دائروں سے نکل کر انفرادی حیثیت سے نہیں دیتا۔ اس کی تخلیقی کاوشیں تضیعِ اوقات کے سوا کچھ نہیں ہوتیں، قوموں کی تہذیبی و تمدنی وراثتیں ہر دور میں استعدادِ تغیر کی متقاضی ہوتی ہیں۔ اگر ایسا نہیں تو اسلاف کے تمام ورثے آثار قدیمہ تو بن جاتے ہیں اور تاریخی حیثیتوں کو واضح تو ضرور کرتے ہیں۔ لیکن حال و مستقبل کی ذہین نسلیں ان سے کچھ اخذ واکتساب نہیں کر سکتیں، وہ قوم اور ملت کی بنیانِ مرصوص نہایت ثقہ روایات سے عبارت ہوتی ہے۔ اسے اپنی وراثتوں کی حفاظت کرنا ہی ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو حوادث و سانحاتِ فکری و ذہنی اسے مرکزیت سے دور پھینک دیتے ہیں۔ مگر ملی روایات کا سرمایہ افراد کی ذہنی و فکری ژولیدگی سے تلف اور ضائع نہیں ہو پاتا۔ البتہ افراد کا اتلاف ضرور ہو جاتا ہے ویسی روبہ انحطاط تعقل پرستی سے محفوظ رہنے کے لیے روحِ عصر کے لئے ایک حریمِ ذات کی ضرورت ناگزیر ہے کہ جس میں طبعی حرارت کا لمس، تہذیبی وراثتوں کو جسدِ ملت میں ہمہ وقت جاری و ساری رکھتا ہے روح

عصر پروہ روائیت ہے کہ جو اقوام عالم کی نبض میں زندگی کی طرح سرائیت کی ہے جدیدیت کے بعید از فہم تقضیئے اور بغاوتوں کے طوفان اور ملی شعور سے قطعی طور پر بے بہرہ ہو جائے۔ تو سراسر عمل معکوس ہے، اور وہی تہذیب نا آشنا تصور رہے جہاں سے مصلحان قوم اور راہبران ملت نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا، اگر اسی کا نام ترقی پسندی اور جدیدیت ہے تو غور فرمائیے کہ اس کائنات رنگ و بو میں وہ نفوس قدیر کیوں آئے کہ جنہوں نے گمراہی کی تاریکیوں کو دُور کرنے کے لئے مشرق انوار سے ہزاروں آفتاب طلوع کئے۔ ہر دَور کو منور کر کے رکھ دیا حقیقت یہ ہے کہ روح عصر ہر زمانہ میں ایک ہی وجودِ ممکنات سے منسلک اور پیوستہ رہتی ہے۔ محض اظہار و ابلاغ کے کچھ انداز ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے افراد کا تناظر سرمایوں میں گم ہو جاتا ہے۔ اگر عقل سلیم تعقل پرستی میں گم نہ ہو جائے تو ماضی کی تصاویر ہمیشہ جلوہ آرائیوں سے انسانی توجہات کو اپنی طرف منعطف رکھتی ہیں۔ تہذیبی وراثتیں اس پرانے کیلنڈر کی طرح نہیں ہوتیں کہ ہر سال اس کو دیوار سے ہٹا کر نئے سال کا کیلنڈر لگا دیا جائے۔ روحِ عصر کے لئے جہتیں تو بدل سکتی ہیں، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ خود روحِ عصر کی معنویت ہی بدل جائے۔

روح عصر کو متکلمین اور فلسفین کے بعد جس نے سب سے زیادہ مجروح کرنے کی کوشش کی وہ فلاسفہ کا گروہ تھا کہ جن کا تبحر علمی بھی تعقل پرستی سے نہ بچا سکی۔ اور افکار کی گمراہی میں زندگی بھر بھٹکتے رہے۔ اور کھل کر ان کی تعقل پرستی انہیں منظرِ عام پر لے آئی۔ فرقہ ملامتیہ دراصل ایک ردِ عمل تھا۔ ان علومِ

عقلیہ کا جو مسلمان مفکّرین الکندی فارابی بو علی سینا اور ابن طفیل کے توسط سے افلاطون اور ارسطو کے فلسفیانہ عقائد کی روشنی میں اسلامی نظریات کا مطالعہ کر رہے تھے اور ان کی سطحی سی حیثیت نے نظریہ ظاہر مسلمان علماء و فضلاء کے ایک گروہ کو بہت متاثر کیا نویں صدی میں بایزید بسطامیؒ کے دبستان فکر میں زندگی کو تعقّل پرستی کی نذر کر دیا اور عقیدہ فنا تخلیق ہوا، اس کا ماحصل یہ تھا کہ زندگی از سرتاسر مصائب و شدائد کے سوا کچھ بھی نہیں اور یہ نجات کی راہ میں ایک سنگین دیوار کی طرح حائل ہے یہ عقیدہ کلیتہً اسلامی نظریہ حیات سے متناقض تھا، بارھویں صدی کے وسط میں افلاطونی فلسفیہ سے ابن عربی ایسا متاثر ہوا کہ وحدت الوجود کے نظریہ کو تصوف کا ایک اہم مسئلہ بنا دیا، اور یہی نظریہ امام غزالیؒ اور دیگر علمائے علوم عقلیہ کے نزدیک ایک عقیدہ کی صورت اختیار کر گیا اور جس کو بلا تاخیر اسلامی عقائد میں شامل کر لیا گیا" اور اس سے اہل تصوف عجمی تصرفات اور ذہنی و فکری وارستگی میں گم ہو گئے۔ اور حقیقت میں قرآن حکیم سے ایسے دُور ہوئے کہ ان کے مستعار عقائد نے اوّلیت کی صورت اختیار کر لی اور تعقّل پرستی کے سبب دین اسلام کی سادہ دلنشین تعلیم ان کے اذہان سے مٹتی چلی گئی اور خود ساختہ نظریات کا سہارا لے کر ان میں سے ایسے ایسے تعقّل پرست منظر عام پر آئے اور ان کی فتنہ سامانیوں نے عقیدوں کی ایسی ایسی صورتیں وضع کیں۔ کہ اسلامی عقائد کی عظیم عمارتوں میں ______ "وحدت الوجود ایک ایسا نظریہ ہے کہ انسان کے اندر۔ ایجابی و سلبی قوتیں از خود انسانی مشیت کو اپنے تابع رکھتی ہیں ان آشوب کاریوں میں اعمال حسنہ و شنیعہ کا وجود بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس مسخ

شدہ یونانی فلسفے سے متاثرین کا گروہ گناہ و ثواب، تہذیبِ نفس اور تمدنی اصولوں سے قطعاً لاتعلق ہو کر اور فنا کے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ جہاں ان کی ذات کی قطعی طور پر نفی تھی یہ لوگ تشکک و تیقن سے بھی ماورا تھے۔ اسلام کے اندر اس فرقہ نے ایسی آزاد روی اختیار کی کہ جس کی نظیر نہیں ملتی اور ان کو شعائرِ اسلام سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ بلکہ بدھ مت اور ہندو فلاسفی کو اپنا نظریۂ نجات بنا لیا تھا اور ایسی ایسی تعقُّل پرستی کے زیرِ اثر ہو کر انہوں نے موشگافیاں کیں کہ اسلام کے سوادِ اعظم کے لئے ایک مستقل خطرہ بن گئے۔ انہوں نے نجات اور خدا تک پہنچنے کے لئے مجاز و حقیقت کی پرپیچ و اور تلذذ پرستی کی راہ اختیار کر لی اور اپنی حسن زجماں کی منطقی تشنگی کی تسکین کے لئے مذہب اور تہذیب کی ہر قید اور قدغن سے آزاد ہو گئے۔ سفلی جذبات پر حقیقتوں کے عنوان چسپاں کرتے چلے گئے اور ان کی شوریدگی نے کبھی شعر و ادب کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا اور کبھی سازوں کی لے پر مادر زاد ننگے ہو کر رقص کیا۔ منشیات کے استعمال اور مدہوشی و بدمستی کو درجہ فنا کہنے لگے۔ اب ذرا غور فرمائیے ان لغویات کو روحِ عصر سے کیا تعلُّق ہو سکتا ہے۔

اسلامی افکار کو ان منفی عقیدوں سے دُور کی بھی نسبت نہیں ہے۔ اسلام سرتاسر ایک فعّال حیثیت کا مبلغ مذہب ہے وہ انسانی شرف کے لئے ایسے واضح اصولوں کی تعلیم دیتا ہے کہ جس سے زیست اور کاروبارِ زیست عینِ شعائرِ اسلامیہ کا مظہر بن جائے۔ وہ محکمات و بیّنات میں قطعاً قیاس اور تردد کو گوارا نہیں کرتا اور معاشرت و معیشت کے لئے اخلاقِ حسنہ کا درس دے کر ایسا معاشرہ عالمِ وجُود میں لاتا ہے کہ جس میں زندگی بے مصرف نہیں ہے۔ وہ تو فعالیت کا علمبردار ہے اور دین و دُنیا

کو متوازن رکھنے کے لیے سفرِ حیات کو نئی نئی منزلوں کا سُراغ دیتا ہے۔ قنوطیت یا سبیت اس کے دریات سے خارج ہے۔ اس لئے تو حضورؐ سرورِ کائنات نے فرمایا ہے:

کہ "دُنیا آخرت کی کھیتی ہے جیسی جیسی کرو گے اس کا اجر اسی طرح ملے گا۔"

اور یہی فطری اصول ہیں جو ہر دَور میں روحِ عصر نظر آتے ہیں۔ اقبال کی ہمہ جہت فکری سلامت روی انہی آشوب کاریوں سے الجھتی ہے۔ وہ ملّتِ بیضا سے ناامید نہیں بس "ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بہت زرخیز ہے ساقی"۔ وہ تو ہر حال میں مسلمانوں کے اندر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا شکوہ اور شہامتِ نفس دیکھنا چاہتے ہیں فرماتے ہیں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

اقبال اس فلسفۂ حیات سے بیزار ہیں۔ جو ملّت کو اپنے مقام سے گرا دے اور اس تعقّل پرستی سے پناہ مانگتے ہیں جس میں قیاس آرائیوں کے بے ثبات دلائل کار فرما ہوں۔ وہ تو اس جنوں انگیز جذبوں کو پسند کرتے ہیں جو سود و زیان سے بے نیاز ہو کر انسان کو روشن تر منزلوں کا سُراغ دیتے ہیں کہتے ہیں

ذاتِ او توجیہِ ذاتِ عالم است
از جلالِ او نجاتِ عالم است
ذرہ ذرہ خورشیدِ او از سایہ اش

قیمتِ ہستی گراں از مایہ اش
زندگی بخشد ز اعجازِ عمل
می کند تجدید اندازِ عمل
جلوہ ہا خیزد ز نقشِ پائے او
صد کلیم آوارہ سینائے او
زندگی را می کند تفسیرِ نَو
می دہد ایں خواب را تعبیرِ نو

اقبال کی روح میں لا انتہا کرب اس لازوال عشقِ صادق کا ہے جو انہیں حضورِ اقدس ﷺ کی ذاتِ والا صفات سے تھا۔ وہ فلسفی ہیں ان کے تخیّل میں ارسطو اور افلاطون رقصِ بسمل کا منظر پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان کی عقلِ سلیم عشق کے شعلہ زار سے ہو کر گذرتی ہے ان کی سرمستی و جذب کی نسبت خمِ حجاز سے مربوط ہے۔ ان کی آہِ نیم شبی اور نالۂ صبحگاہی اس سوزِ دروں کا غماز ہے جہاں دل ربودگی کے مظاہر سلمان فارسیؓ اور اویس قرنیؓ اور انہیں یقین و آگہی کے چشموں سے وہ آفتابِ عالم تاب طلوع ہوتے ہیں کہ تیرہ و تار راہیں جگمگا اٹھتی ہیں۔ وہ اقوامِ عالم کو انہی اجالوں میں جانے کی دعوت برملا بے انتہا یقینِ محکم کے ساتھ دیتے ہیں۔ عرفانِ نفس کشفِ اسرارِ الٰہیہ کا ایک بکر کس انداز سے پیش کرتے ہیں۔

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے
وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے
مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

علم و فلسفہ کی بے انتہا آشفتہ ساما نیاں اور متزلزل منزلوں کے موہوم سے نشان دیکھ کر کہتے ہیں

یا حیرتِ فارابی یا تاب و تبِ رومی
یا فکرِ حکیمانہ یا جذبِ کلیمانہ
یا عقل کی روباہی یا عشقِ یداللٰہی
یا حیلۂ افرنگی یا حملۂ ترکانہ
یا شرحِ مسلمانی یا دیر کی دربانی
یا نعرۂ مستانہ کعبہ ہو کہ بت خانہ
میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

اب ملاحظہ فرمائیے کہ اقبال کی ذات میں جو سوز و ساز ہے وہ روحِ عصر کی حرارتِ طبعی کا غماز نہیں ہے۔ حقیقتاً روحِ عصر ان فکری و ذہنی سلامت رویوں کا نام ہے جو اپنے اجتہاد سے ہر آن ایک

ایک نئی کائنات کا سراغ دیتا ہے اور اسی کو دوسرے لفظوں میں تسخیرِ کائنات کہہ لیجئے۔ فلسفہ اور تشکک کی ہزیمت اس یقین کامل سے ہوتی ہے جو شعائرِ اسلام کے محکمات سے عالم وجود میں آتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

اقبال حالت جذب و کیف میں کہتے ہیں

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

روحِ عصر سے ہم آہنگی و ہمنوائی وہی شعر و ادب ہے جو ہر دور میں ذہنوں کو اجالے دے اور تعقل پرستی کے اندھیروں سے ذہنوں کو کملانے نہ دے یہ ہے وہ اجتہاد جو اقبال نے عقل سلیم کے ساتھ کیا۔

دل ربودگی اور عشق میں قلب و روح کا کرب پیہم اور تعقل پرستی میں ذہنی اضطراب پیہم بظاہر دونوں کیفیتیں عدم سکون اور ناشکیبائی کا حاصل ہیں

دونوں کا تعلق ایک ہی معنوی جسم سے وابستہ ہے لیکن دونوں کے زاویۂ نظر اتنے مختلف ہیں کہ جن کا کسی طرح بھی آپس میں کوئی ربط نہیں ہے اوّل الذکر کا کرب پیہم اپنے سامنے ایک مشہودِ نظر رکھتا ہے اور ان امید و بیم کے حقیقی تاثرات سے دو چار ہے مگر تعقّل پرستی کا ذہنی اضطراب پیہم کسی بھی شاہدِ تعیّن کا سراپا نہیں دیکھ پاتا اور لمحہ بہ لمحہ اندھیروں کے نشیبوں میں اتر تا چلا جاتا ہے اور فلسفہ کی تیز آنچ حقائق کے بیّنات کو اس کی نظروں سے اوجھل کیے ہوئے ہے چوں کہ علامہ اقبال کا محور اسلامی تعلیمات کا دامن نہیں چھوڑتا اس لئے انہیں ہر قدم پر ارض و سما کی واضح سلامتیں انہیں اپنی منزل کا صحیح سُراغ دے رہی ہیں اور جب انہیں عجمی شعور فریب دینے کی کوشش کرتا ہے تو فوراً وہ اپنے روح اور دل کے طاقچوں میں ان شمعوں کو روشن کر لیتے ہیں جو قرآنِ حکیم کی ہر آیت کے مضمرات میں موجود ہیں اور جب مغربی تعقّل پرستی کے معمے انہیں الجھانے کی سعی کرتے ہیں تو ان کا مشہودِ نظر ان کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ بالِ جبریل میں یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں۔

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبالؔ
مقامِ شوق میں کھو یا گیا وہ فرزانہ

دوسری جگہ کہتے ہیں

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیاتِ ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

علامہ کے عشق و سرمستی ہمیشہ تعقّل و فلسفہ سے باہم سرگرم نظر آتے ہیں اور وہ اپنے جنون کی رفعتوں پر عرفان و آگہی کے نت نئے آفتاب طلوع کرتے ہیں اسلامی تاریخ کے معتبر شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کو کجلانے کی ہر کوشش وہ معقولات عشر ہیں جو یونان کی راہ سے بغداد اور ایران پہنچے اور وہاں علمائے حکماء اور فقہا کے اذہان ان سے بے حد متأثر ہوئے اب ذرا ارسطو کے ان الفاظ پر غور کیجیئے تو معاملات کی گتھیاں سُلجھ جاتی ہیں وہ کہتا ہے کہ ہر انسان فلسفہ و تعقّل پرستی کی طرف اس وقت مائل ہوتا ہے جب اسے اقتصادیات سے فراغت ہو اور ضروریاتِ زندگی اُسے آسانی سے مل جائیں، فاتحینِ اسلام نے جب تمام قرب و جوار کے ملک ختم کر لئے جس میں عراق و مصر و ایران بھے تو ان کی مصروفیات ختم ہو چکی تھیں یہ دَور بنو عباسی کا تھا اور سب سے پہلے اسے یونانی اِرتقاء کا دَور کہنا چاہیے خُلفاءِ بنو عباس ہارون رشیدؔ مامون رشید المعظّم کے زمانۂ سلطنت میں بامِ عروج پر پہنچا اور سب سے پہلے فلسفین یونان کو درخورِ التفات سمجھا ان میں ابونصر فارابی ابنِ سینا، اندلس ابنِ رشد اور ابنِ طفیل کے سرِ فہرست آتے ہیں۔ یونانی تعقّل پرستی نے اسلامی حقائق کو بڑا مسخ کر کے رکھ دیا۔ اور اس بگڑی شکل کا نام تصوّف قرار پایا اسی طرح مختلف ملکوں میں اس کے مختلف نام رکھے گئے یہی تعقّل پرستی ہندوستان میں ویدانت کہلائی اور یونان میں اسے باطنیت کا نام دیا گیا۔ اور مفکرینِ اسلام نے اسے تصوّف گردان لیا۔ یہی تثلیث ایک تصویر کے تین رخوں کو سمیٹے ہوئے تھی اور اسی کی آشوب کاریوں نے جاذبِ نظر

مصلحات وضع کر کے عوام الناس کو گمراہ کرنے کی کوشش کی

خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں
نظر اُلجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں
نہ چھوڑ اے دل فغان صبحگاہی
اماں شاید ملے اللہ ہو میں

تعقل پرستیوں کے متعلق علامہ نے کہا۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن، کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق کے معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنے غلام صاحب تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقین اور یقیں فتح باب

علامہ مرحوم نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو ان کے سامنے مسلمانوں کی زبوں حالی پس ماندگی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ انگریز سامراجیت نے ہر جہت سے ہندوستان کو نوآبادی بنالیا تھا۔ ہندو اکثریت نے مغربی تہذیب کو قبول کرنے میں تاخیر نہ کی۔ علماء کا ایک گروہ مصلحت پسندیوں کا شکار تھا اور دوسرا رکوع و سجود تک محدود اسلام کا قائل تھا اور اسلام کی روح اور شعائر اسلام کی حقانیت سے انہوں نے

بھر کر لیا تھا دوسرا گروہ جو مسلمانوں میں روحانی طور پر مرجع عوام تھا وہ تھا صوفیاء کا گروہ جنہوں نے تعقل پرستی کی مسخ شدہ لاشوں کو سینے سے لگا رکھا تھا اور اپنے پُرتکلف زاویوں میں ہزاروں آرائش و آسائش کے سامان فراہم کر رکھے تھے اور تصوّف کی آڑ لے رکھی تھی اور خود کو فنا فی اللہ کا درجہ دے کر اپنی ہستی کا انکار کر دیا تھا اور اس نظریئے کے پسِ منظر میں ان کی حریری خلوتیں کسی طرح شہنشاہوں سے کم نہ تھیں۔

علامہ اقبال منظر شہود پر ایک خاص مشن کی تکمیل کے لیے آئے تھے تو انہوں نے تعقّل پرستی کا گہری نظروں سے مطالعہ مغرب و مشرق کے تعقّل پرستوں کے تمام نظریات کو ذہن میں رکھ لیا انہوں نے صغرا و کبرا کے منطقی شواہد سے اپنے لئے ایک راہ تجویز کی اور اس سفر حیات میں ان کی منزل کھوئی نہیں انہوں نے ملّا و صوفی کی بچھائی ہوئی عقیدتوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ان کے مافی الضمیر سے مسلمانوں کے ہر طبقہ کو آگاہ کیا۔ اور قلم کا جہاد اپنی زندگی کا شعار بنا لیا خودی اور تصوّف کے بے معنی ربط کو واضح کیا وہ سراسر وجود کی معنوی حیثیت کا قائل تھا اور احترام آدمیت کے انداز میں مسلمانوں کے قلب و نظر کو تنقیدی قیود سے نکالا۔ فلسفہ و تعقّل پرستی کے اصنام کو نہایت بے دردی سے توڑ پھوڑ رکھ دیا اور واشگاف لفظوں میں کہا

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ و فِساں لا الٰہ الا اللہ

پھر فرماتے ہیں: ـــ

سردار محمد حیات خان

اقبالؒ کا فلسفۂ خودی

عالمِ اسلام کے لئے بالعموم اور مسلمانانِ برِصغیر کے لئے بالخصوص یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ ۱۹۷۷ء کو پاکستان میں حکیم الامت شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کے صد سالہ یوم پیدائش کے طور پر منایا جا رہا ہے۔ اقبالؒ نے عالم اسلام کو اسلامی فلسفۂ حیات سے روشناس کرایا۔ انہوں نے مسلمانوں میں خدا شناسی اور خود آگاہی کو عام کیا۔ ساتھ ہی دنیائے اسلام کو خود شناسی کے اسرار سے آگاہ کرتے ہوئے فلسفۂ خودی کا درس دیا، فلسفۂ خودی کیا ہے۔ اقبالؒ خود اس کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات خودی کیا ہے بیدارئ کائنات

اقبالؒ کے نزدیک خودی "وحدتِ وجدانی" یا شعور کا وہ روشن نقطہ ہے جس سے تمام انسانی جذبات و خیالات جلا پاتے ہیں اور ایک ترتیب قائم رکھتے ہیں۔ خودی ایک لازوال قوت ہے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیات اور مختلف حالات کے ردِ عمل کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ انسانیت کی معراج اور معرفتِ الٰہی بغیر معرفتِ

نفس کے نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ مرکزی نقطہ ہے جو جسم فانی کو محرک بناتا ہے اور ترقی و بقا کا سرچشمہ بھی ہے، جب تک انسان اپنے نفس کو نہیں پہچانے گا اُس وقت تک خالقِ کونین کے اسرار و رموز سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ معرفتِ نفس یعنی خودی فطرت اور ذاتِ باری کے مابین ایک واسطہ ہے اور اسی باعث یہ ابدی اور غیر فانی ہے۔ خودی سے خدا بے حجاب ہوتا ہے اور خدا سے خودی بے نقاب۔ اقبالؒ کے فلسفۂ خودی نے مغربی فلسفہ کی دُنیا میں ایک زبردست ہلچل مچا دی۔ دراصل اقبالؒ نے ایک ایسے پُر آشوب دَور میں آنکھیں کھولیں۔ جب کہ مسلمان ہر طرف تاریکی اور مایوسی میں ڈوبے ہوئے تھے اور وہ خود بھی اس سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

علامہ اقبالؒ نے گویا اس کیفیت کے سدِّ باب کے طور پر فلسفۂ خودی پیش کیا جس کے تحت عقل و وجدان ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ وہ تکمیلِ حیات کو ایک قوتِ حیات کا رہینِ منت قرار دیتے ہیں۔ اور یہی وہ قوت ہے جو خودی کا روپ دھار کر اقبالؒ کی شاعری میں نمودار ہوتی۔ علامہ اقبالؒ نے ملّت کے فکری تقاضوں کو فلسفۂ خودی کے تابع کرتے ہوئے انسان کو جوہر کامل ہونے کا احساس دلایا۔ اقبالؒ کے اپنے الفاظ میں۔

زمین و آسمان و کرسی و عرش خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

خودی کی ترتیب اقبالؒ تین منازل میں کرتے ہیں۔ ان میں سے پہلی منزل اطاعت ہے۔ دوسری ضبطِ نفس اور تیسری نیابتِ الٰہی۔ اطاعت سے اقبالؒ کی

مراد آئینِ الٰہی اور نظام کائنات کی پابندی ہے۔ ضبطِ نفس سے مراد خواہشات کو مغلوب و محکوم کرنا ہے اور نیابتِ الٰہی سے مراد اس منتہائے مقصود کو پالینا ہے جو انسانیت کی معراج ہے۔ اور یہی خودی جب عقل کے درجوں سے گزر کر عشق کی منزل کو طے کر لیتی ہے تو لازوال ہو جاتی ہے۔ اقبالؒ کے بقول

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریلؑ اگر عشق سے محکم تو صورِ اسرافیلؑ

پس جب انسان اپنے نصب العین کو پالے تو پھر خیال و فکر کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں خودی جذبات و سرور کی گہرائیوں میں ڈوب کر حیاتِ دوام حاصل کر لیتی ہے۔ اس کی مزید وضاحت علامہؒ کے اس شعر سے ہو سکتی ہے۔

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اقبال نے خیال میں زندگی کا اصلی محرک اثباتِ خودی کا جذبہ ہے۔ زندگی ایک ایسی مسلسل حرکت ہے جو نت نئی تخلیق کرتی ہے اور اسی طرح وسعت زندگی کا باعث بھی بنتی ہے۔ خودی انفرادیت سے قطعی مختلف چیز ہے جو ایک روحانی قوت ہے۔

جب وہ خودی کی قوت اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے تو وہ انسان کامل بن جاتا ہے جو اس منزل پر پہنچنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ جہاں سے وہ خدمتِ خلق کا زیادہ سے زیادہ کام انجام دے سکے۔ اور بنی نوع انسان کو اس کی اصلی حیثیت سے آگاہ کر سکے تاکہ انسان اپنی اصلی مقصدیت کو پانے کے قابل ہو جائے۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کی رو سے انسان کی صحیح اور بے داغ تصویر میں فطرت کے بے شمار رنگوں کی پاکیزگی جھلکتی ہے۔ اور وہ انسان کامل بن کر تخلیق کائنات کے پورا کرتا ہے۔

خودی انسانِ کامل کی بُنیاد ہے۔ جسے اقبالؒ نے فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر.... استعمال کیا ہے۔ گو کہ فرد ایک مخلوق اور فانی ہستی ہے لیکن یہ ہستی ایک وجود رکھتی ہے اور اپنے عمل سے پائیدار اور لازوال ہو جاتی ہے۔

اقبال کے نزدیک آدم کی تخلیق انسانی خودی کی تخلیق تھی جس میں ذاتِ باری نے ہر قسم کی قوتیں اور صلاحیتیں پیدا کر دیں۔ فرشتے استعدادِ خودی سے محروم تھے۔ جہاں سے دونوں مختلف راہوں پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ انسان نیکی بدی دونوں سے دوچار ہونے کی وجہ سے جوہرِ کامل کا متلاشی ہوتا ہے اور یہ جوہرِ کامل اقبالؒ کے نزدیک خودی میں پنہاں ہے اور انسان جو کہ خودی کا محافظ ہے اپنے اندر قوتِ کبریائی اور اختیارات کا تمام ممکن سرمایہ لئے ہوئے ہے۔

اقبالؒ کا فلسفۂ خودی خدا کی وحدانیت اور انسان کی کاملیت کو ایک ساتھ موج زن کرتی ہے کہ خالقِ حقیقی کی منشا کو پہچاننا ہی احسن طریقے سے سرانجام دیتے ہوئے اسے اس کا صحیح مقام دلاتا ہے۔ اقبالؒ کا یہی پیغامِ خودی ہم سے پھر ایک ایسے انسانِ کامل کا مطالبہ کرتا ہے۔ جو خودی کی قوت سے متصف ہو کر آج کی اس افراتفری و خلفشار کو دور کر کے انسان کو اس کا اصلی مقام دلا سکے۔

⁂

سید قدرت نقوی

علامہ اقبال اور خودی

اسلام دینِ فطرت ہے اور اس نے انسانی زندگی کے لیے ایک متوازن و معتدل ضابطہ حیات پیش کیا ہے، جس میں زیادہ تر زور عمل پر دیا گیا ہے۔ اسلام نے اسلامی زندگی کے توازن میں دین اور دُنیا دونوں کا لحاظ رکھا ہے دین سے مراد وہ ضابطۂ اخلاق ہے جس پر کاربند ہو کر انسان حقوق اللہ اور حقوق العباد کو کماحقہٗ ادا کرتا ہے۔ دُنیا سے مُراد وہ کاروبار معیشت ہے جس میں مصروفِ عمل ہو کر وہ اپنی زندگی کی بقا کے لیے اسباب مہیا کرتا ہے۔ یہ دونوں عملی پہلو ہیں۔ انہی کے ساتھ دعوت فکر و تدبر بھی دی ہے۔ غور و فکر کے بھی دو پہلو ہیں ایک کا تعلق طبیعات سے ہے اور دوسرے کا مابعد الطبیعات سے۔ اسی لیے کہا گیا ہے "العلم علمان علم الابدان والادیان" علم دو ہیں ایک اجسام کا اور ایک مذاہب کا۔ اسی عمل اور فکر کی بدولت انسان منازل ارتقاء طے کرتا اور اپنی زندگی کو بارآور بناتا ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں اسلامی تعلیم پر مسلمانوں کا عمل متوازن رہا مگر ملکی فتوحات نے انہیں دُنیاوی ترقی سے ہمکنار کیا اور دوسری اقوام سے میل ملاپ

مواقع بہم پہنچائے۔ اس میل ملاپ نے ان کے عملی اور فکری انداز پر اثر ڈالا۔ جس میں تعمیر و تخریب کے مختلف النوع پہلو نمایاں ہوئے۔ جدید علوم و فنون سے آگہی حاصل ہوئی لیکن اس آگہی نے کہیں بصیرت پیدا کی اور کہیں تشکیک و انحراف کی صورت اختیار کر لی اور اسی وجہ سے ملت اسلامیہ کا شیرازہ اختلاف کی نظر ہونے لگا۔

اسلام نے انفرادی و اجتماعی زندگی کے ایسے قوانین و ضوابط پیش کئے ہیں۔ کہ ان پر عمل پیرا ہو کر ایک بہترین معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ابتدائی دور میں ایک فرد بحیثیت انسان اپنے اخلاق و کردار کی وجہ سے ممیز رہتا تھا اور ایسے افراد کا معاشرہ امتیازی خصوصیات کا حامل ثابت ہوتا تھا۔ جب اس کے وجوہ تلاش کئے جاتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں انفرادی و اجتماعی زندگی کا مرکز ایک تھا اور اصول و ضوابط اسلام پر عمل کرنے میں ہر ایک کوشاں رہتا تھا۔

دورِ جاہلیت میں انسانی زندگی کے دو رخ تھے۔ ایک ترک دُنیا یعنی رہبانیت اور دوسرے "بابعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" یعنی عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنا، اور دُنیاوی تنعم سے لطف اندوز ہونا۔ اسلام نے رہبانیت کو ختم کر کے "تزکیہ نفس کے لئے ریاضت و عبادت کے ذریعے تقویٰ و پرہیزگاری پر زور دیا۔ اس کے ساتھ ہی کسبِ معاش اور اکل حلال کو شرط لازم قرار دے کر دونوں کے امتزاج سے بہترین فرد اور بہترین معاشرے کی

دراغ بیل ڈالی، استفادہ، استفاضہ، تمتع اور لطف اندوزی کے لئے حدود مقرر کر کے انسانی نفس کو مطلق العنانی، بے راہروی اور تعیش سے بچانے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی اور معاشرے میں ایک نظم و ضبط قائم ہو گیا فرد نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ آگے چل کر انہی دو رخوں نے عجیب و غریب تشکیلیں اختیار کرنی شروع کر دیں۔

انسان عملی و فکری حیثیت سے بذاتِ خود ایک اکائی ہے۔ یہی اکائی جب اپنے اظہار و نمود کے لئے اپنی باطنی قوت و صلاحیت کو بروئے کار لاتی ہے تو یہ عمل "خودی" کی تعین و تشکیل کرتا ہے۔ اس اکائی کا آغاز ایک روشن نقطے سی ہوتا ہے۔ یہ نقطۂ روشن باز گردانی حرکت میں مصروفِ عمل ہوتا ہے۔ منازلِ ارتقاطے کرتا ہوا اپنے متوازی مقام پر جا کر پھر مقامِ آغاز کی طرف لوٹتا ہے یہی حرکی عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور ہر حرکت اور اس کے عمل سے انسان کے عملی و فکری قویٰ ترقی پاتے ہیں یہ روشن نقطہ اس کے شعور و وجدان کا نقطہ ہے۔ "علامہ اقبال نے اسرار کے دیباچے میں اس کا اظہار اس طرح کیا ہے

"یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ، جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ پراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کا شیرازہ بند ہے۔ یہ "خودی" یا "انا" یا میں جو اپنی عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے۔ جو تمام مشاہدات کی خالق ہے۔ مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی

کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟"

علامہ اقبال نے یہ بات اس لئے کہی کہ مسلمانوں میں ابتدائی نصف صدی ہی میں باہمی آویزش رونما ہونے لگی تھی۔ جس کے عروج کا یہ نتیجہ نکلا کہ بعض افراد دُنیا سے متنفر ہو گئے اور بعض نے حصول دُنیا کے لئے اقتدار و دولت کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ جنہوں نے دُنیا سے نفرت کی انہوں نے اس ریاضت و عبادت کو اپنی پناہ گاہ بنا لیا جو اسلام نے تزکیۂ نفس کے لئے مقرر کی تھی۔ حصول دُنیا والوں نے مُلک گیری اور اس کے ذریعے حصول دولت و تعیش کی راہ اختیار کی۔ انہی دونوں نظریوں نے اسلام میں عجیب و غریب گل کھلائے اور تاریخ کے دھارے انہی کی بدولت رُخ بدلتے رہے۔ آخر کار نتیجہ بے عملی کی صورت میں نمودار ہوا۔

علامہ اقبال نے جب اس بے عملی کا سراغ لگانے کے لئے غور و فکر کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک اولوالعزم قوم کے زوال کے اسباب میں ذہنی انقلاب کو بڑا دخل ہے یہ ذہنی انقلاب "نفی خودی" ہے۔ ہوا یہ کہ باہمی آویزش کے نتیجے میں مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ کائنات موہوم، نفس انسانی بے حقیقت، زندگی بے ثبات اور سعی و عمل لاحاصل ہیں۔ ان خیالات کو حالات اور متصوفانہ شاعری نے تقویت پہنچائی اور گوشہ نشینی، ترک دُنیا یا عیش کوشی کی ترغیب دی۔ یہ احساس ایک خاص کیفیت کی وجہ سے پیدا ہوا۔ یہ کیفیت "احساس وحدت"

کی کیفیت ہے۔

دراصل احساس وحدت ایک ایسی کیفیت ہے جو صاحبان ریاضت و عبادت کے قلوب اور صاحبان فکر و حکمت کے ذہن پر ایک خاص عالم میں آناً فاناً آتی اور گزر جاتی ہے۔ یہ صورت حال زبان قال کی گرفت میں نہیں آسکتی اگر اسے گرفت میں لانے کی کوشش کی جائے تو سوائے لفظوں کے اور کچھ نہیں ہاتھ آتا۔ غضب یہ ہوا کہ اس کیفیت حال کو لباس قال پہنانے کی کوشش کی گئی اور وہ بھی پیرایہ شعری میں، جس کی وجہ سے یہ بہت دلکش اور دلفریب سا نظر آئی یہ "وحدت الوجود" کا نظریہ تھا جس نے شعری لباس میں اپنے حسین جلووں سے ذہنوں کو مسحور کر کے زندگی سے فرار کی راہ دکھائی۔ علامہ نے اس کو "اثبات خودی" کے ذریعے دکھائی۔ علامہ نے اس کو "اثبات خودی" کے ذریعے رد کیا ہے "خودی" دراصل "اثبات خودی" ہے۔

وحدت الوجود کی صرف اتنی حقیقت ہے کہ وجود حقیقی صرف خالق کائنات کی ذات کا ہے۔ باقی ہر شئے کا وجود اعتباری ہے۔ یہ تمام مخلوق جس میں عالم طبعی اور انسان سب ہی داخل ہیں اعتباری اور موہوم الوجود رکھتے ہیں اور یہ سب کے سب اسی نور ایزدی کے پرتو ہیں ان کا انجام یہ ہے کہ وہ آخر کار اپنی اصل سے مل جائیں گے ان خیالات نے جب شعری جامہ پہنا تو ایسا نغمہ بن گئے کہ جس کا سرور و کیف خواب آور ثابت ہوا۔ جس نے پوری قوم کو بے عملی کا شکار بنا لیا۔ علامہ اقبالؒ نے اس نظریے کا مثبت پہلو پیش کر کے قوم کو ابھارنے اور زوال سے نکلنے کی۔۔۔

ترتیب دی۔

حقیقت یہ ہے کہ ساری کائنات پر ایک جوہر حیات بسیط چھایا ہوا ہے۔ اشیاء اسی حیات بسیط کی مظہر ہیں اور اس مظہر یہ حیات بازگردانی عمل اختیار کرتی ہے جس کا آغاز ایک نقطے سے ہوتا ہے۔ وہ ارتقاء کی ... طے کرتی ہوئی اپنے نقطہ ر آغاز کے بالمقابل ایک نقطہ پر آکر ٹھہر جاتی ہے۔ اس سفر میں حیات اپنے مظہر کے توانائی جوہر کو قوی سے قوی تر بناتی ہے۔ یہ جوہر اپنے عمل سے بقا حاصل کرتا ہے۔ حیات کا حیات بسیط میں انضمام و انفصال ہوجاتا ہے لیکن اس حیات کے مظہر کا جوہر اپنے عمل کی وجہ سے باقی رہتا ہے۔ اسی جوہر کا نام نفس ہے اسی نفس کی تعین کا نام خودی ہے۔ خواہ یہ کہیں کیوں نہ ہو لیکن اس کی واضح اور آخری شکل انسان کی خودی ہے علامہ کہتے ہیں :۔

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیداریِ کائنات

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

جب انسان کے دل میں خودی جاگزیں ہوجاتی ہے تو وہ صرف تسخیر زمان و مکان پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ اپنی نبرد آزمائی کے لئے نئے زمان و مکان تلاش کرنے شروع کردیتا ہے۔ خودی کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ وہ ہر دم

سے معروفِ عمل رکھے اور جہانِ تازہ کی تلاش میں سرگرداں پھرے اسی لئے علامہ نے اس دُنیا کو منزلِ اوّلین سے تعبیر کیا ہے۔

خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں   مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں   جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر   طلسمِ زمان و مکان توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود   کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر ایک منتظر تیری یلغار کا   تری شوخیٔ فکر و کردار کا

اس کی تحریص دلاتے ہوئے کہتے ہیں:۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں   ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر   چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا   ترے سامنے آسمان اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا   کہ تیرے زمان و مکان اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں   یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

یہ سب کچھ ایک نصب العین کی تعین ہی سے حاصل ہو سکتا ہے حصولِ مقصد کے لئے ایک جذبہ اور ایک لگن کا ہونا ضروری ہے اسی کا نام عشق ہے نصب العین کی تعین عقل سے اور تکمیل عشق سے ہوتی ہے جس انسان میں یہ دونوں باتیں پائی جائیں وہ خودی کے مدارج طے کر سکتا ہے۔ ایسے انسان کا خاکہ علامہ اقبال نے اس طرح پیش کیا ہے؟

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات   ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل، اسکی نگہ دلنواز — اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقین — ورنہ یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں، گرمیٔ محفل ہے وہ

یہی عشق جو اصلِ حیات ہے مردِ خدا کا عمل اسی سے فروغ پاتا ہے اور یہی اس کے ارتقا اور جہدِ مسلسل کا سبب بنتا ہے۔

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

منتہائے خودی یا خودی کی اعلیٰ ترین منزل تسخیرِ کائنات طلسمِ رنگ و بو زمان مکان کے بعد خالقِ کون و مکان کی بارگاہ میں منزلت کا حصول ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی اور نفی خودی کی مزید وضاحت کے لیے ہم کلام اقبال سے بہت اچھی مثال پیش کرتے ہیں "تیاتر" نظم میں علامہ اقبال نے اداکار کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا ہے ظاہر ہے کہ ڈرامہ کا اداکار اسٹیج پر جو کچھ پیش کرتا ہے وہ اس وقت غیر خود ہوتا ہے وجود اس کا اپنا ہوتا ہے لیکن عمل اس کا اپنا نہیں ہوتا، ہم نے پہلے یہ ظاہر کیا تھا کہ خودی عمل ہی سے متعین ہوتی ہے اس لیے ایک اداکار اپنے

وجود کو غیر کے عمل سے نمود وجلا دیتا ہے۔ تو وہ اپنی خودی کو ختم کر دیتا ہے۔

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود
حیات کیا ہے اسی کا سرور و سوز و ثبات

بلند تر مہ و پرویں سے ہے اسی کا مقام
اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات

حریم تیرا خودی غیر کی، معاذ اللہ!
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبار لات و منات

یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے
رہا نہ تو، تو نہ سوز خودی نہ ساز حیات

آج ہم پھر نفی خودی کا شکار ہیں۔ ہمیں اپنے نصب العین کا تعین کر کے اس کے حصول کی کوشش میں ہمہ تن مصروفِ عمل ہو جانا چاہیے۔ آج ہم نے خود کہنہ و سروں کی نقالی اور کورانہ تقلید کرنے پر مائل کر رکھا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی ذات، نفس اور صفات کا شعور حاصل کریں خود کو پہچانیں اور آگے بڑھیں۔ یہی علامہ اقبال کا وہ پیام ہے جو انہوں نے خودی کے ذریعہ دیا ہے۔

⁂

پروفیسر بشیر قریشی

اقبال کا نظریۂ خودی

صوفی شعرا نفیٔ خودی کے تصوّر کے برعکس اقبال نے اثباتِ خودی

کو اقبال نے اثباتِ خودی ذلت، عرفانِ ذات اور احساسِ ذات بھی کیا ہے

اقبال کے نزدیک خودی خود حیات کا دوسرا نام ہے۔ خودی عشق کے مترادف ہے،

خودی خود تسخیر کا نام ہے، خود سے مراد خود آگاہی ہے، خودی عبادت ہے۔ ذوقِ

استیلا سے خودی ذوقِ طلب ہے خودی ایمان کے مترادف ہے خودی سرچشمہ ر

جدّت و ندرت ہے۔ خودی یقین کی گہرائی ہے۔ یہ ذوقِ حیات کا سرچشمہ ہے اور

ذوقِ تخلیق کا ماخذ ہے۔ خودی کے یہ معانی وصفات اثباتِ خودی کی صورتیں

ہیں۔ جن کا بیان بانگِ درا سے ارمغانِ حجاز تک ملتا ہے۔

خودی جبر و قدر حیات بعد الموت کے موضوع پر تشکیل جدید الٰہیاتِ

اسلامیہ میں اقبال کا ایک خطبہ ہے جس میں یورپ کے بعض مفکرین کا تجزیاتی

مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یورپ کے دانشوروں میں BRADLY ہے جس

نے اس امر کے بہترین شواہد مہیا کیے ہیں کہ خودی کی فی الاصل کوئی حقیقت نہیں۔

لیکن ETHIC AL STUDIES میں وہ خودی کا وجود تسلیم کرتا ہے۔

LOGIC میں وہ خودی کو ایک علمی مفروضے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا

REALITY .APPEARANCE END میں BRADLAY نے خودی کی حقیقت پر گہری نظر ڈالی ہے۔ اقبال نے BRADLAY کے افکار خودی کا تجزیہ کیا ہے۔ اقبال BRADLAY کے انکار خودی سے متفق نہیں BRADLAY سے اختلاف کرتے ہوئے اقبال نے یہ بات واضح کی ہے کہ خودی کو مکانی محدود ٹھہرانا جائز نہیں۔ خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ خودی قیودِ زمان و مکان کی پابندی نہیں، خودی کی وسعتوں اور رفعتوں کا بالِ جبریل کی ایک رباعی میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائیؐ — خودی کی جلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش — خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

اس کارگہِ ہستی میں انسان مجبورِ محض نہیں، وہ مختارِ کل بھی نہیں، جہاں تک خارجی زندگی کے مادی بندھنوں کا تعلق ہے۔ انسان مجبور ہے لیکن داخلی زندگی میکانکی جبر سے آزاد ہے۔ انسان مختار ہے کہ بعض کام کرے، بعض نہ کرے۔ اقبال نے انسانی زندگی میں جبر و اختیار کی تصویر کشی اس طرح کی ہے:-

نہ مختارم تواں گفتن نہ مجبور — کہ خاکِ زندہ ام در انقلابم

اقبال نے نفسیاتی حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ہماری یہ قدرت کہ آزادی و اختیار سے جیسے چاہیں عمل کریں۔ ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ لہٰذا اسلام چاہتا ہے کہ آزادی اور اختیار کی یہ قدرت خودی کی زندگی کا ایک مستقل عنصر بن جائے۔[۷۷] اقبال کے نزدیک نماز سے اسلام کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ خودی

میکانیت سے بچے اور اس کی بجائے آزادی و اختیار حاصل کرے۔ اقبال نے اپنے خطبے بعنوان خودی، جبر و قدر، حیات بعد الموت "میں تقدیر کا مسئلہ بھی چھیڑا ہے۔ SPENGLER نے اپنی کتاب "DECLINE OF THE ST" میں لکھا ہے کہ اسلام میں تقدیر پرستی ہے۔ اسلام بھی خودی کی نفی کا خواہش مند ہے۔ اقبال نے SPENGLER سے بھی اختلاف کیا ہے۔ اور تاریخی شواہد اور فلسفیانہ دلائل سے اس کے بیانات کی تردید کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض حضرات انسانی زندگی کو تقدیر کی زنجیر پہناتے ہیں۔ یہ تاثر بھی عام ہے کہ تقدیر کا لکھا انمٹ ہے اقبال کے نزدیک یہ درست نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایسے لوگوں نے تقدیر اور خودی کے مفہوم کو کم سمجھا ہے۔

معنی تقدیر کم فہمیدہ نے خودی را نے خدا را دیدہ تصور اقبال میں تقدیر کا لکھا انمٹ نہیں اگر ایک تقدیر انسان کے لیے سازگار نہیں تو انسان خدا سے دوسری تقدیر طلب کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ تقدیرات حق اقبال نے ولیم جیمز کے نظریہ شعور سے بھی اختلاف ہے کہ اس سے خودی کی حقیقت کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اقبال نے ڈیکارٹ کے نظریہ کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ڈیکارٹ روح اور جسم دونوں کی ہستی ایک دوسرے سے الگ تھلگ تصور کرتا ہے۔ اقبال ڈیکارٹ سے متفق نہیں، وہ تعامل اور متوازیت دونوں نظریات کو ناکافی خیال کرتا ہے بقول اقبال اثبات خودی ایک جذبہ ہے جو قدرت نے انسان کو ودیعت کیا ہے۔ خودی کا استحکام کار خیر سے ہے، خودی شر سے ضعیف ہوتی ہے۔ خودی کی

اقبال نظم مزہبی بتاتی ہیں ضبط نفس اطاعت الہٰی اور نیابت الہٰی اس سے اقبال کا دیکارٹ سے اختلاف واضح ہو جاتا ہے کہ نیک اعمال کا روحانی نشو و نما سے گہرا تعلق ہے نیک اعمال سے ہی خودی کا دائرہ اختیار بھی روز بروز بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے

اقبال کا خیال ہے خودی عالم مجبور ہیں عالم آزاد ہے۔

ناچیز جہان مہ پروین ترے آگے
وہ عالم مجبور ہے تو عالم آزاد

بے (انتہا ہیں) لیکن تقدیر تو کی طلب اسی صورت میں پوری ہوتی ہے جب انسان تعمیر خودی سے اثر آہ رسا پیدا کر لیتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں۔

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر — خواہ از حق حکم تقدیر دگر
تو اگر تقدیر نو خواہی رواست — زاں کہ تقدیرات حق لا انتہاست
ارضیاں نقد خودی در باختند — نکتہ تقدیر را نشناختند

انسانی خودی اور تقدیر کا گہرا تعلق ہے۔ تعمیر خودی سے وہ صلاحیتیں ابھر سکتی ہیں جو تسخیر فطرت کو ممکن بنا دے۔ اقبال کی نظم روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے میں یہی خیال پیش کیا گیا ہے۔ اطاعت الہٰی خودی کی ایک منزل ہے۔ اطاعت الہٰی میں اختیار کا راز ہے اس لئے اقبال غفلت شعار انسان کو تلقین کرتے ہیں کہ اطاعت الہٰی اختیار کرے۔ اطاعت سے مجبور، مختار بن جاتا ہے

در اطاعت کوش اے غفلت شعار — می شود از جبر پیدا اختیار

تعمیرِ خودی تو انسان کو تقدیرِ یزداں بھی بنا دیتی ہے۔ ارمغانِ حجاز میں اقبال لکھتے ہیں۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے　　　خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں　　　تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

"ضربِ کلیم" کی　　　احکامِ الٰہی میں اقبال لکھتے ہیں کہ مومن تقدیر کا زندانی نہیں ہوتا۔ تقدیر تو اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے۔ تقدیر کا مقلد کبھی خوش اور کبھی ناخوش ہوتا ہے، تقدیر کے پابند تو جمادات و نباتات ہیں۔ مومن فقط احکامِ الٰہی کا پابند ہوتا ہے۔ احکامِ الٰہی کی پابندی اسے تقدیر بدلنے کی قوت دیتی ہے مومن تقدیر کا تابع فرمان نہیں ہوتا۔ وہ تو آپ تقدیرِ الٰہی ہے۔

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں　　　مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی۔

اقبالؒ نے مومن کو خاک زندہ کہا ہے۔ تعمیرِ خودی سے اس کے کردار میں جوشِ عمل کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ جوشِ کردار سے اپنی تقدیر کا راز بھی پالیتا ہے۔

رازہے رازہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز　　　جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر　　　جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

میاں عبدالرشید

مسجد قرطبہ

کوئی دو برس ہوئے میرے ایک دوست کو اقبال خواب میں ملے۔ اس سے پوچھا۔ بھلا میری کونسی نظم بہترین ہے؟ پھر خود ہی فرمایا مسجد قرطبہ۔ واقعی ان کی یہ نظم ان کا عظیم ترین شاہکار ہے۔ یہ نظم آٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ اور ہر بند میں آٹھ شعر ہیں۔ پہلا بند تشبیب کا ہے۔ لیکن عام شعراء کی طرح یہ تشبیب موضوع سے غیر متعلق نہیں۔ بلکہ اس ساری نظم میں ایک منطقی تسلسل پایا جاتا ہے۔ روانی آہنگ اور الفاظ کا شکوہ الگ ہے۔ تہ میں علامہ کا فلسفہ حیات ہے۔ اختتام حسب معمول امید افزا اشعار پر ہے۔

پہلے بند میں زمانہ کو سلسلۂ روز و شب کہا اور اسے حیات و ممات کی اصل فرمایا۔ یہ دو رنگ ریشمی تاگا ہے جس سے حق تعالیٰ اپنی قبائے صفات بنا رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس سے حق تعالیٰ کی صفات کا اظہار ہو رہا ہے۔ پھر اسے ساز ازل کی فغاں قرار دیا اور فرمایا۔ کہ یہ سلسلہ انسان کو دکھاتا ہے۔ کہ اس کی تگ و تاز کے امکانات کس حد تک ہے۔ یعنی وہ کیا کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اور کن بلندیوں تک پہونچ سکتا ہے۔ پھر فرمایا۔ یہ ہمارے لئے کسوٹی بھی ہے۔ اس پر انسان پرکھے جاتے ہیں۔ کھوٹے کھرے الگ ہوتے ہیں۔ جو انسان اس کسوٹی پر پورے نہیں اترتے وہ موت کے

گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ جو پورے اُترتے ہیں وہ بقائے دوام کا خلعت پاتے ہیں انسانی فن کے کمالات کو "معجزہ ہائے ہنر" فرمایا یہ سب عارضی اور فانی ہیں اور ہر طرف فنا ہی کی حکمرانی ہے۔ اگرچہ لوگ آرٹ کے نمونوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔

دوسرے بند میں فرمایا کہ البتہ وہ کام جو کسی مرد خدا نے کئے ہوں وہ فنا سے محفوظ رہتے ہیں۔ وہ ایسے نقوش ہیں جن میں ثبات دوام کا رنگ پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ مرد خدا کا عمل عشق سے تکمیل پاتا ہے۔ اور چوں کہ عشق پر موت حرام ہے اس لئے جس عمل میں عشق کا رنگ ہوگا۔ وہ بھی فنا سے محفوظ رہے گا۔ اب علاّمہ اپنے محبوب موضوع عشق پر آگئے ہیں۔ اس کے بعد عشق کی تعریف میں چھ اشعار لائے ہیں۔ اور ایک سے ایک بڑھ کر ابتدا اس سے ہے کہ عشق زمانے کے سیماب کو تھام لیتا ہے۔ اور آخری شعر میں فرماتے کہ زندگی کے سارے نغمے عشق ہی سے چھوٹتے ہیں۔ مصرعہ ملاحظہ ہو۔

عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات

درمیان میں عشق کو ابن السبیل (مسافر) کہہ کر اس سے ہزاروں مقام بتلائے یہ خام لوگوں کی شراب بھی ہے اور پختہ کاروں اور معززین کا پیالہ بھی فقیہ حرم بھی ہے۔ امیر لشکر بھی۔

کبھی سرمایہ محراب و منبر کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

دم جبرائیلؑ بھی ہے دل مصطفےٰؐ بھی۔ خدا کا رسولؐ بھی۔ خدا کا کلام بھی۔۔۔

تیسرے بند میں مسجد قرطبہ کو حرم قرطبہ کہا اور فرمایا کہ اس کا وجود عشق سے ہے اس لئے یہ ہمیشہ قائم و دائم ہے ساتھ ہی آرٹ کے بارے میں اپنا نظریہ بیان کر دیا کہ :۔

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود۔

پہلے مصرعہ :۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت میں مصوری، تعمیر، سنگ تراشی، ادب اور شاعری، چھ فنوں کو اکٹھا کر دیا۔ پھر جب فرمایا کہ صدا خونِ جگر سے سوز و سرود و سرور بنتی ہے۔ تو اپنے فن کی طرف اشارہ کیا۔ اگر حرم قرطبہ کی فضا دل فروز ہے۔ اقبال کی نوا سینہ سوز ہے۔ فضائے قرطبہ سے دلوں میں حضوری پیدا ہوتی ہے۔ تو صدائے اقبال دلوں کی کشود کا موجب بنتی ہے۔ سینۂ آدم جسے کلام اقبال سوز عطا کرتا ہے عرش معلےٰ سے کم نہیں۔ تمام صوفیاں نے قلب کو عرش تشبیہ دی ہے۔ اسی قلب کی وجہ سے ابن آدم کو وہ سوز و گداز حاصل ہے جس سے فرشتے محروم ہیں۔ کلام اقبال میں یہ سوز کہاں سے آیا ذوق و شوق سے اور ذوق و شوق کیسے پیدا ہوا۔ صلوٰۃ و درود والله ہو سے۔

چوتھے بند میں مسجد کے جلال و جمال کو مرد خدا کے جلال و جمال سے تشبیہ دے کر اپنے محبوب موضوع "مومن" پر آگئے ہیں۔ مومن یعنی رسالت مآب کا تخلق کیا ہوا مثالی انسان مسجد کی تعریف میں ایک شعر فرمایا۔

تیرے در و بام پر وادی ایمن کا نور۔ تیرا منار بلند جلوہ گہ جبریل

باقی پانچ اشعار مردِ مومن کی شان میں ہیں ۔ وہ بھی غیر فانی ہے کیوں کہ وہ بھی عشق سے زندگی حاصل کرتا ہے۔ وہ اسرار جو حکیم و خلیل نے ظاہر نہیں کئے تھے ۔ مردِ مومن کی اذانوں سے فاش ہوتے ہیں ۔ اس کے آگے بڑھنے کے امکانات بے حد و حساب ہیں کیا مصرعہ ہے ۔

اِس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل

تینوں برِاعظم آ گئے ۔ وہ توہم پرستی کے پرانے دَور کو ختم کرنے والا ہے۔ وہ ساقیِ اربابِ ذوق ہے فارسِ میدانِ شوق ہے ۔ اربابِ ذوق کے لئے اس نے ہر قسم کئے ۔ میدانِ شوق و محبت کا وہ شہسوار ہے یعنی اس میں علم و عشق کا حسین امتزاج ہے اور ساتھ ہی وہ مردِ عمل بھی ہے

پانچویں بند میں یہ کہہ کہ

تجھ سے ہُوا آشکار بندۂ مومن کا راز

پھر مردِ مومن کی تعریف میں لاجواب اشعار لائے ہیں ۔ اس کے دنوں کی پتش جہدِ گرمِ عمل ہے اس کی شبوں کا گداز جو راتوں کی عبادت سے پیدا ہوتا ہے اس کا مقامِ بلند، خیال عظیم، سرور و شوق، اور ناز و نیاز، سب گنائے ہیں ۔ پھر اسے بندۂ مولا صفات کہہ کر اس کے ہاتھ کو اللہ کا ہاتھ کہا ۔ ید اللہ فوق ایدیھم، غالب کام پیدا کرنے والا رُکے ہوئے کاموں کا راستہ کھولنے والا اور کام بنانے والا۔ یہ بندہ مولا صفات ہے وہ خاکی مگر اس کی نہاد نوری ہے وہ دُنیا و آخرت سے بے نیاز ہے۔ صرف اپنے مولا کی رضا کا طالب ہے اس کی امیدیں قلیل اور مقاصد

جلیل ہیں۔ وہ گفتگو میں نرم اور عمل میں سرگرم ہے۔ اور صلح و جنگ دونوں میں پاک دل و پاکباز ہے۔ اس کا ایمان پرکارِ حق کا مرکز ہے۔ اور کائنات کی ہر شے اسی کے گرد گھومتی ہے۔ آخری شعر ہے۔

عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ　　حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

چھٹے بند میں مسجد قرطبہ کو کعبۂ اربابِ فن اور سطوتِ دینِ مبین کہہ کے فرماتے ہیں کہ تیرے حسن کی مثال سوائے قلبِ مؤمن کے اور کہیں نہیں ملتی اس کے بعد قلم پھر صحابۂ کرام کی تعریف میں چل نکلا ہے۔ حاملِ خلقِ عظیم اور صاحب صدق و یقین

جن کی حکومت سے فاش یہ رمزِ غریب　　سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں

جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب　　ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خردراہ بین

ساتویں بند میں شاعر کا درد پھوٹ بہا ہے اور وہ مسجد سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں　　آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

اب وہ پوچھتا ہے کیا یہ مسجد جس کے بام و در جلوہ گہِ جبرئیل ہیں۔ اسی طرح بے اذاں رہے گی۔ کیا اب کوئی قافلۂ عشق پھر کبھی یہاں آکر بانگ اذاں سے معمور نہیں کرے گا۔

کون سی وادی میں ہے، کونسی منزل میں ہے　　عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

اس کے بعد مختلف یورپی اقوام کے انقلابوں کی مثالیں دے کر کہتے ہیں کہ

روحِ مسلمان میں ہے آج وہی اضطراب

لیکن یہ اضطراب کس انقلاب کو جنم دے گا؟

رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زبان

اب ہم آخری بند پر پہنچ گئے۔ پہلے دو اشعار حسن فطرت کے بارہ میں ہیں جو ورڈ زورتھ کی یاد دلاتے ہیں۔ بالخصوص دوسرا شعر

سادہ و پرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت — کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب

روسی نظموں کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر اسی "رازِ خدائی" کی طرف آتے ہیں

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب

معلوم ہوتا ہے کہ دریائے وادلکبیر کے کنارے علامہ کو مکاشفہ میں ملّتِ اسلامیہ کا آنے والا انقلاب دکھا دیا گیا تھا۔ لیکن وہ انقلاب کون لائے گا۔ وہ قوم

کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

یوں کہ نقش ہو یا نغمہ خونِ جگر کے بغیر سب نامکمل ہیں۔ اسی لئے انقلاب بھی نہ ہی ہو گا۔ جس کے نقوش ملّتِ اسلامیہ اپنے خونِ جگر سے قرطاسِ دنیا پر رقم کرے گی خونِ جگر کے بغیر کام نہیں بنے گا۔

دیکھیں اب کس ملک کے مسلمان یہ کام سرانجام دیتے ہیں۔

٭

ریاض صدیقی

اقبال کی ایک نظم

اقبال کی حکیمانہ اور نظریاتی شاعری کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب وہ انگلستان گئے۔ یہاں انہیں مغرب کے عقلی علوم خصوصاً قدیم کلاسی کی سائینس اور جدید سائنسی نظریات کے وسیع مطالعہ کا موقع مل گیا تھا۔ غالباً اقبال نے سائنس کے مجموعی نظریات اور معاشرے پر اس کی زبردست گرفت سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ مستقبل کی دنیا خالصتہً سائنس اور حکمت کی دنیا ہوگی۔ اقبال مستقبل کی اس صورت سے بہت مطمئن تھے۔ کیوں کہ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے۔ کہ علوم حکمت اور سائنسی انکشافات کا سرچشمہ قرآن کریم اور حیات طیبہ ہیں چنانچہ مستقبل کی دنیا خالصتاً

اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ اقبال نے جدید سائنسی افکار و نظریات سے جو تاثر قبول کیا تھا اس کا اولین اور مکمل اظہار بانگ درا میں ان کی نظم "محبت" سے ہوتا ہے۔ یہ نظم اپنی تمام معنوی اور فنی خوبیوں کے باوجود جس اصولی نظریہ سے عبارت ہے وہ جرمن فلسفی ہیگل اور شاعر گوئٹے کے ابتاع کی صورت میں راہ پایا ہے۔ ہیگل اور شاعر گوئٹے کے ابتاع کی صورت میں راہ پایا ہے۔ ہیگل کے مطابق خیال وجہ تخلیق ہے۔ اقبال نے ایک جگہ اپنی نظم جلال اور گوئٹے پر تشریحی نوٹ لکھتے ہوئے بتلایا ہے کہ فاؤسٹ میں

اس عظیم شاعر نے انسانی نشوونما کے تمام امکانات کا احاطہ کیا ہے۔ اپنی نظم میں انہوں نے عالم بالا میں گوئٹے کو رومی سے متعارف کراتے ہوئے کم و بیش اسی موضوع کا اظہار کیا ہے کا جس کا ذکر انہوں نے نظم "محبت" میں زیادہ تفصیل سے کیا ہے

سوز ساز جاں بہ پیکر دیدۂ   در صدف تعمیر گوہر دیدۂ

اقبال کے یہاں "خیال وجہ تخلیق" "IDEA IS CREATOR" کی تکرار آخر تک قائم رہی حالاں کہ ان کے عہد میں کارل مارکس اور لینن نے ہیگل کے اس نظریئے کو قطعی مسترد کرتے ہوئے اس کو غیر سائنسی اور تصوراتی مفروضہ قرار دیا تھا اور ساری دنیا میں ردِ ہیگل کی ایک تحریک پیدا ہو گئی تھی۔ مارکس نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ ہیگل الٹا کھڑا تھا میں نے اس کو سر کے بل کھڑا کر دیا اس دور میں اقبال تنہا تھے جنہوں نے ہیگل پر اعتماد کیا تا آں کہ حکیم آئن اسٹائن اور پلانک کے نظریات زمان و مکان اضافیت اور کوانٹم نے مادے کی اکائیت کے تصور کو ثنویت کے تصور سے بدل کر مارکس کے مفروضے کی بنیادیں ہلا دیا اور مادہ کا وہ تصور جو مارکس اور لینن کے ذہن میں مقید تھا اچانک لامعنویت کا شکار ہو گیا۔ اقبال اس طرح سیج پر پورے اترے اور اسی تصور کے تانے بانے سے ان کی نظم "محبت" تخلیق پائی "محبت" کائنات کے وجود میں زندگی بلکہ انسانی زندگی کے بتدریج ارتقا کا سائنسی عمل ہے۔ اور "محبت" اُس عمل کا مرکز ہے لیکن محبت عشق کی مانند اقبال کے یہاں نئی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے نہ کہ ان کلاسیکی معنوں میں جو اردو اور فارسی کی قدیم غزلوں کا شعار رہے ہیں۔ نظم کے سر آغاز میں

اقبال اس کائنات کا ذکر کرتے ہیں جو حیات انسانی کے بغیر موجود تھی جہاں سب کچھ تھا مگر قوتوں کے عمل اور ردِ عمل کی وہ صورت نہیں تھی جس سے ربط و محبت کی ماہیت کا آغاز ہوتا ہے۔ اقبال نے محبت کو قوتوں کے اس معنی میں استعمال کیا جس میں سائنسی اعتبار سے قوتوں اور توانائیوں کا نظام شامل ہے نظم کے دوسرے جزو میں ایک قوت جو شعور اور خیال ہی کے مترادف ہے ظہور پذیر ہو کر کیمیا گر کی علامت اختیار کر لیتی ہے اور اس قوت کی ابتدا ہی ان قوتوں کو متحرک کر دیتی ہے جس کا نام اقبال محبت رکھتے ہیں

سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا
صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے

یہ کیمیا ایک بوقلموں متحرک قوت تھی جس کا اضطراب ذہن جستجو عالم بالا میں اس نسخے کی کھوج لگا رہا تھا جو فرشتے چھپائے ہوئے تھے۔ حیاتیاتی قوت کے اس خام تحرک کے لئے یہ نسخۂ اکسیر اسم اعظم سے کہیں زیادہ مقدس تھا۔

لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ ۔۔۔ چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشم روح آدم سے
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی ۔۔۔ وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسم اعظم سے

تحرک حیات میں بھی وہی ثنویت تھی جو انسان میں موجود ہے چنانچہ یہ قوتِ تسخیر خوبی کا سہارا لے کر اس مقام پر پہنچی جہاں نسخۂ اکسیر اس کے ہاتھ لگ گیا اس کے بعد وہ ساری ارتقائی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا منطقی نتیجہ ظہور آدم تھا۔ ارتقائے ذہن و جسم کے مجبوری منطقے کا مکمل خاکہ ان اشعار میں جھلکتا ہے۔

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی کی
ملک سے عاجزی افتادگی تقدیر شبنم سے

پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

مہوس نے یہ پانی ہستی نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم کو

ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

اس نظم میں جنبش کا لفظ قطعاً طبعیاتی مفہوم میں استعمال ہوا اور بعد کی شاعری میں مسلسل اسی مفہوم کا احاطہ کرتا رہا ہے۔ کائنات کے وجود جو زمان و مکان کی اضافیت سے عبارت ہے سو حیات انسانی کے وجود تک کا یہ پورا سفر جدید طبعیاتی اور .. حیاتیاتی نظریات ہی کی صدائے بازگشت سی عبارت ہے۔ اقبال نے ایک جگہ اپنی تحریر میں تخلیق آدم کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

تخلیق آدم کا نظریہ اس حقیقت کی نفی نہیں کرسکتا کہ کرۂ ارض پر انسان کی تخلیق ارتقا کے نتائج کا حاصل ہے۔ تخلیق آدم سے مراد یہ بتلانا ہے کہ کیوں کہ قدیم ترین عہد کی انسانیت شعور و خود آگہی اور انا یا خودی کا زیور پہن کر نئے عہد میں داخل ہوئی

بحوالہ RECONSTRUCTION OF RELEGIOUS THOUGHT IN ISLAM LAHORE 1960)

خودی جو بعد میں اقبال کی شاعری کی بنیادی قدر بن گئی اپنی خام صورت میں نظم "محبت" پر بھی غالب نظر آتی ہے اس نظم میں یہ اصطلاح قوتوں کے عمل اور ردعمل اور اس کے نتائج کے استعمال کی حدود میں نظر آتی ہے۔ گوئٹے اور ہیگل کے علاوہ نظم "محبت" میں فکری اجزا کا ربط جرمن فلسفی فیور باخ سے تاثر آفرینی کی نشاندہی کرتا ہے۔ فیور باخ نے اسی قوت متحرکہ کا اظہار نغمہ کی علامت سے کیا ہے۔ اقبال نغمہ MUSIC AND MELOTY کے بجائے "محبت" کی علامت سے کام لیتے ہیں۔ فیور باخ لکھتا ہے۔

قبل از شعور والی ابدی زندگی کا وجود اس کے اپنے لئے تھا۔ زندگی کا ہر لمحہ لامحدود ہے۔ یہ ایک نغمہ ہے جس کا ہر لمحہ ایک لے ہے ایک سُر ہے۔"

ذیل کی نظم میں "قوت حیات" نے جب نسخہ اکسیر کو اسم اعظم سے برتر جانا تو اس عمل میں خدا کی منشا بھی شامل تھی۔ اس حقیقت کا اعتراف یوں ضروری ہے کہ اس فلسفہ کا مقصد خدا کی ربوبیت کی نفی ہرگز نہیں ہے۔ اقبال اس خیال سے ہمیں بتلانا چاہتے ہیں کہ تخلیق آدم سے قبل کی کائنات قوتوں کا مجموعہ تھی جس کی توانائی سے شعور کا وہ جوہر چمکا جو اسم اعظم سے قیمتی تھا۔ اقبال ریویو اپریل ۱۹۷۶ء صفحہ ۸۴ پر لکھتے ہیں:۔

"COSMOS BEFOIRE THE FALLWAS A

BUNDLE OF INERTIA and it is

THIS FODSCIOUSMESS THAT

is MORE PYCCIOUS THAN THE-

9sm-e-A3am

زیرحوالہ نظم اقبال کی حقیقی شاعری کا حرف اول اور ان کے شعری ارتقا کے سفر کا پہلا موڑ ہے۔ اس سے قبل کی تمام نظمیں ہندوستانی قوم پرستی اور وطن دوستی کے اس تصور کا اظہار کرتی ہیں جو مغربی فلسفہ غیر فرقہ واریت پر دلیل ہیں یا چند وہ نظمیں ہیں جو انگریزی کے فطرت پرست شعراء مثلاً ٹے نائی سن اور ورڈسورتھ کی نظموں کے تراجم ہیں۔

اقبال کی حکیمانہ شاعری کا مطالعہ نظم محبت" سے شروع ہو کر ارمغان حجاز تک قدیم و جدید سائنسی تفکر خصوصاً ارتقا۔ زمان و مکان۔ اضافیت اور حرکت و عمل کا احاطہ کرتا ہے۔ اس احاطہ کا مقصد اولیٰ جدید سائنسی افکار اور اسلامی نظریات میں منطقی ربط کا تعین ہے۔

مرزا محمد منورؔ

امیر خسروؔ اور اقبالؒ کی ہم زمین غزلیں

میں نے ایک مستقل کتاب "علامہ اقبال کی فارسی غزل" کے عنوان سے مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں قدرے تفصیل کے ساتھ اس امر پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حضرتِ علامہ نے اکابر شعرائے فارسی میں سے کس کس کی غزلوں پر غزلیں کہیں۔ ان شعرا میں سے کس کے مقابل حضرتِ علامہ کی غزل کو کیا حیثیت حاصل ہے۔ کتاب عنقریب معرضِ ظہور میں آئے گی۔ اس کتاب میں ایک ننھا سا باب یہ بھی ہے کہ حضرت علامہ نے خواجہ امیر خسرو کی کون کونسی غزلوں پر غزلیں کہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ برِعظیم پاک ہند میں خواجہ امیر خسرو سے قبل نامور اور صاحب فن شاعر ایک ہی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور وہ ہے مسعود سعد سلمان لاہوری جو فارسی، عربی اور ہندی تینوں زبانوں میں صاحب دیوان تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ عربی اور ہندی دیوان ضایع ہو گئے۔ یا یوں کہیے کہ وہ تاحال اہلِ نظر کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ مسعود سعد سلمان کی غزل سادہ اور بے تکلّف ہے۔ نازک جذبات تو تھے مگر نازک خیالات کو متناسب تر اور متنوّع تر الفاظ، تراکیب اور صنایع بدایع کی مدد سے بیان کرنے کا مرحلہ ابھی آیا نہ تھا حضرت خسروؒ کے بزرگ ہمعصر شیخ مصلح الدین سعدیؒ کی غزل اپنی سادگی، شوخی، معاملہ بندی

اور جذباتِ لطیف و نفیس کی ترجمان تو تھی مگر وہ گہرائی اور وہ گداز اور سپردگی اور استغراق کی کیفیت جو رفتہ رفتہ غزل کی جان بلکہ پہچان بن گئی ابھی تک کسی حافظ کی منتظر تھی جو اسے معیار عطا کرتا — چناں چہ حضرتِ امیر خسروؒ کی غزل کو بھی جو حافظ کے پیشروؤں میں سے ہیں اُسی ادبی و فنی پس منظر میں دیکھنا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت امیر خسرو کے سامنے غزل کے جو نمونے تھے وہ اور تھے۔ اور حضرت علاّمہ کے پیشِ نظر جو نمونے تھے وہ اور تھے اور حضرت علاّمہ تک پہنچتے پہنچتے تو فارسی غزل اپنے انتہائی مدارج اور معارج دیکھ چکی تھی اور جہاں سے چلی تھی وہاں تک واپس تشریف لا چکی تھی ظاہر ہے حضرتِ علاّمہ سرفرازوں کے کاندھے پر کھڑے ہو کر ہجومِ غزل گویاں کا نظارہ کر رہے تھے اور خود بھی صاحبِ نظر تھے اور صاحبِ جوہر نیز پیکرِ فن میں خونِ جگر سمونا جانتے ہیں۔ پیکر پرانا ہو تازہ۔ لہٰذا فارسی غزل کی روایت میں ان کی غزل کو بڑی اہمیت اور شان حاصل ہے۔

امابعد! ذیل میں حضرتِ امیر خسروؒ کی ایک غزل کے چار شعر درج کیے جاتے ہیں۔

شبِ فراقِ سیاہِ مرا سیاہ تر است!   کہ شام تا سحرم زلفِ یار در نظر است
چگونہ تیرہ نباشد ازغم کہ شمعِ مراد!   نمی فروزد از بیں آتشے کہ در جگر است
مگو کہ چند شوی بے خبر ز مستیِ عشق!!   کسے کہ مستیش از عشق نیست بیخبر است
تو مست بودی و خسرو خراب تو سحرے!!   گذشت عمر و ہنوزم خمار آں سحر است

اب اسی زمین میں کہی جانے والی حضرتِ علاّمہ کی غزل کے بھی چار شعر

مرا ز دیدۂ بینا شکایت دگر است ۔۔۔ کہ چوں بجلوہ در آئی حجابِ من نظر است

مثالِ لالہ فتادم بگوشۂ چمنے!! ۔۔۔ مرا ز تیرِ نگاہے نشانہ بر جگر است

ہزار انجمن آراستند و برچیدند!! ۔۔۔ دریں سرا چہ کہ روشن ز مشعلِ قمر است

نوا زنیم و بہ بزم بہار می سوزیم!! ۔۔۔ شرر بہ مشتِ پر ما ز نالۂ سحر است

خواجہ امیرِ خسروؒ کا دوسرا اور تیسرا شعر علامہ اقبالؒ کے مزاج کا ہے علامہ اقبال کا مطلع خواجہ امیر خسرو کا دوسرا ور تیسرا شعر علامہ اقبال کے مزاج کا ہے۔ علامہ اقبال کا مطلع خواجہ امیر خسرو کی غزل کو بآرام و بسہولت دبا جاسکتا ہے مگر اسی غزل میں علامہ اقبال کے وہ شعر بھی ہیں جو خالص اقبالی ہیں اور جو امیر خسرو یا اکثر و بیشتر دیگر فارسی شعراء کی غزل میں نہیں سما سکتے۔

ز انوریاں زمن پا بگِل پیامے گو!! ۔۔۔ حذر ز مشتِ غبارے کہ خویشتن نگر است

اگر نہ بوالہوسی با تو نکتۂ بگویم!!! ۔۔۔ کہ عشق پختہ تر از نالہ ہائے بے اثر است

نوائے من بہ عجم آتشِ کہن افروخت!!! ۔۔۔ عرب ز نغمہ شوقم ہنوز بے خبر است

خواجہ امیرِ خسرو کی غزلوں میں کہیں کہیں مولانا رومؒ کی غزلوں کی جھلکیاں موجود ہیں۔ مگر حضرتِ خسروؒ کی غزلوں کے اشعار میں اور خود باہم غزلوں میں وہ یک رنگی نہیں جو مولانا روم کی غزلوں میں ہے موسیقیت تو دونوں بزرگوں کی غزل پر حاوی ہے۔ بیان عموماً سادہ ہے۔ تقریباً حضرت سعدیؒ کی غزل کی سی سادگی بھی ہے۔ مگر سعدی کی غزل میں لفظی سادگی کے ساتھ معنوی شگفتگی اور شوخی بیشتر ہے اگر اس شوخی کو شرارت کہیں تو جب بھی بیجا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ سعدی زیادہ زندہ

دل تھے نہ بادہ نظر باز تھے اور عشق مجازی کے برتر رمز آشنا تھے۔

حق یہ ہے کہ امیر خسرو کی غزلوں میں اعلیٰ معیار کے اشعار جملہ اشعار کی تعداد کے مقابل از روئے تناسب کم ہیں اور قابلِ معانی اشعار خاصے ہیں۔ شاید عدمِ فرصت اس امر کا باعث ہو۔ بھرپور توجہ کے لئے جس یکسوئی کی ضرورت ہے حضرت خسرو کو میسر بھی کہاں تھی۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک قابلِ لحاظ تعداد ایسی غزلوں کی بھی ہو جن کو فرمائشی قرار دیا جا سکتا ہو۔ ان کی اچھی غزلیں زبان زدِ عام ہیں اور تا حال اہلِ دل کے زبان زد ہیں

تاہم علامہ اقبال کسی شاعر کی جس غزل پر غزل کہتے ہیں وہ عموماً ایسی ہوتی ہے جسے اس شاعر کی اچھی غزلوں میں شمار کیا جانا چاہئے اور جن کو فارسی غزل کی کلاسیکی روایت کی مالک غزلوں کا سنہری اوسط قرار دیا جانا ممکن ہے۔ علامہ "خذ ما صفا و دع ما کدر" کے فن میں طاق نظر آتے ہیں۔ تاہم علامہ نے ان غزلوں سے تعرض نہیں کیا ہے جو زبان زدِ عام ہیں مثلاً "بمزار خواہی آمد" "ارزانی شود" وغیرہ۔ بہرحال ذیل میں حضرت خسرو کی ان غزلوں کے مطلع درج کئے جاتے ہیں جن سے متاثر ہو کر حضرتِ علامہ نے بھی طبع آزمائی کی۔ پوری کی پوری غزلیں درج نہیں کی۔ اہلِ نظر جنہیں ذوقِ موازنہ و مقابلہ۔ پوری غزلوں کے مطالعے پر اکسائے وہ مطلعوں کی مدد سے غزلیں دیکھ سکتے ہیں اور مزید لطف لے سکتے ہیں ذوق شرط ہے۔ نیز شوق۔ شوق بھی وہ جس کا سلیس ترجمہ اشتیاق مالا یطاق ہونا چاہئے۔

امیر خسرو

ہمہ شب غم و بنیاید بدلم کرشمہ سازے　　ز شب الست اینکہ دارم غم و نالہ دراز ے

علامہ اقبال

بملازمان سلطان خبرے دہم ز رازے　　کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دل گدازے

(پیامِ مشرق ص ۱۷۶)

علامہ اقبال کے شعر کا پہلا مصرعہ خواجہ حافظ کے آہنگ کا مالک ہے۔

امیر خسرو

نازکے دیدہ ام آں رخ بچو لالہ را　　سوزم و بر نیاورم پیش تو آہ و نالہ را

علامہ اقبال

اے کہ ز من فزودہ گرمی آہ و نالہ را　　زندہ کن از صدائے من خاک ہزار سالہ را

(زبورِ عجم ۔ ۹)

امیر خسرو

مہ من خراب گشتم ز رخت بیک نظارہ　　نظرے ز تو عفا اللہ چہ ہیبت ستارہ

علامہ اقبال

دل و دیدۂ کہ دارم ہمہ لذت نظارہ　　چہ گنہ اگر تراشم صنمے ز سنگ خارہ

(زبورِ عجم ۔ ۱۸)

امیر خسرو

نہ کنم ز عشق توبہ کہ حریف گناہ دارم　　چہ کنم نمی توانم دل خود نگاہ دارم

علامہ اقبال

تو بایں گماں کہ شاید سر آستانہ دارم | بطواف خانہ کارے بخدائے خانہ دارم

(بہ تبدیل قافیہ) (زبور عجم - ۲۸)

امیر خسرو

بر رخِ بچو ہیش طرہ چوں شب نگرید! | انگبین در لبِ شیرینش لبالب نگرید!

علامہ اقبال

بر جہاں دلِ من تاختنش را نگرید | کشتن و سوختن و ساختنش را نگرید!

(بہ تبدیلِ قافیہ) (زبور عجم - ۵۱)

امیر خسرو

مبارک ماہ، ماہِ روزہ داراں! | بداں مستی فزائے ہوشیاراں

علامہ اقبال

زمستاں را سر آمد روزگاراں | نواہا زندہ شد در شاخساراں

(زبور عجم - ۵۲)

امیر خسرو

سنئے گز تو گشد مردِ ستم نتواں گفت | نام بیدا دِ تو جز لطف و کرم نتواں گفت

علامہ اقبال

رمزِ عشقِ تو بارباب ہوس نتواں گفت — سخن از تاب وتبِ شعلہ بہ خس نتواں گفت

(بہ تبدیلِ قافیہ) — (زبورِ عجم)-۶۷

امیر خسرو

من و شبہا و یادِ آں سرِ کوئے کہ من دارم ! — دلم رفتست و جاں ہم میرود سوئے کہ من دارم

علّامہ اقبال

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم — کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

(بہ تبدیلِ قافیہ) — (زبورِ عجم-۹۲)

امیر خسرو

مرا بسوئے تو پیوند دوستی خام است :: — بآفتاب ز ذرہ چہ جائے پیغام است

علّامہ اقبال

زمانہ قاصدِ طیارِ آں دل آرام است — چہ قاصدے کہ وجودش تمام پیغام است

(زبورِ عجم)

امیر خسرو

سرم فدائے چوں تیغ تو گردِ سر گردد — دلم نماند کہ تیرِ ترا سپر گردد

علّامہ اقبال

جہانِ ما ہمہ خاک است و پے سپر گردد — ندانم ایں کہ نفس ہائے رفتہ بر گردد

(زبورِ عجم۔ ۱۱۹)

امیر خسرو

خطابِ طلعتِ تو نامہ زمین کردند فرشتگاں ہمہ بر دو بیت آفریں کردند

علامہ اقبال

دمِ مرا صفتِ بادِ فرودیں کردند گیاہ را ز سرشکم چو یاسمیں کردند

(زبورِ عجم۔ ۱۶۸)

اِنتظاریہ

نصیر احمد ناصر

اقبال کا فلسفۂ دید و نظر

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ ہر فلسفے کی بُنیاد جب بھی رکھی جاتی ہے تو کسی نہ کسی مفروضے ہی پر رکھی جاتی ہے، چنانچہ علامہ اقبال نے اپنے فلسفہ کی بُنیاد جس مفروضے پر رکھی ہے وہ یہ ہے کہ دید و نظر کی اصل حقیقت عشق ہے:

عشق از لذّتِ دیدار سراپا نظر است　　　حسن مشتاق نمود است و عیاں خواہد بود

(پیامِ مشرق، ص ۲۳۲)

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں جب بھی کوئی دیدہ ور یا دانائے راز پیدا ہوتا ہے تو اس کا ظہور بزمِ عشق ہی سے ہوتا ہے:

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات　　　تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں!

(زبورِ عجم، ص ۱۰۳)

اس دانائے راز کے لیے علامہ نے عارف، اہلِ نظر، دیدہ ور وغیرہ الفاظ مترادفات کے طور پر استعمال کیے، مثلاً:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(بانگ درا، ص ۳۰۶)

یہ صحیح ہے کہ یہ "دانائے راز" یا دیدہ ور شخص ہی علامہ کا مردِ کامل یا مثالی انسان ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس سے ان کی مراد کیا ہے؟ بالفاظ دیگر وہ کون سا راز ہے جس کے معلوم کر لینے سے انسان "دانائے راز" یا عارف کہلاتا ہے، اور وہ کون سی چیز ہے جس کے دیکھنے سے اسے "دیدہ ور" یا اہلِ نظر کہتے ہیں؟ علامہ نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے اسے ان کے فکری پس منظر کے تناظر میں جامع طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے اس حدیث قدسی پر غور کر لینا ہوگا:-

کُنتُ کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق (بخاری)۔

(میں تمام حسین صفات کا) چھپا ہوا خزانہ تھا، چنانچہ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، لہٰذا میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔ اس حدیثِ قدسی ہم بآسانی ان نکات کا استنباط کر سکتے ہیں:-

اولاً: اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی معرفت و مشاہدہ کے لیے مخلوقات کو پیدا کیا ہے۔

ثانیاً: پیدائی و آشکارائی خود وجودِ حقیقی کا فطری تقاضا ہے۔

ثالثاً:- اثبات وجود کے لیے نظر و دید ناگزیر ہے۔

رابعاً: زندگی کی غایت حقیقی خدا کا مشاہدہ یا اس کی معرفت ہے۔

یہ حقیقت علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں اس طرح بیان کی ہے:

گفتمش موجود و ناموجود چیست؟   معنیِ محمود و نامحمود چیست؟

گفت موجود آنکہ می خواہد نمود — آشکارائی تقاضائے وجود

زندگی خود را بخویش آراستن — بر وجودِ خود شہادت خواستن

انجمن روزِ الست آراستند — بر وجودِ خود شہادت خواستند

(جاوید نامہ، ص ۱۳)

"معنی محمود و نامحمود" کے متعلق تو بحث اپنے مقام پر آئے گی اس جگہ آخری شعر کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ یہ قرآن حکیم کی آیت الستُ بربِکم قالوا بلیٰ شہدنا (۲:۷) کی طرف تلمیح ہے، جس میں یہ راز حقیقت آشکارا کیا گیا ہے کہ انسان کی فطرت ہی میں ذاتِ خداوندی کا علم مضمر ہے کیوں کہ اس کی روح دنیا میں آنے سے پہلے ہی مشاہدہ حق کر چکی ہوتی ہے۔ علامہ نے اپنے تصور کی تشریح جمالیاتی نقطہ نظر سے بھی کی ہے۔ ان کے نزدیک ہستی سے عبارت حسنِ حقیقی کے مشاہدے سے بہرہ مند ہونا ہے:

چیست بودن دانی اے مردِ نجیب؟ — از جمالِ ذاتِ حق بردن نصیب

(جاوید نامہ، ص ۲۲۱)

ہستی کی غایت (حقیقی) اگر حسن سے بہرہ مند ہونا ہے، تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ تخلیقِ ہستی سے کیا مقصود ہے؟ علامہ کہتے ہیں کہ اس تخلیق فعلیت محرک محبوب (یعنی غیر ذات) کی طلب و جستجو ہوتی ہے، تاکہ خالق اس پر اپنی ذات آشکارا کرے، چونکہ محبوب کے مشاہدے کے بغیر خالق کی ذات و صفات کا اثبات ممکن نہیں اس لیے خالقِ حقیقی کی فعلیت کے

تمام ہنگامے حُسنِ نظر ہی کے مرہونِ منّت ہیں۔

آفریدن جستجوئے دلبرے! وانمودن خویش را بر دیگرے!
ایں ہمہ ہنگامہ ہائے ہست و بود بے جمالِ ما نباید در وجود!

(جاوید نامہ، ص ۱۷۷-۲۲۵)

اب اس مسئلہ موجود کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ ہے وجہ وجود خودی کی ماہیت کا سوال۔ یہ سوال چونکہ علامہ کے نظامِ فکر میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے، اس لئے انہوں نے اسے حل کرنے میں بھی غیر معمولی کاوشِ ذہنی سے کام لیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس مسئلے کو سمجھے بغیر علامہ کے فلسفے کو سمجھنا اگر محال نہیں تو از بس دشوار ضرور ہے۔ بہرحال، علامہ کے نزدیک خودی کی اصل خدا ہے، کیونکہ یہ روح خداوندی کا انفاخ ہے، جیسا کہ قرآن حکیم کی متعدد آیات سے مترشح ہے، مثلاً ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ (۳۲:۹)۔ پھر اسے (یعنی انسان کو) مکمل طور پر متناسب و ہم آہنگ بنا دیا اور اس میں اپنی روح سے پھونکا اور تمہارے لئے سامعہ، باصرہ اور قلب بنائے۔ یہ تصور علامہ کے ایک قطعے میں اس طرح پایا جاتا ہے:۔

خودی را از وجودِ حق وجودے خودی را از نمودِ حق نمودے
نمیدانم کہ ایں تابندہ گوہر کجا بودے اگر دریا نبودے

(ارمغانِ حجاز، ۱۶۳)

علامہ نے اسرارِ خودی طبع اول کے دیباچے میں اس مسئلے پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے اور چونکہ اس سے ان کے معہودِ ذہنی کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، لہٰذا اس جگہ ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

"مرکزِ حیاتِ انسان میں "انا" یا شخصیت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ شخصیت ایک تکاشفی اور تجاذبی حالت ہے، جو اس تکاشف کو قائم رکھنے ہی سے قائم رہ سکتی ہے۔ اگر تکاشفی اور تجاذبی حالت قائم نہ رہے تو اضمحلال واقع ہو جائے گا۔۔۔ حیات کیا ہے؟ انفرادیت۔ اس کی اعلیٰ ترین صورت اس وقت "انا" یا خودی ہے جس میں انفرادیت اپنے علاوہ دوسری چیزوں کو اپنے آپ سے خارج کر دیتی اور ایک محیط بالذّات مرکز ہو جاتی ہے۔ جسمانی اور روحانی دونوں اعتبار سے انسان ایک محیط بالذات مرکز ہے لیکن وہ ہنوز مکمّل انفرادیت نہیں۔ اس کا خدا سے جتنا بُعد ہوتا ہے اتنی ہی اس کی انفرادیت ضعیف ہوتی ہے خدا سے سب سے زیادہ قریب کسب سے زیادہ کامل ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ خدا میں جذب ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے وہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ صحیح اور حقیقی فرد ربِ عالم ہی اپنے آپ میں جذب نہیں کر لیتا ہے۔ بلکہ اس پر قابو پا کر خدا کو بھی اپنی خودی میں جذب کر لیتا ہے۔

یہ وحدت وجدان یا شعور کا روشن نقطہ ہے، جس سے تمام انسانی تخیلات وجذبات ونمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ پُراسرار شئے، جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بندی ہے، یہ "خودی" یا "انا" یا "میں" جو اپنے عمل کی رُو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے۔ جو تمام مشاہدات کی خالق ہے، مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد واقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکماء اور علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔"

(دیکھئے دیباچہ "اسرارِ خودی" طبع اول، ترجمہ از چھوٹے لال)

جہاں تک علامہ کا تعلق ہے ان کے نزدیک خودی ہی حقیقتِ مطلقہ ہے، جس سے دیگر خودیوں کا صدور ہوتا ہے۔ بہرکیف میری رائے میں حقیقتِ مطلقہ کا تصور بطور ایک "انا" ہی کے کرنا چاہئے اور اس لئے میرے نزدیک انیتِ مطلقہ

سے اینیتوں ہی کا صدور ممکن ہے۔ یا پھر دوسرے لفظوں میں یوں کہیے اینیتِ مطلقہ کی تخلیقی قدرت کا اظہار، جس میں فکر کو عمل کا مترادف سمجھنا چاہیے، ان وحدتوں ہی کی شکل میں ہوتا ہے جن کو ہم "انا" سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا کائنات کا ہر عمل خواہ اس کا تعلق مادی جواہر کی میکانکی حرکت سے ہو یا ذاتِ انسانی میں فکر کی آزادانہ کارفرمائی سے سب کی حقیقت بجز ایک عظیم اور برتر انا کے انکشافِ ذات کے سوا اور کچھ نہیں۔ لہٰذا قدرتِ الٰہیہ کا ہر جوہر، خواہ اس کا درجۂ ہستی پست ہو یا بلند، اپنی ماہیت میں ایک "انا" ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس اینیت یا خودی کے اظہار کا بھی اپنا ایک درجہ ہے، بڑا اور چھوٹا۔ بایں ہمہ بزمِ ہستی میں ہر کہیں خودی ہی کا نغمہ ہر لحظہ تیز ہو رہا ہے اور ذاتِ انسانی میں اپنی معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی تو اسی لیے حقیقتِ مطلقہ کو انسان کی رگِ جان سے قریب تر ٹھہرایا ہے:

ونحن اقرب الیہ من حبل الورید (۵۰ : ۱۶) کیوں کہ یہ حیاتِ الٰہیہ ہی کا سیلِ رواں ہے جو ہمارے وجود کا سرچشمہ ہے اور جس میں ہم موتیوں کی طرح پیدا ہوتے اور زندگی بسر کرتے ہیں (علامہ اقبال: تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ترجمہ اردو از سید نذیر نیازی، ص ۱۰۹ - ۱۱۰)۔

قرآن حکیم کی رو سے اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اور اس نے اپنی نورانی روح سے وجودِ انسانی میں پھونکا تو اس کے اعجاز سے انسان میں شعور و آگہی پیدا ہوگئی (۲۴ : ۳۵، ۳۲ : ۹)۔ اس تصورِ قرآنی سے علامہ نے یہ استنباط

کیا ہے کہ خودی اسی نورِ الٰہی کا ایک ننھا سا ذرہ یا نقطہ ہے، جو اصلِ حیات ہے:

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است　　زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

(اسرار و رموز، ۱۸)

یہ "نقطۂ نور" جو خودی سے عبارت ہے "قائم بالذات" نہیں ہے، بلکہ عرض ہے اور اس کا جوہر حقیقی نورِ الٰہی ہے:

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود　　باغباں ہے تری ہستی پئے گلزارِ وجود

(بانگِ درا، ۹۶)

بہر کیف یہ نورِ خودی ہی ہے، جو اصلِ حیات ہے اور حیات فی الحقیقت سرورِ وصال اور سوزِ فراق ہی کا دوسرا نام ہے:

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود　　حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و ثبات

بلند تر مہ و پرویں سے ہے اسی کا مقام　　اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات

(ضربِ کلیم، ۱۰۴)

اس قطعے میں علامہ نے تین اہم تصورات پیش کیے ہیں:

اوّلاً: نورِ خودی سے انسان کا باطن یعنی اس کی باطنی آنکھ روشن ہے، جسے علامہ نے شعور، نور، وجدان، عشق وغیرہ کئی ناموں سے تعبیر کیا ہے، جس کے ذریعے وہ ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔

ثانیاً: زندگی کی اصل بھی نورِ خودی ہے اور زندگی درحقیقت اللہ تعالیٰ کے

وصال (یعنی قرب) کے کیف وسرور اور فراق کے درد وسوز کی کیفیت

مدام سے عبارت ہے:

ثالثاً: نورِ خودی ہی سے انسان کی ذات وصفات کا ظہور ہوتا ہے، یعنی اس کی شخصیت وکردار کی تشکیل ہوتی ہے۔

علامہ کہتے ہیں کہ یہ نورِ خودی درحقیقت شعور ہے، جس کے ذریعے انسان ذاتِ الٰہی اور اپنی ہستی کا مشاہدہ اور اثبات کرتا ہے۔ انسان کیا ہے؟ شعورِ ذاتی، یعنی میں اس وقت "میں" ہوں جب مجھے اس حقیقت کا ہو کہ "میں" ہوں۔ یہ شعور جس قدر محکم اور یقینی ہوگا، اس قدر انسان کی خودی بھی محکم، عظیم اور حسین ہوگی۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ شعورِ حاصلِ دینی ہی کا دوسرا نام ہے۔ بہرحال، اگر ہمیں یہ معلوم کرنا ہو کہ ہم واقعی زندہ ہیں یا نہیں، اور ہماری زندگی کی نوعیت کیا ہے، تو ہمیں تین قسم کی نظر سے اپنی خودی کو دیکھنا ہوگا: اول اپنی نظر سے، دوم دوسروں کی نظر سے اور سوم حق کی نظر سے۔ اپنا یہ نظریہ علامہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

زندہ، یا مردہ، یا جاں بلب　　از سہ شاہد کن شہادت را طلب
شاہدِ اول شعورِ خویشتن　　خویش را دیدن بنورِ خویشتن
شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے　　خویش را دیدن بنورِ دیگرے
شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق　　خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق

(جاوید نامہ، ۱۳ - ۱۴)

ان اشعار کے مضمرات پر غور کرنے سے ہم تصوف کے اس معرکہ آرا مسئلے کا حل بھی معلوم کر سکتے ہیں جسے مرزا غالب نے اس طرح پیش کیا ہے۔

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے

حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان جب اپنی خودی کے نور سے اپنی ذات کا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے اپنی ہستی کا شعور ہوتا ہے اور اس طرح وہ خود اپنے آپ کا شاہد بن جاتا ہے لیکن جب وہ اپنی خودی کا مشاہدہ دوسروں کی نظر سے کرتا ہے تو اسے اپنے آئینۂ خودی میں غیر کی ذات نظر آتی ہے اور اس طرح وہ اپنی ہستی پر غیر کے مشاہدے سے استشہاد کرتا ہے۔ نتیجۃً اس میں خود بھی غیر کی ہستی کا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب وہ نورِ حق کے ذریعے اپنا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے ایک طرف اپنی ہستی کی اور دوسری طرف ذاتِ الٰہی کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی معرفت ہے جس کی خاطر اللہ تعالےٰ نے خصوصیت سے انسان کی تخلیق کی (دیکھئے محولہ بالا حدیثِ قدسی)۔ مشاہدے کی اسی نوعیت کو حق الیقین کہتے ہیں، اور شہادت کا یہی مقام ہے جسے قرآن حکیم نے "مقام محمود" سے تعبیر کیا ہے اور جو شخص اس مقام پر فائز ہوتا ہے وہ بھی "محمود" ہوتا ہے۔

ایں چنیں "موجود" "محمود" است و بس ورنہ نارِ زندگی دود است و بس

(جاوید نامہ ۱۵)

انسان جب اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو ایک طرف وہ حسنِ الٰہی کو بے نقاب

دیکھتا ہے اور حسن کی طرف اس کا عشق انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ وہ لمحہ بھر کے لیے بھی حسنِ حقیقی کے نظاروں کی محرومی برداشت نہیں کر سکتا۔ "دیدِ دوست" اس کی روح کی غذا بلکہ عینِ حیات بن جاتی ہے:

زندگی ایں جا ز دیدار است و بس　　　ذوقِ دیدار است و گفتار است و بس

(جاوید نامہ، ۱۸۱)

یہی ذوقِ دیدار ہے جسے علامہ عشق سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کی تشفی حسنِ حقیقی کے مشاہدے کے بغیر نہیں ہوتی:

عشق در ہجر و وصال آسودہ نیست　　　بے جمالِ لایزال آسودہ نیست

(جاوید نامہ، ۲۲۰)

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جنت کی تمام بے مثال نعمتوں اور اس کے حسین و سرور انگیز نظاروں سے بہرہ مند ہونے کے باوجود عشق کو دیدارِ الٰہی کے بغیر قرار نہیں آتا:

گرچہ جنت از تجلی ہائے اوست　　　جاں نیاساید بجز دیدار دوست؛

(جاوید نامہ، ۲۲۱)

اس کی وجہ یہ ہے کہ:

ما ز اصلِ خویشتن در پردہ ایم　　　طائریم و آشیاں گم کردہ ایم؛

(مقام مذکور)

حقیقت یہ ہے کہ اسی گم شدہ آشیاں یا "حسن المآب" کی طلب و جستجو کا نام زندگی ہے:

زندگی ہر جا کہ باشد جستجوست!   حل نشد ایں نکتہ من صیدم کہ اوست!

(جاوید نامہ، ۲۲۳)

اس طلب و جستجو میں، جو عشق سے عبارت ہے اور جس پر بحث اپنے محل پر آئے گی عبادت اور کمالِ زندگی کا راز مضمر ہے، یعنی ذاتِ حق کو دیکھنے کی کوشش کا نام عبادت اور اُس کا بلاواسطہ مشاہدہ حقیقی زندگی ہے:۔

چشم بر حق باز کردن بندگی است۔   خویش را بے پردہ دیدن زندگی است

(جاوید نامہ، ۳۵)

یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہئے کہ علامہ کے نزدیک خودی کا مشاہدہ ہی دراصل ذاتِ حق کا مشاہدہ ہے، جیسا کہ ان کے اس شعر سے متحقق ہے:۔

بر مقامِ خود رسیدن زندگی است   ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

(جاوید نامہ، ۱۴)

یہی مقام معراج زندگی ہے، اس لئے یہی مقصودِ مومن ہے:

مردِ مومن در نسازد با صفات   مصطفےٰ راضی نہ شد الّا بذات

(محل مذکور)

بہر کیف، علامہ کے نزدیک زندگی کی حقیقت اگر طلب و جستجو ہے تو طلب و جستجو کی حقیقت ذوقِ تسخیر کائنات ہے، جو انسان کے کیف و سرور، سوز و درد اور جذب اندروں کا سرچشمہ ہے:

چیست جاں؟ جذب و سرور و سوز و درد

ذوقِ تسخیرِ سپہرِ گرد گرد!

(جاوید نامہ، ۲۰)

جان کی حقیقت معلوم کر لینے کے بعد اب تن کی ماہیت کا سوال سامنے آتا ہے علامہ کے نزدیک تن روح کا پیکر یا محمل نہیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، بلکہ یہ روح کے شیئون یا احوال میں سے ایک شان یا حال ہے، جسے وہ اپنی خود نمائی اور بقا کے لئے تخلیق کرتی ہے:۔

اے کہ گوئی محمل جان است تن ۔۔۔ سرِ جاں را در نگر بر تن متن
محملے نے، حالے از احوالِ اوست ۔۔۔ محملش خواندن فریبِ گفتگوست!

(محلِ مذکور)

یہ احوالِ خودی کے مقاصد کی نوعیت کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں، یعنی خودی کی جیسی خواہش ہوتی ہے ویسے ہی اس کے احوال یا کیفیاتِ جسمانی و قوع پذیر ہوتی ہیں۔ یہ نظریہ، جس کا ابن سینا زبردست نقیب ہو گزرا ہے۔ علامہ اپنے دلکش شعری انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

چیست اصل دیدۂ بیدارِ ما؟ ۔۔۔ بست صورت لذتِ دیدارِ ما
کبک پا از شوخیٔ رفتار یافت ۔۔۔ بلبل از سعیٔ نوا منقار یافت
نے بروں از نیستاں آباد شد ۔۔۔ نغمہ از زندانِ او آزاد شد

آرزوئے کو بزورِ خود شکست ۔۔۔ سر ز دل بیروں زد و صورت ببست

دست و دندان و دماغ و چشم و گوش　　فکر و تخئیل و شعور و یاد و ہوش

زندگی مرکب چو در جنگاہ باخت　　بہر حفظ خویش ایں آلات ساخت

(اسرار و رموز، ۱۱)

اس نظریئے سے علامہ یہ استنباط کرتے ہیں کہ جس چیز کو ہم تن کہتے ہیں، وہ دراصل خودی کا زمان و مکان سے آشنا اور مانوس ہو جانے کی کیفیت ہے:

چیست تن؟ با رنگ و بو خو کردن است　　با مقام چار سو خو کردن است

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور　　چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور

(جاوید نامہ، ۲۰)

زمان و مکان کا یہ شعور، جو تن کا خاصہ ہے، اپنی نوعیت کے اعتبار سے حقیقی نہیں ہے، لہٰذا جب اس شعور میں حقیقی انقلاب پیدا ہوتا ہے، یعنی انسان کو جان و تن کی اصل حقیقت معلوم ہو جاتی ہے تو وہ اپنے مقصود زندگی کو پا لیتا ہے جسے اصطلاحاً "معراج" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس جگہ چوں کہ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعور میں کیسے انقلاب وقوع پذیر ہوتا ہے، لہٰذا علامہ نے خود ہی اس کا جواب بھی دے دیا ہے کہ یہ انقلاب جذب و شوق (یعنی عشق) سے پیدا ہوتا ہے، جس کے ذریعے انسان پست و بالا اور نزدیک و دور کے تعینات سے مخلصی حاصل کرتا ہے:

انقلاب اندر شعور از جذب و شوق　　وار ہاند جذب و شوق از تحت و فوق

(محل مذکور)

آخر میں علامہ اس بحث سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جسم چونکہ خودی کا محض ایک حال ہے، لہٰذا اس کا شریک ناگزیر نہیں، اور چونکہ وہ خودی کا شریک نہیں، اس لئے اس کے حرکی ارتقا میں مانع بھی نہیں ہو سکتا:

ایں بدن با جان ما انباز نیست مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

(محل مذکور)

جس طرح انسان کا اپنا بدن اس کی خودی کا ایک حال ہے، اسی طرح یہ عالم بھی خدا کا ایک حال ہے اور ہماری نظر کا محض ایک طلسم ہے، جو ہر لحظہ تغیر پذیر ہے اور خودی کے ارتقا میں حائل نہیں ہو سکتا، لہٰذا اسے خودی کے صعود کی راہ میں رکاوٹ نہیں سمجھنا چاہیئے، بلکہ اس طلسمِ نظر کو موحدِ اعظم حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی طرح توڑ کر اس کے ماورا نکل جانا چاہیئے۔ علامہ کہتے ہیں کہ جب یہ افلاکِ زمین و سماوی طے ہو جائیں تو رکنا نہیں چاہیئے، بلکہ آگے بڑھتے رہنا چاہیئے اور ارتقائے مدام کی خواہش دل میں بدستور مچلتی رہنی چاہیئے۔ وجہ یہ ہے کہ سکون و مقام خودی کی موت اور حرکت و سفر اس کی زندگی ہے:

نیست عالم جز بتانِ چشم و گوش ایں کہ ہر فردائے او میرد چو دوش

در بیابانِ طلب دیوانہ شو! یعنی ابراہیمِ ایں بت خانہ شو

چوں زمین و آسماں را طے کنی ایں جہان و آں جہاں را طے کنی

از خدا ہفت آسماں دیگر طلب صد زمان و صد مکاں دیگر طلب

اے مسافر جاں بمیرد از مقام زندہ تر گردد ز پرواز مدام!

(جاوید نامہ ۱۵۶)

اپنے اس نظریے کی توجیہ علامہ یوں بھی کرتے ہیں کہ زندگی چوں کہ درحقیقت ذوقِ پرواز یا عشق ہی کا دوسرا نام ہے، اس لیے وہ نہ تو کسی حال میں مقام کر سکتی ہے اور نہ کسی مقام سے اس کی مفاہمت ہی ہو سکتی ہے:

با مغنے در نمی سازیم ما و بس ماسراپا ذوق پروازیم و بس
ہر زماں دیدن تپیدن کار ماست بے پر و بالے پریدن کار ماست

(جاوید نامہ ۱۵۶)

خودی کے ہر لحظہ دیکھنے اور تڑپنے کی علت غائی یہ ہے کہ اس کی اصل خدائے حی و قیوم ہے۔ یہاں بادی النظر میں ایک اشکال نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی کا خاصہ جب حرکت و تغیر ہے تو پھر جو شے زندہ ہے وہ حرکت و تغیر سے محفوظ کیسے رہ سکتی ہے؟ لہٰذا خدا بیک وقت حی اور قیوم کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ قرآن حکیم کا تصور الٰہی ہے، اور وہ خدا کی زندگی کی ایک دلیل یہ دیتا ہے کہ کُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۵۵: ۲۹) وہ ہر لحظہ ایک نئی شان میں ہے، لیکن یہ شان اس کی تخلیقی فعلیت کی ایک کیفیت ہے، جسے حال بھی کہتے ہیں۔ وہ اپنی نوعیت میں اضافی ہے اور اس کی نسبت ہم سے ہے، ورنہ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے وہ نہ صرف ناتغیر پذیر اور قائم بالذات ہے بلکہ تمام مخلوقات کے قیام و ثبات کا باعث ہے۔ خودی چوں کہ اپنی اصل کی طرح حی و قیوم ہے، اس لیے اس کے احوال و شیون کی حقیقت بھی تخلیقی ہی ذاتی

نہیں، اور ان احوال کی تخلیق وہ حسنِ ذاتِ الٰہی کے مشاہدے کے لئے کرتی ہے۔ تاکہ وہ جمالِ دوست اور اصلِ حیات سے کیف و سرور اور حیاتِ جاوداں حاصل کرے:

زندگانی نیست تکرارِ نفس — اصلِ او از حیّ و قیوم است و بس
قربِ جاں با آں کہ گفت "انی قریب" — از حیاتِ جاوداں بردن نصیب

(جاوید نامہ، ۲۲۶)

چیست بودن دانی اے مردِ نجیب؟ — از جمالِ ذاتِ حق بردن نصیب

(جاوید نامہ، ۲۲۴)

اس جگہ اس نکتے کی صراحت کر دینا ضروری ہے کہ جمالِ ذاتِ الٰہی سے بہرہ مند ہونے سے مراد اس کا مشاہدہ ہے، لہٰذا اس مشاہدے کی طلب و آرزو ہی زندگی کی معراج ہے، اور یہ مقامِ معراج ہی فقط حیاتِ جاودانی کا اصل مقام ہے، جہاں ذاتِ الٰہی کے حسن کا براہِ راست مشاہدہ نصیب ہوتا ہے، جس کی بدولت خودی کو سرورِ مدام اور حیاتِ جاوداں حاصل ہوتی ہے:

چیست معراج؟ آرزوئے شاہدے — امتحانے روبروئے شاہدے
برمقامِ خود رسیدن زندگی است — ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

(جاوید نامہ ۱۴)

لیکن ذاتِ الٰہی کا یہ بلاواسطہ مشاہدہ کوئی معمولی بات نہیں، یہ ایک کٹھن مرحلہ ہے، کیوں کہ اس کے حسن کی تاب لانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں، اس کے

لئے عشق کی ناقابلِ تسخیر قوت چاہیئے۔ بہرکیف، یہ ایک سخت امتحان ہے اور جو شخص اس نظارے کا حریف ہو کر اس امتحان میں کامیاب ہوتا ہے وہی حقیقت میں زندہ و موجود ہے اور اسی کو "مقامِ محمود" حاصل ہوتا ہے۔ یہ "مقامِ محمود" چونکہ انسان کا حقیقی مقام ہے، اس لئے اسے حاصل کرنے کے لئے اُسے حُسنِ حقیقی کا حریف بننا اور امتحانِ مشاہدہ سے گزرنا ناگزیر ہے۔

شاہدِ عادل کہ بے تصدیقِ او | زندگی مارا چو گل را رنگ و بو
در حضورش کس نماند استوار | ور بماند ہست او کامل عیار
ذرۂ از کف مدہ تابے کہ ہست | پختہ گیر اندر گرہ تابے کہ ہست
تابِ خود را بر فزودن خوشتر است | پیشِ خورشید آزمودن خوشتر است
پیکرِ فرسودہ را دیگر تراش | امتحانِ خویش کن "موجود" باش

ایں چنیں "موجود" "محمود" است و بس
ورنہ نارِ زندگی دود است و بس

(جاوید نامہ، ۱۴، ۱۵)

حاصلِ کلام یہ کہ علامہ کے نزدیک زندگی اس "مقامِ محمود" پر پہنچنے کی کوشش کا نام ہے، لیکن یہ کوشش ارادی و شعوری ہونی چاہیئے جو نفسی و آفاقی علم کے بغیر ممکن نہیں:

زندگی جہد است و استحقاق نیست | جز بعلم انفس و آفاق نیست

(پیامِ مشرق، ۵)

علم انفسی و آفاقی پر بحث کرنے سے پہلے ہمیں مجرد علم کی ماہیت معلوم کرنا ہوگی۔ علم کے لغوی معنی ہیں "جاننا" اور مابعد الطبیعیات میں اس سے مراد اشیاء کی حقیقت کا ادراک ہے اور وہ قوت جو اشیاء کی حقیقت کا ادراک کرتی ہے "مدرکہ" کہلاتی ہے، اور انسان کو فطرۃً ودیعت کی گئی ہے۔ قرآن حکیم کی یہ آیت کریمہ اسی واقعیت کی نشاندہی کرتی ہے: وعلم آدم الاسماء کلھا (۲ : ۳۱) اور ہم نے آدم کو تمام (چیزوں) کے نام سکھا دیئے۔ اس قوتِ مُدرکہ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ انسانیت کا شرف اور حیاتِ انسانی کے ارتقائے لامتناہی کا ذریعہ ہے۔ مُدرکہ ایک قوت ہے جو فعل میں آنے کے لیے مشاہدے کی محتاج ہے، لہذا اللہ تعالےٰ نے مشاہدہ کلی کی اہمیت پر بار بار اور بہت زیادہ زور دیا ہے:

وفی الارض اٰیٰت للموقنین۔ وفی انفسکم ط افلا تبصرون۔ (۵۱ : ۲۰-۲۱) اور (دیکھو) اہلِ یقین کے لیے زمین اور تمہارے نفسوں میں (معرفتِ حقیقت) کی نشانیاں ہیں۔ کیا پھر بھی تم نہیں دیکھتے ہو۔

یہاں اس امر کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ قرآن حکیم کی رو سے مشاہدے کی دو بنیادی قسمیں ہیں: آفاقی اور انفسی، جنہیں فلسفے کی جدید اصطلاح میں معروضی و موضوعی کہتے ہیں، اور ان دونوں کی وحدت ہی سے مشاہدے کی تکمیل ہوتی ہے اور اس کلی مشاہدے ہی سے حقائق اشیاء کی معرفت حاصل ہوتی ہے:

سنریھم اٰیٰتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انہ الحق

اولم یکف بربک انہ علیٰ کل شیئ شہید (۴۱: ۵۳)

ہم جلد ہی انہیں آفاق اور ان کے نفسوں میں (حقیقت کی) نشانات دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر پوری طرح ظاہر ہو جائے گا کہ وہ حق ہے۔ کیا تیرے پروردگار کے لیے کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے۔

یہ مشاہدہ نفسی و آفاقی جسے مشاہدہ کلی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، جامد و مطلق نہیں، بلکہ حرکی و ارتقائی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ زندگی ہر دم رواں دواں ہے اور کائنات مسلسل حرکت و تغیر کی حالت میں ہے:

فریب نظر ہے سکون و ثبات ۔۔۔ تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود ۔۔۔ کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی ۔۔۔ فقط ذوق پرواز ہے زندگی

(بال جبریل، ۱۷۱)

اس حقیقت کو قرآن حکیم نے اپنی معجزانہ بلاغت سے ایک جملے میں سمیٹ لیا ہے:

کل یوم ھو فی شان (القرآن، ۵۵: ۲۹)۔ وہ ہر لحظہ ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔

حقیقت کے جلوے چونکہ ہر لحظہ ایک نئی ارتقائی حالت میں ہوتے ہیں، اس لئے ان کے مشاہدے کے لیے قلب کے حسن یا نور کا ارتقاء بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب تک حسنِ معروضی اور حسنِ موضوعی میں مکمل ہم آہنگی نہ ہو، مشاہدہ مکمل نہیں ہو سکتا

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اہلِ نظر کو اپنے موضوعی حسن یا نور کی تکمیل کی ہمیشہ طلب و آرزو رہتی ہے، جیسا کہ ان آیات قرآنی سے ثابت ہے:

ربنا اتمم لنا نورنا (۶۶: ۸) اے ہمارے پروردگار ہمارے لئے ہمارے نور کی تکمیل کر دے اور وقل رب زدنی علما (۲۰: ۱۱۴) اور کہہ: اے پروردگار مجھے علم میں زیادہ کر۔ حسن حقیقی کے جلووں کے تغیر و تبدل کو اور ان کے مشاہدے کی تکمیل کے لئے اہلِ نظر کے دلوں کی بے قراری کو، جو زندگی کا خاصہ ہے، علامہ نے حسین و بوقلموں اسالیب میں بیان کیا ہے:

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارم
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہے ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے

(پیامِ مشرق/ ۱۴۸)

یہ نظریہ جسے میں نے اپنی تصانیف (جمالیاتِ قرآنِ حکیم کی روشنی میں تاریخِ جمالیات، اقبال اور جمالیات) میں حرکی نظریۂ حسن سے تعبیر کیا ہے، حسنِ حقیقت کے موضوعی و معروضی دونوں پہلوؤں کو حرکی و ارتقائی تسلیم کرتا ہے، لہٰذا اسے حرکی موضوعی معروضی (dynamic subjective-objective

کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ نظریہ زبور عجم میں اس طرح پیش کیا گیا ہے:

ایں مہ و مہر کہن راہ بجائے نہ برند
انجم تازہ بتعمیر جہاں می بائست
ہر نگارے کہ مرا پیش نظر می آید
خوش نگارے است ولے خوشتر ازاں می بائست

(زبورِ عجم، ۱۹۲)

جاوید نامہ میں علامہ نے اس نظریے کو بیان کرتے ہوئے اس نفسیاتی حقیقت کی بھی تصریح کر دی ہے کہ جس شخص کے دل میں حسنِ حقیقی کی محبت و آرزو ہوتی ہے وہ کلیات یعنی جامد و مطلق تصورات کا دلدادہ نہیں ہوتا۔ اس کی نظر میں تو ہمیشہ حسنِ دوست (یعنی حسنِ الٰہی) کے نئے سے نئے جلوے رہتے ہیں اور انہیں جلووں کی تمنا اس کے دل میں مچلتی رہتی ہے:

در رہِ دوست جلوہ ہاست تازہ بتازہ نو بہ نو
صاحبِ شوق و آرزو دل نہ دہد بکلیات

(جاوید نامہ، ۲۰)

پیامِ مشرق میں انہوں نے اس نظریے کی تصریح اس طرح کی ہے:

حسن می گفت کہ شامے نہ پذیرد سحرم
عشق می گفت تب و تابِ دوامے دارم

(پیامِ مشرق، ۱۹۵)

آخر میں علامہ اس امرِ واقعی کی بھی تصریح کر دیتے ہیں کہ زندگی کے ان ارتقائی نظاروں کو فقط وہی شخص دیکھ سکتا ہے جو اہلِ نظر ہو۔

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

(پیامِ مشرق، ۲۳۱)

معلوم ہوا کہ علمِ کلی کی اصل دید و نظر ہے اور دید و نظر عین حیات ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ جو شخص صاحبِ نظر یا دیدہ ور نہیں، وہ حقیقت میں زندہ نہیں مردہ ہے؛ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں "حکمت" کو "خیر کثیر" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دید و نظر خیر کثیر کا ذریعہ ہے اور کثرت چونکہ ہر حال میں کثرت ہے، لہٰذا اس میں لامتناہیت کا مفہوم مضمر ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ذات باری تعالیٰ کا بلا واسطہ مشاہدہ کرنے کے باوجود ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتے تھے: ربِ زدنی علما (۲۰: ۱۱۴)۔

زندگی جہد است و استحقاق نیست — جز بعلم انفس و آفاق نیست
گفت حکمت را خدا خیر کثیر — ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر
سیدِ کل صاحبِ امّ الکتاب — پردگیہا بر ضمیرش بے حجاب
گرچہ عینِ ذات را بے پردہ دید — ربِ زدنی از زبان او چکید

(پیامِ مشرق، ۵-۶)

علامہ کہتے ہیں کہ اس علم کے فوائد انفرادی ہی نہیں، اجتماعی بھی ہیں، مثلاً علم ہی

سے کسی قسم کے افراد میں تنظیم ہو، ان کے آئیڈیلز و اعمال میں وحدت و ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے علم ہی کسی قوم کی قوت و صولت کا اعتبار و معیار ہوا:

علمِ اشیا علمِ الاسماستے　　ہم عصا و ہم یدِ بیضا ستے

علم و دولت نظمِ کارِ ملت است　　علم و دولت اعتبارِ ملت است

(محلِ مذکورہ)

اس ضمن میں علامہ نے ایک نہایت اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے، جو یہ ہے کہ علم دو قسم کا ہوتا ہے: ایک حسین و سلیم فطرت، جو نور یا بقول علامہ "عصا" و "ید بیضا" ہے، اور دوسرا کج فطرت و بد گوہر، جو ظلمت و قبیح ہونے کے باعث حق اور ہمارے درمیان سب سے بڑا پردہ ہے۔ بالفاظِ دیگر، ایسا علم دید و نظر کا حجاب اکبر ہے اور انسان کو کورِ ذوق و بے بصر، اس لئے گمراہ و نامراد بناتا ہے:

علم اگر کج فطرت و بد گوہر است　　پیشِ چشمِ ما حجابِ اکبر است

(جاوید نامہ، ۲۲۱)

اس کے برعکس اگر علم کا مقصود دید و نظر یعنی قوتِ مشاہدہ ہے، تو وہ اس مقصود کے حصول کے لیے نہ صرف راہ ہموار کرتا ہے بلکہ رہنمائی بھی کرتا ہے۔ ایسا علم انسان کے دل میں پہلے تو موجود کی نمود و حقیقت کے راز کے معلوم کرنے کی طلب و آرزو پیدا کرتا ہے، پھر اسے سوز و گداز سے معمور کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں، علم ہی اس کائنات کے معنی کا مظہر ہے اور وہی عرفان و معرفت کے ساتھ انسان کو ہر مقام پر ایسا جذب و شوق عطا کرتا ہے، جس میں اس کی بقائے سرمدی اور

ارتقائے مدام کا راز مضمر ہے:

علم را مقصود اگر باشد نظر — می شود ہم جادہ و ہم راہبر
می نہد پیشِ تو از قشرِ وجود — تا تو پرسی چیست راز این نمود
جادہ را ہموار سازد این چنین — شوق را بیدار سازد این چنین
درد و داغ و تاب و تب بخشد ترا — گریہ ہائے نیم شب بخشد ترا
علم تفسیرِ جہانِ رنگ و بو — دیدہ و دل پرورش گیرد ازو
بر مقامِ جذب و شوق آرد ترا — باز چون جبریل بگذارد ترا

(جاوید نامہ ۔ ۴۴)

لیکن جہاں تک معرفتِ حق کا تعلق ہے علم پر نظر کو فضیلت ہے کیونکہ علم خبر اور نظر دیدِ ذاتِ الٰہی ہے۔ اسی بنا پر حجتِ علم کو نہیں دید کو سمجھا جاتا ہے اور دید ہی اہلِ نظر و عرفان کا دین ہے، حالانکہ عوام کے دین کی بنیاد محض خبر یا علم پر ہوتی ہے:

گفت این علم و ہنر؟ گفتم کہ پوست — گفت حجت چیست؟ گفتم روئے دوست
گفت دینِ عامیان؟ گفتم شنید — گفت دینِ عارفان؟ گفتم کہ دید

(جاوید نامہ ۔ ۳۷)

اس جگہ قدرتی طور پہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو یہ "دیدِ دوست" کیسے میسر آسکتی ہے جب کہ انسان ایک کمزور و ناتوان وجود ہے اور اس کے مقابلے میں کائنات کی وسعتیں بیکراں ہیں، جن میں ہزاروں طرح کی رکاوٹیں ہیں۔

علامہ نے اس کا جو جواب دیا ہے اسے ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ "سلطان" کے ذریعے، اور "سلطان" قرآنِ حکیم کی مصطلح ہے، جو اس آیت کریمہ سے ماخوذ ہے:

یٰمعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوٰتِ والارض فانفذوا لا تنفذون الا بسلطان (۵۵ : ۳۳)

(اے جنوں اور انسانوں کی جماعت! اگر تم میں آسمانوں اور زمین کے حدود کے ماوراء نکل جانے کی استطاعت ہے تو نکل جاؤ، لیکن تم ان سے ماوراء بجز "سلطان" کے نہیں نکل جاسکتے)۔

باز گفتم پیشِ حق رفتن چساں؟ کوہ خاک و آب را گفتن چساں؟
گفت اگر "سلطان" ترا آید بدست می تواں افلاک را از ہم شکست!
باش تا عریاں شود ایں کائنات شوید از دامانِ خود گردِ جہات!
در وجودِ او نہ کم بینی نہ بیش خویش را بینی ازو، او را ز خویش
نکتۂ "الا بسلطان" یادگیر ورنہ چوں مور و مخ در گِل بمیر

(جاوید نامہ، ص ۱۵)

علامہ کے نزدیک "سلطان" سے مراد "عشق" ہے۔ اور عشق دراصل جذبِ دروں کی ایک ایسی فطری قوت ہے، جو زمان و مکان پر غالب ہے، بلکہ لامکان پر بھی اس کا تسلط ہے۔ علامہ نے جاوید نامہ میں اس کی

تشریح اس طرح کی ہے:

عشق سلطان است و برہان مبین — ہر دو عالم عشق را زیر نگیں

لازمان و دوش و فردائے ازو — لامکان و زیر و بالائے ازو

چوں خودی را از خدا طالب شود — جملہ عالم مرکب او راکب شود

آشکارا تر مقام دل ازو — جذب ایں دیر کہن باطل ازو

(جاوید نامہ، ۱۸)

بال جبریل میں وہ عشق کی اس قوت و رسائی کا ذکر اپنی واردات کے طور پر کرتا ہے:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

(بال جبریل، ۲۹)

عشق کی اہمیت و حقیقت کی تصریح کرنے کے بعد وہ مدعی عشق سے ایک اہل نظر مصلح کی طرح اس طرح تخاطب کرتے ہیں:

عاشقی؟ از سو بہ بے سوئی خرام — مرگ را بر خویشتن گرداں حرام

بر مکان و بر زمان اسوار شو — فارغ از پیچاک ایں زنار شو

تیز اندکن ایں دو چشم و ایں دو گوش — ہر چہ می بینی بنوش از راہ ہوش

(جاوید نامہ، ۱۸-۱۹)

مذکورہ بالا اشعار میں علامہ نے دید و نظر یا مشاہدۂ حق کا عملی فلسفہ بیان

کہا ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ اوّلاً، عاشق کو اس حقیقت کا یقین ہونا چاہیئے کہ عشق پر، اس لیے اُس پر بھی موت حرام ہے، ثانیاً، اُسے زمان و مکان کا اسیر نہیں، صیاد ہونا چاہیئے اور ثالثاً، اسے اپنی نظر کو تیز سے تیز تر کرتے رہنا چاہیئے اور مشاہدہ نظرِ بیدار سے کرنا چاہیئے۔

پیامِ مشرق میں علامہ نے دل کی انکساری و تواضع اور نگاہ کی پاک بازی کو مشاہدہ حق کی دو لازمی شرائط قرار دیا ہے۔ لیکن جہاں تک عقل کا تعلق ہے وہ اس راہ میں اس کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے:

رہِ عاقلی رہا کن کہ باو تواں رسیدن
بدلِ نیازمندے بہ نگاہ پاک بازے

(پیامِ مشرق، ۱۷۷)

علامہ اپنے اس تصور کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں کہ دل کی نیازمندی اس کی زندگی کی دلیل ہے اور اس زندگی و بیداری ہی پر انسان کی قوّتِ دل و نظر کی ترقی کا انحصار ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مظہرِ حق کا خاصہ بھی حرکی و ارتقائی ہے:

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشمِ نگران اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور

(بالِ جبریل، ۲۰۸)

دل اور نگاہ کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ علامہ اس سوال کا جواب دیتے ہیں:۔

اندکے اندر جہانِ دل نگر | ناز نورِ خودشوی روشن بصر
چیست دل؟ یک عالمِ بے رنگ و بوست | عالمے بے رنگ و بو بے چارسوست
ساکن و ہر لحظہ سیّار است دل | عالمِ احوال و افکار است دل

(جاوید نامہ، ۱۷۹)

حق جب دل کے اندر جلوہ نما ہے تو پھر اس عالم رنگ و بو کے خودی اور خدا کے درمیان حائل ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ حقیقت ہے جسے علامہ مختلف طریقوں سے بار بار ذہن انسانی پر منکشف کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

ذاتِ حق را نیست ایں عالم حجاب | غوطہ را حایل نہ گردد نقشِ آب

(جاوید نامہ، ۳۸)

مختصر یہ کہ انسان اور خدا کے تعلق کی نوعیت وہی ہے جو دل اور دیدہ و نظر کی ہے، لہٰذا انسان اس سے بے اندازہ دور ہونے کے باوجود ہمیشہ اس کے قریب تر ہوتا ہے:

میانہ من و او ربط دیدہ و نظر است | کہ در نہایت دوری ہمیشہ با ادیم

(پیامِ مشرق، ۱۷۴)

لیکن اس رویت اور دیدار کے لئے نگاہ کا مشتاق و پاکیزہ ہونا ضروری ہے اور نگاہ کی پاکیزگی کا ذریعہ آہِ سحر گاہی اور اشکِ گلگون ہے:

پئے نظارۂ روئے تو می کنم پاکش ۔۔۔ نگاہِ شوق بہ جوئے سرشک می شویم

(پیامِ مشرق، ۱۷۳)

واقعہ یہ ہے کہ حسنِ حقیقی، جو انسان کے تفکر و تخیل کا مقصود ہے، اس کی چشم دل ہی میں موجود ہوتا ہے، لیکن جس طرح انسان کو اپنی نظر دکھائی نہیں دیتی اسی طرح وہ بھی دکھائی نہیں دیتا:

آں چہ مقصودِ تگ و تازِ خیالِ من و تست
ہست در دیدہ و مانندِ نظر پیدا نیست

(پیامِ مشرق، ۲۰۳)

علامہ اپنے اس نظریے کو حقیقت سمجھتے ہیں، لہٰذا ان کے نزدیک جو شخص اس حقیقت سے آشنا نہیں وہ عالم فریب میں ہے، جہاں اس پر حق کبھی ہویدا نہیں ہو سکتا اور اس سلسلے میں اس کی ساری کوششیں رائگاں جاتی ہیں:

ترسم کہ تو می رانی زورق بسراب اندر
زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر
چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فرو شستم

تقدیرِ اُمم دیدم پنہاں بہ کتاب اندر

(جاوید نامہ، ۴۳)

یہ منطق کی موشگافیاں ہیں جو حقیقت کا مشاہدہ کرنے کے بجائے خود ہی اس کا حجاب بن جاتی ہیں، اس لیے اس کا مشاہدہ عقل کی آنکھ سے نہیں، عشق کی آنکھ سے کرنا چاہیئے:

بچشمِ عشق نگر تا سراغ او گیری　　جہاں بچشمِ خرد سیمیائے و نیرنگ است

(پیام مشرق، ۱۷۸)

حاصل کلام یہ کہ ہر شے اپنی ہستی و بقا کے لیے نظر کی مرہونِ منت ہے، اس لیے نظر ہی حق ہے اور باقی جو کچھ ہے نمود سیمیائی ہے۔ نظر چونکہ حق ہے اس لیے وہ ذات حق کا مشاہدہ کر سکتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسی شے کے مشاہدہ کے لیے اس جیسا ہونا لازمی ہے۔ یہ نظریہ افلاطونس (Plotinus) کا ہے، جسے مولانا رومیؒ نے اس طرح پیش کیا ہے:

پس قیامت شو قیامت را ببیں　　دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں

(مثنوی معنوی)

بہرکیف، مشاہدہ حق چونکہ حیاتِ انسانی کا مقصودِ حقیقی ہے اور وہ نظر کا رہینِ منت ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو انسان میں فقط نظر ہی جوہر ہے اور باقی جو کچھ ہے عرض ہے۔ علامہ اقبال سے پہلے مولانا رومیؒ اس نظریئے کے زبردست نقیب ہو گزرے ہیں۔ انہوں نے دید و نظر کے فلسفے

کو نہایت خوبی اور وضاحت سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

آدمی دید است و باقی پوست است | دید آں باشد کہ دید دوست است
جملہ تن را در گداز اندر بصر | در نظر رو، در نظر رو، در نظر!

(مولانا رومی: مأخوذ از جاوید نامہ، ص ۱۹)

یہی تصور بصورت دیگر علامہ کے ہاں اس طرح ملتا ہے:

آنچہ مقصود تگ و تازِ خیال من و تست | ہست در دیدہ و مانند نظر پیدا نیست

(پیام مشرق، ۲۰۳)

یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ علامہ مفکر بھی ہیں اور مبلغ بھی۔ وہ مفکر کی طرح اپنا نظریہ پیش کرتے ہیں اور مبلغ کی طرح اسے قبول کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ چناں چہ ایک مبلغ حق کی طرح وہ اپنے اس نظریۂ دید و نظر کے منکروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

کافر! دلِ آوارہ دگر بارہ باو بند | بر خویش کشا دیدہ و از غیر فرو بند
دیدن دگر آموز و ندیدن دگر آموز!

دم چیست؟ پیام است، شنیدی نشنیدی! | در خاکِ تو یک جلوۂ عام است ندیدی!
دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز!

(زبور عجم، ۱۱۴)

علامہ کا یہ نظریہ کہ طلب و آرزو ہی خالق تقدیر ہے، ان کے نظام فکر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اس نظریئے کا اطلاق اپنے دید و نظر پر بھی کرتے ہیں، اور

اس سے یہ استنباط کرتے ہیں کہ عشق چونکہ دیدارِ حسن کا مشتاق و آرزومند ہوتا ہے لہٰذا اس کی تقدیر ہی یہ ہے کہ وہ نظر بن جائے۔ اسی طرح حُسن چوں کہ اپنی نمود و پیدائی کی آرزو و تمنا رکھتا ہے لہٰذا آشکارا ہو کر منظور و مشہود بن جانا ہی اس کی تقدیر ہے۔ علامہ نے اپنے اس تصور کو جو در اصل اُن کے کل فلسفیانہ افکار و نظریات کا ماحصل ہے، فقط دو مصرعوں میں پیش کر دیا ہے:

عشق از لذّتِ دیدار سراپا نظر است　　حسن مشتاقِ نمود است و عیاں خواہد بود

(پیامِ مشرق، ۲۳۲)

قصہ مختصر یہ کہ حیاتِ انسانی کا کمال اللہ تعالیٰ کی ذات کو بلا واسطہ دیکھنے میں مضمر ہے، اور وہ اسے اپنے آپ کو حدود و تعیّنات سے آزاد کر کے ہی دیکھ سکتی ہے، لہٰذا جس شخص کو یہ مشاہدہ حاصل ہے، وہی حقیقت میں مردِ کامل ہے اور وہی اس دُنیا کی قیادت کا سزاوار ہے:

کمالِ زندگی دیدارِ ذات است　　طریقش رستن از بندِ جہات است

کسے کو دید عالم را امام است　　من و تو ناتمامیم او تمام است

(زبورِ عجم، ۲۳۲)

آخر میں علامہ کے ایسے تین شعر پیش کیے جاتے ہیں جن میں انہوں نے اپنے اس فلسفے کو عارفانہ یقین اور قلندرانہ جذب کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کے افکار اور پیغام کی اصل روح آشکارا ہو گئی ہے:

می شود پردۂ چشم پرِ کاہے گاہے　　دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

در طلب کوش و مدہ دامنِ امید ز دست
دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

(زبورِ عجم، ۲)

اگر یہ واقعہ ہے اور یقیناً یہ واقعہ ہے کہ انسان اپنے عشق کی بدولت زمان و مکان کے حدود و تعینات کو پار کر کے ذاتِ الٰہی کے حسن کا مشاہدہ کر سکتا اور اس طرح کیف و سرور کی ابدی، لیکن ارتقائی جنت میں پہنچ سکتا ہے تو پھر کون سا دوسرا نظریہ ہے جو اس سے زیادہ رجائیت پسندانہ، حسین، طمانیت بخش اور صداقت کا آئینہ دار ہو سکتا ہے؟ لہٰذا ہم کامل ایقان کے ساتھ یہ پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ یہی اور فقط یہی ایک نظریہ ہے، جس کی تقدیر میں مستقبل کے انسان کا نصب العین اور اس کے اعمال کا محرک بننا لکھا ہے۔

سلیم اختر

نقدِ اقبال کا تجزیاتی مُطالعہ

اقبال کے نام کو "اقبالیات" میں تبدیل ہونے میں کتنا عرصہ لگا یہ واضح کرنا تو بہت مشکل ہے لیکن آج اس اصطلاح سے ہم جتنے مانوس ہیں جس طرح سے اس نے عصری تنقید میں ایک جداگانہ شعبے کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اس حد میں جس کثرت سے لکھا گیا (اور لکھا جا رہا ہے) اس سے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم جنم جنم سے اقبال اور اقبالیات سے آشنا چلے آ رہے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ہمیشہ ایسا نہ رہا ہوگا۔

اگرچہ اقبال نے بطورِ خاص کبھی مشاعروں میں جانے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی لیکن اب یہ ثابت ہے کہ زمانۂ طالب علمی ہی کے دوران بحیثیت ایک ذہین شاعر کے نوجوان اقبال کی شہرت لاہور کے علمی حلقوں میں بوئے گل کی طرح پھیلتی جا رہی تھی۔ اقبال کی شہرت کو پہلے پنجاب اور پھر برِصغیر میں پھیلانے میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں اور "مخزن" نے بہت اہم کردار ادا کیا گو اقبال پیشہ ور شاعروں کی مانند مشاعرہ مشاعرہ جا کر داد بٹورنے کے دھندے سے آزاد تھے لیکن قومی خدمات کی بناء پر انھوں نے انجمن کے جلسوں کے لیے نہ صرف ہمیشہ

نظمیں لکھیں بلکہ اقبال کی بعض شاہکار نظمیں جیسے "شکوہ" یا "نالۂ یتیم" انجمن ہی کے لئے لکھی گئیں۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں سر عبدالقادر نے لاہور سے "مخزن" کا اجرا کیا تو اس کے پہلے شمارے میں "ہمالہ" طبع کی۔ "بانگ درا" کے دیباچے میں سر عبدالقادر نے لکھا ہے۔ کہ اقبال اس نظم سے مطمئن نہ تھے اور نظر ثانی کی خاطر اس کی اشاعت منظور نہ تھی لیکن انہوں نے بااصرار وہ نظم حاصل کی اور چھپنے پر بے حد پسند کی گئی یوں مخزن کے لئے بھی زیادہ سے زیادہ لکھنا قرار پایا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں لکھی جانے والی تنقیدی تحریروں کے ضمن میں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس عہد میں حالیؔ، شبلیؔ، داغؔ، امیر مینائی اور اکبر الٰہ آبادی ایسے شعرا بقید حیات تھے اور اقبال ان کے مقابلے میں یقیناً جونیر شاعر تھے۔ داغ کے تو خیر وہ شاگرد تھے لیکن امیر مینائی کا بھی احترام کرتے تھے۔ بقولِ اقبال:

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیرؔ، اقبال!
میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے

حالیؔ سے اقبال کو بے حد عقیدت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسے میں حالیؔ کا کلام سنانے سے پیشتر جو فی البدیہہ رباعی پڑھی اس کا ایک ایک لفظ عقیدت کے جذبہ سے سرشار ہے:

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالیؔ — معمور مئے حق سے ہے جامِ حالیؔ
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا — جاری ہے مرے لب پہ کلامِ حالیؔ

ان حالات میں اور ایسے اساتذہ کی موجودگی میں اقبال ایسے جونیر شاعر

پر اتنی جلدی لکھنے کا آغاز بذاتِ خود بہت اہم ہے یہی نہیں بلکہ اقبال پر نظمیں لکھنے کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا چنانچہ "مخزن" (اگست ۱۹۰۶ء) میں "تہنیتِ برتسکال اور پروفیسر اقبال" کے عنوان سے سرور جہاں آبادی کی نظم ملتی ہے۔ "مخزن" اگست ۱۹۰۸ء) میں اقبال کی لندن سے واپسی پر کلماتِ مسرت ملتے ہیں تو "مخزن" (ستمبر ۱۹۰۸ء) میں حامد حسن قادری کی نظم "خیر مقدم" ملتی ہے بالفاظ دیگر نسبتاً کم عمری اور کم لکھنے کے باوجود بھی یورپ سے واپسی تک اقبال ملک کے ادبی حلقوں کے لیے اتنی قد آور شخصیت بن چکے تھے کہ وطن واپسی پر منظوم خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

اقبال پر سب سے پہلا باضابطہ تنقیدی مقالہ کس نے قلم بند کیا اس کے بارے میں تو اب وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے البتہ یہ ہے کہ تیز رفتاری سے بڑھتی شہرت کے باعث وہ جلد ہی مرکزِ نقد بن گئے ہوں گے لیکن اتنا یقینی ہے کہ اسرارِ خودی (سنہ اشاعت: ۱۹۱۵ء) کی اشاعت کے بعد سے وہ مرکزِ نقد کے ساتھ ساتھ نکتہ چینی اور نزاع کا باعث بھی بن گئے۔ یہ امر بھی معنی خیز ہے کہ اقبال "اسرارِ خودی" سے قبل بھی نکتہ چینی کا مرکز بنے تھے لیکن یہ نکتہ چینی علمی یا مذہبی نوعیت کے برعکس اہلِ زبان کے ان جارحانہ مضامین کی صورت میں تھی جن میں اقبال کی زبان و بیان کے حقیقی (اور مفروضہ) اغلاط کی نشان دہی کی گئی تھی۔

شاید یہ بات دور کی محسوس ہو مگر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اقبالیات کے ابتدائی نقوش کے سراغ میں ہم باضابطہ مقالات سے قطع نظر ان مختصر تعارفی

نوٹس تک جا سکتے ہیں جو سر عبدالقادر نے "مخزن" میں اقبال کی بعض نظموں کے ساتھ لکھے، مثالیں پیش ہیں:

طلبائے علی گڑھ کالج کے نام

کلامِ اقبال علی گڑھ میں ہمیشہ مقبول ہے اور شوق سے پڑھا جاتا رہا ہے مگر "پیامِ اقبال" جو ہم آج شائع کرتے ہیں نہایت ہی غور سے پڑھے جانے کے لائق ہے طلبائے علی گڑھ کو خصوصیت سے مخاطب کرنے کی یہ وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی آئندہ امیدیں بہت کچھ ان سے وابستہ ہیں ورنہ سب پڑھے لکھے نوجوان اس دردمندانہ مشورے کے مخاطب ہو سکتے ہیں جو حضرت اقبالؒ نے ان چند اشعار کے جامع الفاظ اور بلیغ اشارات میں انہیں دیا ہے" (مخزن مئی ۱۹۰۷ء)

عبدالقادر کے نام

اس نظم کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہوئے مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ ایسی نظم اور ایسے خیالات کا مخاطب مجھے بنایا گیا ہے اور ایسے بلند ارادوں میں مجھے شریک کیا گیا ہے سوائے اس کے کہ دل اپنے دلنواز کی محبت کا شکریہ ادا کرے اور میں یہ دعا مانگوں کہ خدا حضرت اقبال کے ارادوں میں برکت دے اور اگر میرے نصیب میں کوئی خدمت ملک کی لکھی ہے تو مجھے بھی اس کی توفیق عطا فرمائے کوئی جواب اس خط کا مجھ سے بن نہیں پڑتا خصوصاً جب جنابِ اقبال کے اشعارِ آبدار کے مقابل اپنی نثر کی خشکی

اور بے مایگی پر نظر رکھتا ہوں۔" ("مخزن"، دسمبر ۱۹۰۸ء) ص

یہ اور اسی نوع کے دیگر تعارفی نوٹس بظاہر سیدھے سادے ہیں۔ ان میں کوئی تنقیدی نقطۂ نظر بھی نہیں ملتا بلکہ اندازِ تحسین بھی جذباتی سا ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اینٹ اینٹ مل کر رفیع الشان قصر کی صورت اختیار کرتی ہے چنانچہ آج اقبالیات میں مقالات کا جو گراں قدر ذخیرہ ملتا ہے اس کی اساس اگر اسی طرح کی سیدھی سادی باتوں پر استوار ملے تو یہ باعثِ تعجب تو ہو سکتا ہے ناممکنات میں سے نہیں!

اقبالیات کے تفصیلی تجزیاتی مطالعہ سے بیشتر یہ اساسی امر ملحوظ رکھنا لازم ہے کہ ۱۹۰۱ء تک ابھی اردو تنقید گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔ مولانا الطاف حسین حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" (سنہ اشاعت: ۱۸۹۳ء) سے اگر جدید تنقید کی عمر محض سات سال بنتی ہے۔ حالی کے علاوہ اس دور میں علامہ شبلی نعمانی اور مولانا محمد حسین آزاد کی صورت میں دو اور بھی قد آور نقاد ملتے ہیں لیکن ان دونوں کی تنقید بھی مزاج اور لب و لہجہ کے اعتبار سے جدید نہیں قرار دی جا سکتی مگر یہ دونوں (آزاد کم اور شبلی زیادہ) انگریزی ناقدین اور مفکرین کے اسماء و ران کی استعمال کرتے ہیں لیکن یہ کیوں کہ ان کے تنقیدی مزاج کا عنصر نہیں اس لئے ان کی حیثیت مستعار لی ہوئی اشیائے تزئین سے زیادہ نہیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو ناقدین کی ایک اور نسل بھی ابھر رہی تھی جنہیں مغربی ادبیات سے واقفیت بھی تھی اور جو ان بزرگوں کے مقابلہ میں اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تحلیلی نظر رکھتے تھے

اس ضمن میں مہدی افادی اور ان کے بعد امداد امام اثر کا نام لیا جاسکتا ہے لیکن ان کی شخصیت اور تحریروں کے اردو ادب و نقد پر اثرات اتنے گہرے نہ تھے کہ انہیں رجحان ساز قرار دیا جاسکتا ہو ان کے بعد مولوی عبدالحق، عبد الرحمٰن بجنوری، وحید الدین سلیم، عبد الماجد دریا آبادی اور نیاز فتح پوری آتے ہیں چنانچہ موجودہ صدی کی دوسری اور تیسری دہائی تک ان ہی کا سکہ چلتا رہا پھر ۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسند ادب کی تحریک کے ذریعہ تنقید کے مارکسی نقطۂ نظر نے فروغ پایا لیکن یہ ایک الگ داستان ہے اسی طرح ۱۹۲۰ء کے بعد میرا جی کی تنقید میں باقاعدہ طور سے نمو پذیر ہوئے لیکن یہ بھی ایک الگ بحث ہے نفسیاتی اور مارکسی اندازِ نظر سے قطع نظر کر کے جب بحیثیت مجموعی ان ناقدین کا جائزہ لیں تو اپنی تحقیقی صلاحیتوں (مولوی عبدالحق) عالمی ادبیات کے تقابلی مطالعے ... (عبد الرحمٰن بجنوری) گہرے لسانی شعور (وحید الدین سلیم) فلسفے کے رچے ہوئے مذاق (عبد الماجد دریا آبادی) اور تحریر میں حسن کاری (نیاز فتح پوری) کے باوجود جہاں تک ان حضرات کی ناقدانہ بصیرت کا تعلق ہے تو ان میں سے کوئی بھی حالی تک نہیں پہنچ پایا۔ ہر چند کہ اہم اور غیر اہم نام دنیائے نقد میں داخل ہو رہے تھے اور حسبِ دستور گو تنقیدی کتب کم چھپ رہی تھیں لیکن اس عہد کے ادبی جرائد میں تنقیدی مقالات چھپتے رہتے تھے اور سنجیدہ قارئین کی صورت میں تنقید ایسی خشک چیز سے دلچسپی لینے والا ایک طبقہ ابھر رہا تھا۔

یہ ہے وہ تناظر جس میں اقبالیات کے اولیں نقوش کا جائزہ لینا ہوگا۔

اس ضمن میں یہ اہم نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ گو اقبال اپنے بعض معاصرین کے مقابلے
میں عام سے جونیئر تھے لیکن یہ جونیئر ہونا صرف عمر کے لحاظ سے تھا کلامِ اقبال میں
فکر کی جو گہرائی ملتی ہے۔ ان کا دلنشین اسلوب اس سونے پر سہاگے کا کام کرتا
ہے۔ اردو شاعری میں اقبال کی لَے ایک نیا آہنگ لے کر آتی ہے تو فلسفہ
ہماری فکری تاریخ کا ایک نیا موڑ ثابت ہوتا ہے چنانچہ جلد ہی زمانے کو احساس
ہو گیا کہ اقبال کی صورت میں اردو شاعری کو ایسا متفکر شاعر مل رہا ہے جو اپنی
تخلیقی شخصیت کے بوقلموں اظہار سے اردو نظم کو رفعت بخشے گا کہ نہ صرف یہ کہ
اس کے تمام فنی امکانات کو ان کی منطقی انتہا تک پہنچا دے گا بلکہ اپنی زندگی
ہی میں کلاسیک کا درجہ اختیار کر جائے گا۔ اگر ریاضی کے اصولوں کے مطابق بات
کریں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا فکری ارتقا جیومیٹریکل یعنی ۲، ۴، ۸، ۱۶، ۳۲۔
کے انداز پر تھا۔ چنانچہ اردو ادب کے گراف پر اس کے فکری ارتقا کی قوس
نہایت اعتماد کے ساتھ اپنا عمودی سفر جاری رکھتی ہے لیکن اس کے مقابلے میں تنقید
کی فکری سطح اتنی بلند نہ تھی چنانچہ اصولی مباحث میں وہ مدتوں ابتدائی کے نقطہ پر رکی
رہی جس کے نتیجے میں اس کی ترقی عموداً کے برعکس افقاً نظر آتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو
یوں محسوس ہوتا ہے یہ قوس ٹوٹ کر ایک ہی نقطے پر گھڑی کی سوئی کی طرح اٹک چکی
ہے گویا اقبال کے فکری ارتقا کے برعکس تنقید کی ترقی ریاضیاتی یعنی ۱، ۲، ۳، ۴ —
کے انداز پر تھی۔ اقبال کی فکری بلندی اور تنقید کی ہموار سطح میں بعد کا نتیجہ یہ نکلا کہ قلیل
مدت میں اقبال نے تو فکری بلندیوں کو چھو لیا مگر تنقید ابھی افتاں و خیزاں گردِ سفر ہی

میں گم رہتی۔ یہ بعد بہت اہم ہے کہ اس سے تنقید کی عمومی صورتِ حال سمجھنے کے ساتھ ساتھ اقبالیات کا مطالعہ زیادہ بہتر خطوط پر ہو سکتا ہے۔ آج اقبالیات کی ذیل میں آنے والی تحریروں کا تجزیاتی مطالعہ کرنے پر جہاں آرا میں افراط و تفریط کا احساس ہوتا ہے وہاں تنقیدی معاییر میں بھی یکسانیت کا فقدان نظر آتا ہے اگر ایک انتہا پر کارِ نوشش قسم کی تحریریں ملتی ہیں تو دوسری طرف فکری گہرائی میں ڈوبا تجزیاتی اندازِ نظر بھی ہے لیکن بحیثیت مجموعی ایسا بہ محض تشریحی اور توضیحی تحریروں کا غلبہ نظر آتا ہے جس کا نتیجہ تکرار و توارد کی ایسی صورت میں رونما ہوا کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا فکرِ اقبال چند فارموں کا نام ہے۔ شاید اسی لئے ہر شخص اپنی دانست میں نقدِ اقبال کا حق ادا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا بلکہ وہ وقتاً فوقتاً یہ حق ادا بھی کرتا رہتا ہے اب یہ دوسری بات ہے کہ ذہین قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا! اس کی وجہ نہ تو ناقدین کی کم علمی ہے نہ سہل انگاری اور نہ عدمِ خلوص۔ بلکہ سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ اردو تنقید اپنی ترقی کی سست رفتاری کے باعث فکرِ اقبال کے ارتقائی مراحل کا ساتھ دینے کی اہل نہیں!

ہر چند کہ ادب میں تنقید اور تخلیق قسم کا کوئی دنگل نہیں ہوتا کہ دونوں میں سے کسی ایک کا چاروں شانے چت کرنا لازم ہو۔ گو ایسے ناقدین بھی مل جاتے ہیں جو تنقید کو ایک طرح کی پنجہ آزمائی سمجھتے ہوئے تخلیق کے حوالے سے تخلیق کار کو ناک آؤٹ کرنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن تنقید کا یہ انداز متوازن نہیں

ہٰذا ایسی تنقیدی کاوش قابلِ قدر یا قابلِ تقلید نہیں بن سکتی۔ تاہم اس امر پر یقیناً زور دیا جاسکتا ہے کہ اقبال پر لکھی گئی بیشتر تنقیدی تحریروں کی مانند تنقید محض اشعار کی تشریح کر دینے اور معروف ناقدین یا مغربی مفکرین کے خوب صورت حوالوں کو مضمون میں ڈیکوریشن پیس کی طرح سجانے کا نام بھی نہیں۔ تنقید اور تخلیق دراصل دو ارفع ذہنوں کا مقابل ہوتا ہے اگر تنقید اقبال کے الفاظ میں "کم عیار" ہو تو وہ تخلیق سے مبہوت اور مسحور ہو کر اس کی رفعتوں میں گم ہو جاتی ہے نتیجتاً وہ راہ نما بننے کے برعکس خود راستہ بھول جاتی ہے یوں نقاد کی شخصیت تخلیق کار کی شخصیت سے دب جاتی ہے۔ وہ خود کو اس عظیم الشان عمارت کے سامنے محسوس کرتا ہے جس کی بلند دیواریں اس کی   کو ڈراتی ہیں، دروازہ کھٹکھٹانے کا وہ خود میں حوصلہ نہیں پاتا چنانچہ عالم حیرت میں وہ اسے تکتا رہتا ہے اور بالآخر باہر کا احوال بتا کر فارغ ہو جاتا ہے۔ اقبال کے ناقدین کی اکثریت کا یہی حال نظر آتا ہے وہ اقبال کے فلسفے سے یوں مسحور ہوتے ہیں کہ اشعار کی تشریح سے آگے کی بات سوچ ہی نہیں سکتے اس کا مجموعی باعث اردو تنقید کی کم مائیگی ہے تو خصوصی باعث خود نقادوں کی کم نگاہی۔

یہ درست ہے کہ تنقید تخلیق کی ہم جنس ہے لیکن تخلیق کا فکری مرتبہ متعین کرنے میں تنقید خود بھی تخلیق کا مرتبہ پا سکتی ہے بالکل اسی طرح جیسے اصول سازی سے تنقید فلسفے کی ہم پایہ ہو جاتی ہے۔ دیگر شعراء پر کی گئی تنقیدوں سے تقابلی مطالعہ کرنے پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اردو تنقید واقعی اقبال کی فکری بلندی

کو چھونے میں ناکام رہی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اُردو تنقید کا فلسفیانہ شعور برائے نام ہے کم از کم اقبال کی حد تک تو اس کا عدم اور وجود دونوں ہی برابر ہیں جبکہ اقبال کا سارا کلام دراصل فلسفہ ہے اسی لئے ہمارے ناقدین اور شعرا کے مقابلے میں اقبال کے ہاتھوں مات کھا گئے۔

نقدِ اقبال میں یہ امر بھی معنی خیز ہے کہ اقبال پر اولین مقالات میں زیادہ تر زبان و بیان پر اعتراضات کیے گئے اس کی بڑی وجہ بھی یہی تھی کہ اقبال کے فکری مآخذات تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی جب کہ زبان و بیان کی غلطیاں دریافت کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال پر جو اہلِ زبان نے جو تذکیر و تأنیث، محاورات اور اسی نوع کے جو اعتراضات کیے ہیں انہیں ایک پنجابی شاعر سے اہلِ زبان کا لسانی تعصب قرار دینے کے برعکس یہ سمجھتا ہوں کہ ان کے ادبی شعور اور تنقیدی حس نے جن روایات میں پرورش پائی تھی، ان میں زبان و بیان سے بڑھ کر اور کسی کو اہمیت نہ تھی۔ اس تنقیدی رائے کی اساس فکر کے برعکس عروض پر تھی.. جذبے کے برعکس الفاظ پر تھی جس کے نتیجے میں اس تنقید میں حُسنِ ادا ایسا زریں لبادہ تھا جو کلام کے تمام عیوب چھپا دیتا تھا۔ اقبال کی غلطیاں نکال کر وہ اپنے تنقیدی رویے سے خلوص کا اظہار کر رہے تھے اقبال نے ان معترضین کو جو جواب دیا (ملاحظہ ہو مقالاتِ اقبال مرتبہ: عبدالواحد معینی) اس سے اگرچہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال شعر کے فنی لوازم سے ناواقف نہ تھے لیکن اقبال نے جن مقاصد خاص کے لئے شاعری شروع کی تھی ان کی بنا پر وہ شعوری طور پر حسنِ الفاظ کی طرف متوجہ نہ تھے چنانچہ

بقولِ اقبال:

"شعر محاورہ اور بندش کی درستی اور چستی ہی کا نام نہیں
میرا ادبی نصب العین نقاد کے ادبی نصب العین سے مختلف ہے
میرے کلام میں شعریت ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور میری
ہرگز یہ خواہش نہیں کہ اس زمانے کے شعراء میں میرا شمار ہو" ؎

اقبال نے ایک سے زائد خطوط میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا
ہے چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء کے ایک مکتوب میں یوں لکھا:

"شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمع نظر نہیں
رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں، مقصود
صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس! اس بات
کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی
کوشش کرتا ہوں کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں
اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے
اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لئے ممکن نہیں" ؎

اقبال نے کہا تھا:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں! اور واقعی اس میں تمسخر نہیں واللہ
نہیں ہے بحیثیت ایک انسان بلکہ بحیثیت ایک مرد اقبال کیا تھے، ان کی
شخصیت کی اساس کن نفسیاتی خطوط پر استوار تھی وہ کون سے تخلیقی محرکات

تھے جنہوں نے انہیں اردو شاعری کے مسلّمات سے انحراف پر مجبور کیا اور وہ کون سے عوامل تھے جنہوں نے مادیت کی دُنیا میں مردِ قلندر اور عملی ہونے کے باوجود درویش بنائے رکھا اور ان سب پر مستزاد اس امر کا تجزیہ بھی لازم ہے کہ وہ کونسا فنی منصب تھا جس نے اقبال کو محض ایک شاعر کی جذباتی سطح سے بلند کر کے حکیم الامت کے ارفع منصب پر فائز کر کے اشعار کو چراغِ راہ بنایا تو فکر کو ملت کے لئے راہ نما ستارہ یہ اور اسی نوع کے دیگر سوالات ابتدائی سہی لیکن اقبال فہمی میں ان کی اساسی حیثیت کو کسی طرح سے بھی جھٹلانا ممکن نہ ہوگا لیکن اقبالیات کے تجزیاتی مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اقبال شاعر، اقبال فلسفی، اقبال شیدائے اسلام اور عاشقِ رسولؐ، اقبال مریدِ رومی اقبال مخالفِ عقل، اقبال دشمنِ تہذیبِ مغرب وغیرہ کچھ عنوانات نے دائمی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اور ان پر دل کھول کر خامہ فرسائی بھی ہوئی لیکن اقبال مرد میں کسی نے بھی دلچسپی لینے کی ضرورت محسوس نہ کی تو یہ احساس ہوتا ہے گویا اقبال شخص اور حکیم الامت کو دو جداگانہ ہوا بند خانوں میں رکھا گیا ہے اس طرح سے کہ ایک پر دوسرے کے وجود کی پرچھائیں بھی نہ پڑنے پائے لیکن جس طرح قلب کو نظر سے جدا کرنا ممکن نہیں اسی طرح شخص سے شاعر کو منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہماری تنقید میں بالعموم اور اقبال شناسی میں بالخصوص یہ خامی نظر آتی ہے یہ نکتہ بے حد اہم ہے کہ اس نے اقبالیات سے وابستہ ذہنی فکری اور جذباتی سانچوں کی تشکیل کی اقبالیات میں جو ایک خاص نوع کی تکرار کا احساس ہوتا ہے اور بیشتر مضامین کے مطالعے کے بعد جو یہ احساس ہوتا ہے گویا انہیں پہلے بھی کہیں پڑھ چکے ہیں تو اس کی وجہ بھی مرد اور مفکر میں رشتہ

رکھے گئے اسی قطبین کے بعد میں تلاش کی جا سکتی ہے یورپ میں تخلیق کار کو کبھی بھی یوں الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔ ان کی حقیقت پسندی کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں تنقید کے بیشتر مباحث میں نفسیات سے امداد لینے کا قوی رجحان موجود ہے۔ یہ درست ہے کہ وہاں کے تمام نقاد نفسیاتی نقاد نہیں لیکن یہ بھی ہے کہ ہماری مانند وہ لوگ نفسیات سے الرجک بھی نہیں ہیں۔ نفسیات یا تحلیل نفسی اتنی خوفناک نہیں کہ ہم ڈر کر ان سے آنکھیں بند کر لیں۔ تخلیق کار کے ذہن کے نہاں خانوں سے پھوٹنے والی کرن تخلیق ہے۔ جو شخصیت کے تمام رنگوں سے روشن ہوتی ہے تخلیقی عمل پر اسرار اور ناقابل فہم ہی سہی لیکن اتنا طے ہے کہ یہ تخلیقی عمل شخصیت کی نفسی اساس سے وابستہ ہوتا ہے۔ شخصیت کے لاشعوری محرکات اس میں رنگ آمیزی کرتے ہیں تخلیق کی صورت میں یہ شخصیت کو جو ثمر دیتا ہے اس کی نفسیاتی اہمیت جدا گانہ اور منفرد ہوتی ہے۔ نقاد تخلیق کار کے حوالے سے تخلیق کو سمجھتا ہے تو تخلیق کار کی نفسی ساخت میں تخلیق کی کئی جہات بھی دریافت کرتا ہے الغرض تخلیق اور تخلیق کار۔ کو ملانے والے پل کا نام نفسیات ہے بیچ میں لاشعور کے بھنور اور نفسی عوامل کے گہرے پانی ہی کیوں نہ ہوں لیکن نفسیات کے مضبوط اور محفوظ پل پر سے نقاد ان سب سے بالا ہوتا ہے۔ مگر ہماری تنقید نفسیات سے محروم رہی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ مرد اقبال پر مفکر اقبال چھا گیا اور یہ اقبالیات کا بہت بڑا نقصان ہے۔ ہمارے اپنے عہد کا ہونے کے باوجود ہم اقبال کی شخصیت سے میر اور غالب اتنے بھی واقف نہ ہوں:

"بانگِ درا" کے دیباچے میں سر عبدالقادر نے اقبال کی شاعری کے جو ادوار مقرر کیے تھے اب سبھی انہیں تسلیم کرتے ہیں لیکن ابھی تک کسی نے اقبالیات کے ادوار مقرر کرنے کی کوشش نہ کی حالاں کہ اقبالیات کی عمر کوئی پون صدی بنتی ہے جو تنقید کی کل عمر یعنی حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کی اشاعت (۱۸۹۳ء) سے صرف سات برس کم ہے۔ میرے خیال میں اقبالیات کے تین دور بن سکتے ہیں۔ (۱) ابتدا سے لے کر ۱۹۴۰ء یعنی لاہور میں قرار داد پاکستان کی منظوری تک۔ (۲) ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء یعنی قیامِ پاکستان تک، اور (۳) ۱۹۴۷ء سے اب تک یعنی قیامِ پاکستان کا زمانہ۔ ان ادوار کے ضمن میں یہ امر واضح رہے کہ پہلا دور ۱۹۴۰ء کی بجائے اقبال کے سالِ وفات یعنی ۱۹۳۸ء پر لا کر ختم کیا جا سکتا تھا اور شاید بادی النظر میں یہ درست بھی محسوس ہو لیکن میرا استدلال یہ ہے کہ اقبال نے قومی نظمیں لکھ کر جس ملی شعور کا مظاہرہ کیا تھا وہ قائداعظم کے ساتھ مل کر سیاسی جدوجہد اور پھر الٰہ آباد کے خطبۂ صدارت میں تصورِ پاکستان کی پیش کش کی صورت میں بالآخر نقطۂ عروج کو پہنچتا ہے۔ یوں ۱۹۴۰ء میں قرار داد پاکستان کی منظوری گویا اقبال کے تصور کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے پہلا عملی قدم تھی۔ ۱۹۳۸ء میں انتقال سے قبل گو اقبال کا کلام اور پیغام مکمل ہو چکا تھا لیکن اس پیغام کے اثرات نہ ختم ہوئے تھے لہٰذا ۱۹۴۰ء میں ان اثرات کو قرار داد پاکستان کی صورت میں ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا گیا اس لیے اقبالیات کا دورِ اوّل ۱۹۴۰ء تک ہونا چاہیے۔ دوسرا دور حصولِ پاکستان کے سات پُر آشوب برسوں پر محیط ہے لہٰذا بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر پاکستان کے ساتھ ساتھ اقبال کو نام بھی آ نا طہ خاموش کر دی

اور تنقیدی مقالات کے ساتھ اقبال کے سیاسی تصورات کا تجزیاتی مطالعہ دوسرے دور کی اہم ترین خصوصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ تیسرا دور اقبال کے خواب کی تعبیر پاکستان سے متعلق ہے بطور قومی شاعر گذشتہ ۴۰ برسوں میں اقبال پر بہت کام ہوا ہے۔ اب ان کے نام سے ادارے چل رہے ہیں اور مجلے طبع ہو رہے ہیں یوم اقبال سرکاری طور پر منایا جاتا ہے اور پاکستان میں جرائد اور اخبارات کے لاتعداد اقبال نمبر نکل چکے ہیں۔

اقبالیات کے دورِ اول کا جائزہ لینے پر یہ ششدر کر دینے والی حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ آج یعنی اقبالیات کے تیسرے دور میں جو موضوعات مرغوبِ عام ہیں وہی دورِ اول میں بھی پسندیدہ تھے اور فکرِ اقبال کے جن گوشوں کو آج کے ناقدین اپنی دانست میں پہلی مرتبہ اُجاگر کر رہے ہیں ان میں سے بیشتر موضوعات کا اقبال کی زندگی ہی میں بیشتر لکھنے والے احاطہ کر چکے تھے چند مقالات کے عنوانات سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱- مرزا سلطان احمد — حضرت اقبال کا طرزِ جدید
مخزن اگست ۱۹۱۲ء

۲- سر عبدالقادر — رموزِ بے خودی
،، ستمبر ۱۹۱۸ء

۲ ،، ،، — عشق کا مفہوم فندرا اور اقبال
راوی دسمبر ۱۹۲۸ء

۴۔ زکیہ احمد ہمارا قومی شاعر: اقبال

عالمگیر خاص نمبر ۳۲ ۱۹ء

۵۔ کفایت علی اقبال وطنیت، پین اسلام ازم

اور سیاسی تحاریک

۶۔ شیخ اکبر علی اقبال کی شاعری میں آرٹ کا تصور

ادبی دنیا جون ۳۴ ۱۹ء

۷۔ چوہدری محمد یسین اسرارِ خودی

ہمایوں مئی ۳۲ ۱۹ء

۸۔ ارشاد حسین بقائی۔ اقبال اُردو کا بہترین شاعر

ہمایوں جولائی ۳۴ ۱۹ء

۹۔ جگن ناتھ آزاد اقبال کی منظر نگاری

ہمایوں مئی ۳۶ ۱۹ء

۱۰۔ آل احمد صدیقی سرور جبریل مشرق

سہیل ۳۶ ۱۹ء

۱۹۳۲ء میں نیرنگ خیال نے جو گرانقدر اقبال نمبر نکالا اس کے مقالات اس فہرست میں شامل نہیں کئے گئے۔ یوں بھی یہ فہرست مکمل نہیں صرف بعض موضوعات کی قدامت کا اندازہ کرانا مقصود تھا یہ درست ہے کہ بعد کے ناقدین نے نسبتاً زیادہ وسیع مطالعے کی بنا پر مزید نکتہ طرازیاں کیں لیکن ان

سے دورِ اوّل کی ان تحریروں کی تاریخی اہمیت کم نہیں ہوتی بلکہ اس دور میں لکھے گئے مقالات تو اب بھی سدا بہار ہیں کیا ۱۹۳۸ء تک لکھے گئے مقالات کی آج اہمیت کم ہو سکتی ہے؟

۱۔	خلیفہ عبدالحکیم	اقبال حالات اور شاعری
۲۔	ڈاکٹر سید عبداللہ	اقبال اور سیاسیات
۳۔	ڈاکٹر یوسف حسن خان	اقبال کا تصورِ حیات
۴۔	ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	اقبال کا پیام حیات
۵۔	سید سلیمان ندوی	رموزِ بے خودی
۶۔	چراغ حسن حسرت	اقبال کا فلسفہ سخت کوشی
۷۔	نور الحسن ہاشمی	اقبال کا نوجوان
۸۔	عبدالرحمن بجنوری	مثنویاتِ اقبال
۹۔	رشید احمد صدیقی	پیامِ اقبال
۱۰۔	حمید احمد خان	اقبال کا شاعرانہ ارتقا
۱۱۔	عزیز احمد خان	اقبال کی شاعری میں حسن وعشق کا عنصر
۱۲۔	آل احمد سرور	اقبال اور اس کے نکتہ چیں
۱۳۔	محی الدین قادری زور	اقبال اثر اردو شاعری پر
۱۴۔	نذیر نیازی	تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ

۱۵۔	قاضی عبدالغفار	پیامِ اقبال
۱۶۔	مختار حسن	اقبال کی شاعری پر فنہ یام یورپ کے اثرات
۱۷۔	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔	علامہ اقبال کی شاعری
۱۸۔	ملک راج آنند	اقبال کی شاعری
۱۹	محمد محمود زمان خان	ڈاکٹر اقبال کی اُردو
۲۰۔	ادیب آبادی	علامہ اقبال اور فلسفۂ تصوف

ان منتشر مقالات کی فہرست سے قطع نظر دیگر موضوعات اقبال کی زندگی ہی میں مقبول ہو چکے تھے۔ چنانچہ فلسفۂ تصوف، اسلام، خودی، تصورِ حیات، شاعرانہ پیغام، تصورِ ادب وطنیت، تصورِ عورت، سیاست، تصور زمان و مکان، زبان کے حسن و قبح کی جانچ، انفرادی کتب کا مطالعہ۔ غرضے کہ کون سا ایسا موضوع ہے جس پر اقبالیات کے دَورِ اوّل میں نہ لکھا گیا۔ یہ درست ہے کہ دَورِ اوّل کی بعض تحریروں کی آج تنقیدی اہمیت نہ ہوگی لیکن جہاں تک ان کی تاریخی اہمیت کا تعلق ہے تو اُردو تنقید میں بالعموم اور اقبالیات میں بالخصوص ان کی حیثیت کم نہیں ہو سکتی کہ آنے والے ناقدین کے لیے یہ جادہ تراش

تھے!

---

۱ ماہنامہ "نیرنگِ خیال" اقبال نمبر ۱۹۳۲ء

۲ اسی ضمن میں مزید نوٹس ملاحظہ ہوں:

"قطعہ" (مخزن، مئی ۱۹۱۱ء)۔ "شکوہ" (مخزن، جون ۱۹۱۸ء)

۳ مکتوب مرقومہ ۳ جنوری ۱۹۲۶ء "اقبال نامہ" مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصۂ دوم، ص: ۲۵۴

۴ "اقبال نامہ" حصۂ اوّل ص: ۱۰۸

⁂ ⁂ ⁂

(پروفیسر رفیع الدین ہاشمی)

مسجدِ قرطبہ

"میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک "مسجدِ قرطبہ" پر لکھی۔ . . . . . مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔"

علامہ اقبالؒ

"اندلس کی سرزمین شاعرِ اسلام کی آخری محبوبہ ہے اور پختہ سال شاعر نے اس سے اپنے عشق کی شرح میں فن کی جن بلندیوں کو چھوا ہے وہ اب ہمیشہ تک اچھوتی ہی رہیں گی۔ شاعر نے یہ نغمے غرناطہ کی عطر بیز ہواؤں اور وادیٔ کبیر کی کیف انگیز فضاؤں میں خود ڈوب کر لکھے ہیں . . . . . مسجدِ قرطبہ اقبال کی پختہ تر شاعری میں ایک امتیازی مقام رکھتی ہے۔ اور اس کے بعض مقامات یقیناً دنیا کی عظیم ترین شاعری میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔"

مولانا صلاح الدین احمد

- تعارف و پس منظر
- قرطبہ اور مسجدِ قرطبہ
- فکری جائزہ

— کائنات کا تکوینی نظام

— نظریۂ فن

— نظریۂ عشق

— مسجدِ قرطبہ کا جلال و جمال

— نظریۂ مردِ مومن

— مسلم ہسپانیہ کی عظمت و شکوہ

— اندلس میں احیاءِ اسلامی: اہمیت و امکانات

- فنی تجزیہ:

— ایجاز و بلاغت

— تنوع

— فارسیت

— غنائیت

ـــــ دیگر محسناتِ نظم

٭ مجموعی قدر و قیمت ۔

تعارف و پس منظر

اقبال ؒ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن روانہ ہوئے ــــ کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد پیرس ہوتے ہوئے اسپین پہنچے ــــ میڈرڈ یونیورسٹی کی دعوت پر یونیورسٹی میں "ہسپانیہ اور عالمِ اسلام کا ذہنی ارتقاء" کے موضوع پر ایک لیکچر دیا۔ اسی سفر کے دوران انہیں اسپین کی سیاحت کا موقع ملا۔ اسپین صدیوں تک مسلم تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا، اس لئے اقبال کو اس خطّے سے خصوصی تعلقِ خاطر تھا۔ لکھتے ہیں :۔

"میں اپنی سیاحتِ اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا ہوں دوسری نظموں کے علاوہ ایک مسجدِ قرطبہ پر بھی لکھی۔ الحمرا کا تو مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایک ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔" [۱]

---

۱ اقبال نامہ (دوم) ص 321

زیارتِ مسجد کا دلچسپ واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔
اقبال مسجد میں پہنچے تو بے اختیار چاہا کہ مسجد قرطبہ میں تحیۃ المسجد کے نفل ادا کریں۔ اس عمارت کے نگران سے پوچھا۔ اُس نے کہا میں بڑے پادری سے پوچھ آؤں۔ اُدھر وہ پوچھنے گیا، علامہ نے نیت باندھ لی اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی ادائے نماز سے فارغ ہو گئے۔[۲ے]
بعض روایات کے مطابق اقبال نے مسجد میں اذان بھی کہی۔ یہ نظم علامہ کی زیارتِ مسجد قرطبہ (۱۹۳۳ء) کی یادگار ہے۔

قرطبہ اور مسجدِ قرطبہ

قرطبہ (CORDOVA) تقریباً پانچ درجے طولِ بلد مغرب میں اور ۳۸ درجے عرضِ بلد شمال میں واقع اسپین کا معروف شہر ہے۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں صدر مقام رہا۔ آج بھی وسطی اور مغربی حصے میں بڑے بڑے دروازوں، تنگ اور پُر پیچ گلیوں، برجوں اور فصیل کے بعض حصوں کی صورت میں قرطبہ کی عظمتِ رفتہ کے نشانات باقی ہیں۔ سونے اور چاندی کے پانی سے نقش نگاری کی صنعت آج بھی قرطبہ میں زندہ ہے۔

[۲ے] ذکرِ اقبال۔ ص ۱۸۵

قرطبہ کی تاریخ کئی سال قبل مسیح پرانی ہے (قرطبہ سب سے پہلے ۷۱۱ء میں مسلمانوں کے زیرِ تسلط آیا) عبدالرحمان اوّل نے قرطبہ کو اپنی سلطنت کا دارالخلافہ بنایا۔ دسویں صدی کے وسط میں عبدالرحمان ثالث کے دور میں اس کی شان و شوکت قابلِ دید تھی۔ پھر فرانسیسیوں کے حملے میں تباہ ہوگیا۔ جنرل ڈائکو نے ۳۹-۱۹۳۶ء کی خانہ جنگی میں قبضہ کر لیا۔ ۱۹۰۵ء میں اس کی آبادی ۱۶۵۴۰۳ تھی۔

اس شہر میں مذکورہ جامع مسجد کا سنگِ بنیاد اندلس کے مشہور اموی فرماں روا عبدالرحمان الداخل کے ہاتھوں رکھا گیا۔ مسجد کی تعمیر اور عہد بہ عہد اس میں اضافہ و توسیع اور تکمیل کی تاریخ کچھ یوں ہے۔ اس مسجد کی تعمیر کا نقشہ امیر (عبدالرحمان) نے خود ہی تیار کیا تھا اور تعمیر میں پہلی اینٹ بھی بہ نفسِ نفیس خود ہی رکھی۔ تعمیرِ مسجد کی نگہداشت وہ بلا ناغہ کرتے۔ اس کی خوب صورتی کے لئے اُنہوں نے جگہ جگہ سے جواہرات اکٹھے کئے۔ سنگِ مرمر کی سلیں منگوائیں۔ سارا فرش سنگِ مرمر کا رکھا کہ نمازیوں کے پیر تمازتِ سورج کی وجہ سے جلنے نہ لگیں۔ چھت میں نقش و نگار بنوائے۔ دیواروں کو مزین کیا۔ ستونوں کو آراستہ و پیراستہ کیا۔ لمبے لمبے چوڑے چوڑے آبنوسی دروازے لگوائے اور اس سے دگنی خوش نما اور خوش شکل محرابیں بنوائیں۔ صناع اور نقش بنانے والے دُور دُور سے منگوائے گئے اور ان کو یہ احکامات صادر کئے گئے کہ اس کی خوبصورتی میں کوئی دقیقہ

باقی نہ رکھا جائے۔ اس کی تعمیر میں ایک لاکھ سے زائد دینار خرچ ہوئے پھر بھی عبدالرحمان کی زندگی میں اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ ؎۱

عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد اس کے لائق فرزند ہشام نے مسجدِ قرطبہ کی تعمیر کا کام جاری رکھا۔ خود بھی وہ مزدوروں کے دوش بدوش حصّہ لیتا تھا۔ اس نے دُور دُور سے مختلف قسم کے پتھر اور مسالے منگوائے مجموعی طور پر اس نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار دینار کی رقم مسجد کی تکمیل و زیبائش پر خرچ کی ——— عبدالرحمٰن (۸۲۲ء تا ۸۵۲ء) نے بھی مسجد کی توسیع میں حصّہ لیا۔ توسیع کے ساتھ ساتھ نقش و نگار کے ذریعے مسجد کے ظاہری حسن و زیبائش میں اضافہ کیا گیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اندلس کے شاہانِ اموی مسجد قرطبہ کی توسیع، اس کی شان و شوکت، زیب و زینت اور خوب صورتی میں اضافہ کرنا اپنا دینی فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ تقریباً ہر حکمران نے حصولِ ثواب کی خاطر اس کارِ خیر میں حصّہ لیا۔ عبدالرحمٰن الناصر (م ۹۶۱ء) کے زمانے میں اس مسجد کی دلکشی اور حسن کا یہ عالم تھا کہ لوگ دُور دُور سے اس کی زیارت کو آتے تھے۔

تکمیل محمد بن ابی عامر المنصور (وزیرِ اعظم) کے ہاتھوں ہوئی۔ اس نے مسجد کی مشرقی دیواریں گرا کر صحن کو وسیع کیا اور اس کے درمیان

؎۱ عبدالقوی ضیا: "تاریخ اندلس"، حیدرآباد، ۱۹۶۴ء، ص - ۱۶۳

وضو کے لئے ایک حوض بنوایا۔ اب مسجد کی صورت یہ ہوگئی۔

مسجد کا طول	305 گز
؍؍ عرض	285 ؍؍
محرابوں کی تعداد	1417 (اب صرف 850 باقی ہیں)
مسجد کے دروازے	21 عدد
خدام مسجد	159 نفوس

امام کے بیٹھنے کا منبر ۵۰۰ ۵ اشتقال سونے کے خرچ سے آٹھ سال میں تیار ہوا۔ اس میں خوشبودار اور قیمتی لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ مسجد میں وضو کے لئے قرطبہ کے پہاڑوں کے پتھروں سے خوب صورت حوض بنائے گئے تھے اور پہاڑوں سے ہی نہروں کے ذریعے ان میں پانی جمع ہوتا تھا۔ دروازے پیتل سے منڈھے ہوئے تھے۔ ان کے جوڑ اس طرح سے ملائے گئے تھے کہ پتہ نہ چلتا تھا کہ واقعی جوڑ ہیں یا پورا ایک ٹکڑا۔ مسجد کی روشنی کے لئے جو تیل آتا تھا، وہ سونے چاندی کے مشکوں میں بھرا رہتا تھا۔

عیسائی تسلط کے بعد مسجد قرطبہ کو گرجا بنا دیا گیا محرابوں اور دیواروں پر لکھی ہوئی آیات کو پلاسٹر سے چھپا دیا گیا۔ یہ صورتِ حال کئی سو سال تک برقرار رہی۔ یہاں تک یورپ میں

نشاۃِ ثانیہ کے دَور کا آغاز ہُوا جدید علوم کی روشنی پھیلی اور مذہبی تعصّب میں کمی ہوئی تو مسجدِ قرطبہ کو عیسائی راہبوں سے لے کر محکمۂ آثارِ قدیمہ کے حوالے کیا۔ اُنہوں نے پلاسٹر اُتارا تو قرآنی آیات کے نقوش اُسی آن بان اور حسن و جمال سے دوبارہ نظر آنے لگے۔ چھتوں پر لکڑی کا کام بھی بدستور موجود ہے۔ یہی چیز ہے جسے اقبال نے "رنگ ثبات دوام" کہا ہے۔

فِکری جائزہ

"مسجدِ قرطبہ" کے مباحث کو مندرجۂ ذیل عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :۔

۱۔ کائنات کا تکوینی نظام۔

۲۔ نظریۂ فن۔

۳۔ نظریۂ عشق۔

۴۔ مسجدِ قرطبہ کا جلال و جمال۔

۵۔ مردِ مؤمن۔

۶۔ مُسلم ہسپانیہ کی عظمت و شکوہ۔

۷۔ اندلس میں احیاءِ اسلامی۔

کائنات کا تکوینی نظام

"مسجد قرطبہ" میں شاعر نے سب سے پہلے

زمانے کی اصل حقیقت اور کائنات میں برپا ہونے والے انقلابات کی ماہیت پر روشنی ڈالی ہے، دوسرے الفاظ میں اس نے تمہیداً کائنات کے تکوینی نظام کو واضح کیا ہے ـــــ یہ سلسلۂ خیال پہلے بند میں منظم شکل میں مربوط اشعار کے ذریعے بیان ہوا ہے جسے ترتیب وار یوں بیان کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ اللہ تعالےٰ نے روز و شب کا سلسلہ ایک خاص ارادے کے تحت اور ایک خاص مقصد کی خاطر تخلیق کیا ہے۔ کائنات میں واقع ہونے والے تغیرات و حادثات کا اس تخلیق سے گہرا تعلق ہے۔ پیدائش، موت اور ہر نوعیت کی دیگر تبدیلیاں اس خدائی نظام کا حصہ اور اس کے جاری رہنے کا لازمی تقاضا ہیں۔

۲۔ سلسلۂ روز و شب یعنی خدائی نظام کے جاری رہنے سے ہمیں ذاتِ باری تعالیٰ کی صفات کا عرفان ہوتا ہے۔ کائنات کی رنگا رنگی کیفیتیں اور نوع بہ نوع تبدیلیاں درحقیقت ذریعہ ہیں اس کو پہچاننے کا ـــــ اسمائے الٰہی ننانوے (۹۹) ہیں۔ مثلاً علیم، خبیر، خالق، قادر، حیّ، قیوم، سمیع وغیرہ اور یہی اس کی صفات ہیں۔

۳۔ خدا کی یہ کائنات وسعت کے لحاظ سے بے حد و حساب اور لا

متناہی ہے۔ اسی طرح اس کے اندر واقع ہونے والی تبدیلیاں اور انقلابات بھی غیر محدود ہیں۔ اور لامحدودیت کائنات کے غیر مختتم امکانات کو ظاہر کرتی ہیں۔ یعنی انسان اپنی شخصیت کی خفتہ صلاحیتوں سے کام لے کر اور کائنات کے وسائل کے ذریعہ اصلاحِ ذات کے فریضے سے لے کر تسخیرِ کائنات کا کارنامہ انجام دے سکتا ہے اور یہ "سازِ ازل" (تخلیق کائنات) کی تکمیل ہوگی۔

۴۔ ہر فرد یا قوم کو یہ فریضہ انجام دیتے ہوئے خیال رکھنا ہوگا کہ زمانہ ایسا صیرفیٔ کائنات ہے جو کھرے کھوٹے کا علم ہے۔ زمانہ صرف اُس فرد یا قوم کو بقا کی ضمانت دیتا ہے جو ہمیشہ اپنے اعمال و افعال کا جائزہ لیتی رہتی ہے۔ ع

کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

۵۔ اگر اس معاملے میں ذرا بھی کوتاہی کی جائے تو زمانہ ایسا بے لاگ منصف ہے، جو کسی سے رورعایت نہیں کرتا ——— زمانے کے ہاتھوں ہر شے ہلاک اور فنا ہو جانے والی ہے اور یہ خدا کا تکوینی نظام ہے ——— اس مفہوم کو شاعر نے پہلے بند کے آخری شعر میں یہ تمام و کمال بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

نظریۂ فن | "اول و آخر فنا" کہہ کر شاعر نے قدرت کے تکوینی نظام کا جو قاعدۂ کلیہ بیان کیا تھا، دوسرے بند کے

—— پہلے شعر کے ذریعے اس میں ایک استثنائی صورت پیدا کی ہے کہ صرف
... وہ چیز فنا کی دست بُرد سے بچ سکتی ہے جس کی تخلیق میں کسی "مردِ خدا"
کا ہاتھ ہو —— تیسرے بند کے دو اشعار (نمبر ۲، ۳) اور نظم کا سب سے
آخری شعر، اسی سلسلۂ خیال کی کڑیاں ہیں، جس میں اقبال نے درحقیقت اپنے
نظریۂ فن کی اہم ترین خصوصیت بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ فن مصوّری
کا ہو یا سنگ تراشی کا، تعمیر، موسیقی، نغمہ، اور شاعری کا، محنتِ پیہم اور
لگن کے بغیر اس میں پختگی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اسے بقا حاصل ہوتی ہے۔
کسی بھی فنی نقش میں "رنگِ ثباتِ دوام" پیدا کرنے کے لئے بقول میر
"بڑی خوش سلیقگی سے جگر خوں" کرنا پڑتا ہے —— اقبال نے دوسرے
مقامات پر بھی فنی تکمیل کے لئے خونِ جگر کی ضرورت و اہمیت پر
زور دیا ہے۔

نظریۂ عشق

کسی نقش میں رنگِ ثباتِ دوام کے لئے اقبالؒ نے شرط
یہ عائد کی تھی کہ اس کی تکمیل کسی مردِ خدا کے ہاتھوں
انجام پائی ہو —— اقبالؒ کے ہاں مردِ خدا اور کیفیتِ عشق لازم و
ملزوم ہیں۔ اسی لئے اُس نے کہا۔ ع

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ

اور یہاں سلسلۂ خیال کا رُخ عشق کی طرف مُڑ جاتا ہے۔ دوسرے بند
کے اختتام تک عشق کی اصلیت و حقیقت، اس کی مختلف کیفیتوں، اس

کی قوت، عظمت اور شان کا بیان ہُوا ہے۔

"مسجد قرطبہ" میں اقبال کا ایک نئی جہت سے عشق تک اپروچ ہے۔ اُن کا نظریۂ عشق یہاں انتہائی کامل (   ) صورت میں نظر آتا ہے۔ اس کے اہم پہلو یہ ہیں:۔

ا۔ "مسجد قرطبہ" میں نظریۂ عشق کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ زمانے اور سلسلۂ روز و شب سے سلسلۂ خیال ملایا جائے تو ہم یوں کہیں گے کہ زمانہ کائنات کی ہر شے کو فنا کر دینے والا ہے، مگر عشق کو استثناء حاصل ہے۔ پہلے بند میں اقبال نے کہا تھا۔ ع

ایک زمانے کی رَو جس میں نہ دن ہے نہ رات اوّل و آخر فنا، ظاہر و باطن فنا ——— مگر عشق کے پاس زمانے کی رَو (جو فنا کا دوسرا نام ہے) کے زہر کا تریاق موجود ہے۔ اس لحاظ سے وہ سب سے بڑی حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ کائنات کی سب سے بڑی طاقت بھی ہے۔

۲۔ کائنات میں عشق کی مختلف حیثیتیں اور کیفیتیں ہیں مثلاً:۔

(ا) عشق کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے ——— جیسے خدا کا کلام

(ب) عشق غیر فانی ہے ——— جیسے دمِ جبرئیل

(ج) عشق کائنات کی مقدس ترین چیز ہے ——— جیسے خدا کا رسولؐ

(د) عشق کائنات کی سب سے پاکیزہ شے ہے ——— جیسے دلِ مصطفیٰؐ

(ھ) عشق ہی کائنات میں مقتدر اور حکمران ہے ——— جیسے فقیہِ

حرم اور امیر جنود

وعلیٰ ہٰذا القیاس

۳۔ حیات و کائنات کے بقا کا انحصار محض عشق پر ہے ــــــ ظاہر ہے کہ جو چیز متذکرہ بالا خصوصیات کی حامل ہوگی، وہی کائنات کا مرکز و محور ہوگی۔ اسی سے زندگی کے نغمے پھوٹیں گے۔ اور نور و نارِ حیات بھی اسی کے مرہونِ منت ہوں گے ــــــ یہ عشق کی انتہائی، اعلیٰ اور کامل ترین صورت ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ وہ "سدرۃ المنتہیٰ" ہے کہ عشق اس سے زیادہ بلندی تک جا ہی نہیں سکتا۔ یا یوں سمجھئے کہ عشق بجلی کی وہ رو (   ) ہے جس سے کائنات کا پورا کارخانہ چل رہا ہے، اگر عشق کی رو بند (   ) ہو جائے تو پوری کائنات یک بہ یک گہری تاریکی میں ڈوب جائے اور پورا کارخانہ رک جائے ــــــ اس سے عشق کی حقیقی قوت اور طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مسجدِ قرطبہ کا جلال و جمال

عشق کی قوت و اہمیت واضح کرنے کے بعد کلام کا رخ نظم کے اصلی موضوع مسجدِ قرطبہ کی طرف مڑ جاتا ہے۔ کیونکہ مسجدِ قرطبہ کا عشق سے بہت قریبی تعلق ہے۔ بلکہ مسجدِ قرطبہ کی بنا ہی عشق پر استوار ہے۔ ع

اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود

یہاں ضمنی طور پر تین باتیں مذکور ہوتی ہیں:۔

(ا) نظریہ فن جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

(ب) انسان کے اشرف المخلوقات ہونے اور عظمتِ آدم کا اعتراف

اور

(ج) شاعر کا ذوق و شوق۔

موخّر الذکر دونوں پہلو عشق کی مختلف کیفیات ہیں، ان کا سبب عشق ہے۔ تیسرے بند کے آخری پانچ شعر دراصل دوسرے بند کا تکملہ ہیں۔

چوتھے بند میں سلسلۂ خیال پھر مسجدِ قرطبہ کے وجود سے مربوط ہو جاتا ہے۔ تین اشعار میں اقبالؒ نے مسجد کے جلال و جمال، عظمت و شکوہ، ظاہری حسن و زیبائش اور رعنائی کی طرف نہایت بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے۔ مسجد کے "جلال و جمال" کے بارے میں سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:۔

"مسجدِ قرطبہ کی تعمیر میں جو فنی اور جمالیاتی نفاست ملحوظ رکھی گئی ہے اس کی تعریف میں مشرق و مغرب کے نقاد دفتر کے دفتر لکھ چکے ہیں۔ مسجد کی مستطیل متناسب ستونوں کی قطاریں، محرابوں کا سلسلہ، وسطِ صحن میں وضو کا حوض، مسجد کی متوسط بلندی اور

اس کے مقابلے میں میناروں کا طول ۔۔۔ یہ تمام باتیں صنعت گری اور فن کاری کے کمال پر دلالت کرتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جمالیات کے نقاد تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مسجد قرطبہ کی محراب کا اسلوب بے نظیر ہے اس کی مثال نہ کہیں اسلامی ممالک میں ملتی ہے نہ کہیں اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رات کے وقت مسجد میں دو ہزار فانوس جگمگ جگمگ کرتے تھے۔ ان فانوسوں کی کیفیت یہ تھی کہ دو بتیاں ایک دوسرے کے اوپر جلتی تھیں۔ ان کے پردوں پر طرح طرح کے نقش و نگار ہوتے تھے جن سے چھن چھن کر روشنی نکلتی تھی۔ جن زنجیروں سے فانوس لٹکے رہتے تھے۔ ان میں کنول کے پھول یا کھجور کے پتے یا انار بنے ہوتے تھے۔ چمڑے کے منقش پردے، جن پر سنہرا اور پہلا کام ہوتا تھا مسجد کی دیواروں پر لٹکا دیئے جاتے تھے۔ دیواروں کی پچی کاری کے ساتھ ان کی زیبائش اور دو ہزار فانوس کی روشنی میں رات کو دل پر کیا اثر پیدا کرتی ہوگی۔ اس کا اندازہ خود ہی کر لیجئے۔" [1]

ڈاکٹر یوسف حسین خان کے بقول مسجد قرطبہ ایک جلیل القدر

---

[1] "ماہِ نو" اپریل ۱۹۷۰ء ص ۱۰۶

قوم کی جفاکشی، جاں بازی، مہم جوئی اور بلند خیالی کی زندہ تصویر ہے۔" [1]

نظریۂ مردِ مؤمن

مسجدِ قرطبہ اور مردِ مؤمن میں جلال و جمال کی صفات مشترک ہیں۔ چناں چہ اقبال کا سلسلۂ خیال مسجد سے مردِ مؤمن کی طرف مُڑ جاتا ہے۔ یہاں اقبال نے پہلے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا تذکرہ کیا جو اس کے مثالی مردِ مؤمن کا عملی نمونہ تھے ــــ ان مسلمانوں نے اپنی اولوالعزمی، شجاعت اور بلند کرداری کی بہ دولت ایک دُنیا کو مسخّر کر کے مظلومِ انسانیت کو امن و محبّت اور خوشحالی کا پیغام دیا ــــ ان مسلمانوں نے اندلس پہنچ کر علوم و فنون میں حیرت انگیز ترقی کی اور تمدّن کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ حتیٰ کہ یورپ مسلمانوں کے علم و فن اور تمدّن سے اکتساب کرنے لگا۔

اور پھر اقبال اپنے مثالی مردِ مؤمن یا مردِ کامل کی صفات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ پانچواں بند تمام تر اقبال کے نظریۂ مردِ مؤمن کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ "تجھ سے ہُوا آشکار" کہہ کر اقبال نے سلسلۂ کلام میں بندۂ مؤمن کے تصور کو مسجدِ قرطبہ سے ازسرِنو مربوط کر دیا ہے۔

یوں "مسجدِ قرطبہ" میں مردِ مؤمن کے بیان کے دو حصے ہیں: ۔

---

[1] "روحِ اقبال"۔ ص ۱۰۷

۱۔ پہلے حصّے میں (جو پانچویں بند کے پہلے دو شعروں اور چھٹے بند کے صرف دوسرے شعر پر مشتمل ہے) بندۂ مومن کی عظمت کا اعتراف مسجد قرطبہ کے حوالے سے کیا گیا ہے ۔۔ مسجد کی بلندی وسعت، خوب صورتی، روشنی اور رعنائی سے ہی مومن کے جلال و جمال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گویا اس کی شخصیت، مسجد کی صورت میں منعکس ہے۔

۲۔ دوسرے حصّے میں (پانچویں بند کا بقیہ) حصّہ مردِ مومن کی بعض اور اس کے کردار کے ایسے پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن کا تذکرہ قرآن و حدیث اور اسلامی تاریخ میں ملتا ہے۔ اقبال کا تصورِ مردِ مومن کا ایک خالصتاً اسلامی نظریہ ہے، جس کی اساس قرآن و حدیث ہے۔ اور یہ کہ نیٹشے کا مافوق الفطرت انسان یا الجیلی کا مردِ کامل اقبال کے مردِ مومن سے بالکل مختلف ہے۔

مُسلم ہسپانیہ کی عظمت و شکوہ

مردِ مومن اور مسجدِ قرطبہ عظمت و رفعت میں ایک دوسرے سے کم نہیں، اس لئے چھٹے بند کے پہلے دو شعروں میں اقبال نے ایک طرف "کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مبین" کہکر مسجد کی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا اور دوسری طرف قلبِ مسلماں کو اس کی نظیر بنا کر مردِ مومن کو جلال و جمال میں مسجد کے برابر درجہ عطا کیا ہے۔ لیکن نظم کے اس حصّے میں شاعر کا سلسلۂ خیال اندلس، کی "حرم مرتبت زمیں" کی طرف مڑ گیا ہے۔ اقبال"

نے چھٹے بند میں مسلم ہسپانیہ کی عظمت و شکوہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ حصہ دراصل اقبال کے اس مصرعہ ؎

ماننِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں

کی تشریح ہے ___ اور اس کا بیان تین پہلوؤں سے ہوا ہے:

۱۔ سب سے پہلے حرم مرتبت اندلس کے باسیوں اور ان عربی شہسواروں اور مردانِ حق کا ذکر کیا ہے جو حاملِ خلقِ عظیم اور صاحبِ صدق و یقین تھے۔ اندلس کی سرزمین پر قدم رکھنے والا مسلمانوں کا سب سے پہلا گروہ عربی النسل لوگوں پر مشتمل تھا ___ یہ لوگ اپنے اخلاق و کردار اور ذاتی اوصاف کے اعتبار سے مثالی مسلمانوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ مسلمانوں کے سپہ سالار طارق زیاد نے ساحلِ اندلس پر اترتے ہی کشتیوں کو جلا دیا۔ یہ اوّلین اقدام ہی اس قدر حیران کن اور بظاہر محیر العقول تھا کہ صاحبانِ صدق و یقین کے سوا کوئی اور ایسا اقدام نہیں کر سکتا تھا اور کسی دوسرے گروہ کو جسے صدق و یقین کا عرفان حاصل نہ ہو، ایسے اقدام کی کوئی توجیہہ سمجھ میں بھی نہیں آسکتی ___ "طارق کی دعا" میں اقبال نے ان کی ایک جھلک دکھائی ہے (ملاحظہ ہو بالِ جبریل ص ۱۴۲)

پھر جو لوگ ان غازیوں کے وارث بنے، وہ حکمرانی کو اپنے لئے شاہی نہیں فقر سمجھتے تھے۔ اسپین کے مسلم حکمرانوں سے بہت سی قابلِ اعتراض حرکات بھی سرزد ہوئیں لیکن بحیثیتِ مجموعی ان کا کردار

بمقابلہ اپنے دشمنوں کے کہیں زیادہ باعظمت اور بلند تھا۔ خصوصاً اُن حکمرانوں کے کردار میں جنہوں نے مسجد قرطبہ کی تعمیر میں حصّہ لیا، ہمیں "خلقِ عظیم" کی بڑی روشن مثالیں ملتی ہیں۔ مسجدِ قرطبہ کی بُنیاد عبدالرحمٰن الداخل نے رکھی۔ وہ جلاوطنی میں بے سروسامانی کے عالم میں وطن سے نکلا اور خانہ بدوشی کے دَور میں صحراؤں اور بیابانوں کی خاک چھانتا پھرا ——— اس کے لیے اپنی جان بچانا مشکل ہو رہا تھا۔ خطرات اور مشکلات چاروں طرف سے یورش کر رہے تھے۔ مگر اُس نے پے در پے آزمائشوں کے باوجود کبھی حوصلہ نہ ہارا۔ آخرکار ایک عظیم الشّان ملک کا حکمران بنا ——— دشمن بھی اس کی دلیری و شجاعت، اولوالعزمی عقل و فہم اور حکمت و تدبّر کے معترف تھے مؤرّخین لکھتے ہیں: ایک بار خلیفہ المنصور کے دربار میں ذکر چھڑا کہ کون شخص "قریش کا شاہین" خطاب کا مستحق ہے۔ خلیفہ کو اُمید تھی کہ لوگ اس کا نام لیں گے۔ مگر درباریوں نے کہا: انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اس کا مستحق عبدالرّحمٰن بن معاویہ بن ہشام ہے۔

مسجدِ قرطبہ کی تعمیر و توسیع میں عبدالرّحمٰن کے بیٹے ہشام کا بھی اہم حصّہ ہے وہ ایک عدل پرور، سخی اور سادگی پسند حکمران تھا۔ پُرتکلف اور ریشمی لباس سے اُسے نفرت تھی۔ جاہ و حشمت اور نام و نمود سے کوسوں دُور بھاگتا تھا۔ حاجتمندوں کی حاجت روائی اور فریادیوں کی دادرسی

کو مقدم جانتا تھا۔ ایک بار اپنے محل میں اضافے کی خاطر دہ زمین کا ایک ٹکڑا خرید نا چاہتا تھا۔ زمین کے مالک سے گفتگو کے دوران میں پتہ چلا کہ اُن کا ہمسایہ بھی اسی مکان کو خریدنے کی نیت رکھتا ہے۔ مگر بادشاہ کی وجہ سے خاموش ہے۔ ہشام نے مکان کی خریداری کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے دور میں ظلم وستم کا خاتمہ ہو گیا اور ہر طرف خوشحالی اور بے فکری کا دَور دَورہ ہو گیا۔ مؤرخ علامہ مقری کا خیال ہے کہ ہشام اپنی عادات واطوار کے لحاظ سے کسی طرح بھی عمر بن عبدالعزیز سے کم نہ تھا۔ نجی زندگی میں متقی، عبادت گذار اور شریعتِ اسلامی کا سختی سے پابند تھا۔

مسجد میں آخری توسیع اور تکمیل ابن ابی عامر المنصور کے ہاتھوں انجام پائی۔ یہ وہ شخص تھا جس کے جامع کمالات ہونے پر مؤرخ متفق ہیں۔ اس نے اپنے ۲۶ سالہ دورِ وزارت میں کم و بیش ۵۶ لڑائیاں لڑیں اور کبھی شکست نہیں کھائی۔ دشمن عیسائی اُس کا نام سُن کر ہی کانپنے لگتے تھے۔ عالموں، شاعروں اور ادیبوں کا بے حد قدر دان تھا۔ اس کی فیاضی اور عدل وانصاف کی بے شمار داستانیں مشہور ہیں۔ رات کو گشت کے ذریعے عوام کے حالات معلوم کرتا۔ اور اُن کی داد رسی کرتا۔ اُس نے بہت سی نئی عمارتیں، پُل اور مساجد تعمیر کرائیں جن میں مدینۃ الزہرا بہت اہم ہے۔ جہاد کرتے ہوئے ہمیشہ اُس نے شہادت کی آرزو کی مگر پوری نہ ہو سکی۔ اس کی موت ایک عظیم المرتبت، باحوصلہ جری اور بلند پایہ شخصیت کی موت تھی۔

یہ ان عربی شہسواروں میں سے چند ایک کا ذکر ہے جو طارق کے صحرا نشینوں کے وارث اور اقبال کے صاحبانِ صدق و صفا تھے اور ان کے کردار میں "خلق عظیم" کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ ہسپانیہ میں بھی اقبال نے اِن ہی کے بارے میں کہا:-

روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں
خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں

یہ لوگ مسلم ہسپانیہ کی عظمت کے امین اور زندہ نشانات تھے۔

۲- پھر یہی لوگ تھے جنہوں نے مشرق و مغرب خصوصاً یورپ کو علم و فضل سے روشناس کرایا اور تمدنی آداب سکھائے۔ ہسپانیہ کا مُسلم دورِ حکومت حکمت و روشنی کا ایک ایسا مینار تھا جس سے یورپ نے اپنی تاریکیوں کو منوّر کیا ــــ یورپ پر اندلسی مسلمانوں کے احسانات سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ کانٹے، چُھری اور نیپکن و چمچوں کے استعمال سے لے کر طب، جرّاحی، ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ جیسے علم و فنون تک یورپ نے ہسپانیہ کے مسلمانوں سے سیکھے۔

مؤرخ لیبان مسلمانوں کے اعلےٰ طبیب اور جرّاح ہونے کا معترف ہے۔ اندلس کے معروف سرجن ابوالقاسم نے فنِ جرّاحی پر ایک یادگار کتاب لکھی ہے۔ [۱]

---

[۱] روزگار فقیر: (حصّہ اوّل) ص ۱۳۶

مؤرخ DOZY کا بیان ہے کہ حکم کے زمانے میں اندلس میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو، جو لکھ پڑھ نہ سکتا ہو۔ جبکہ یورپ میں ایک خاص طبقے کے چند لوگوں کے سوا عام آدمی ان پڑھ تھے۔ قرطبہ یونی ورسٹی علوم وفنون کے مختلف شعبوں اور تعلیم کی بلند معیاری کے سبب دُنیا بھر میں مشہور تھی۔[1]

موجودہ انگریزی ہندسوں، چینی اور شیشے کے ظروف، انگریزی طرز کے بالوں اور ٹیڑھی مانگ، سنگار اور بعض خوشبویات تک کے لئے یورپ مُسلم ہسپانیہ کا مرہونِ منت ہے۔ شہروں کی صفائی، پانی کی بہم رسانی کے لئے موزوں انتظام مکانات کی کشادگی اور ہوا کی ضرورت، سڑکوں کی چوڑائی اور روشن دانوں کی اہمیت ——— غرض احساس ( )

کا سرچشمہ اور منبع بھی اندلسی مسلمان ہیں۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ شمالی سپین کی عیسائی ریاستیں اگر کبھی مسلم علاقہ فتح کر لیتیں تو وہاں کے عیسائی باشندے ان کے حق میں بد دُعا کرتے تھے اور یہ آس لگا کر بیٹھ جاتے تھے کہ کب خدا ان ظالموں کے ہاتھ سے نجات دے کر پھر مسلمانوں کو حکمران بناتا ہے جن کے زیر سایہ ان کی آزادی، جان و مال، عزت و آبرو اور ان کی خانقاہیں اور گرجے محفوظ تھے معمولی سا ٹیکس لیا جاتا تھا اور وہ سکھ چین کی زندگی بسر کرتے تھے، ۱۹۳۲ء میں پیرس میں اقبال کی ملاقات فرانس کے عالم میسنگ نون سے ہوئی۔ یہ

---

[1] ایضاً

شخص مسلمانوں کے زمانہ اسپین پر تحقیق کر رہا تھا۔ اس نے دورانِ ملاقات میں اقبال کے سامنے اعتراف کیا کہ یورپ پر مسلمانوں کے عظیم احسانات ہیں انھوں نے تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا اور تعلیم و معاشرت کے بہت سے شعبوں میں مغرب کی ترقی کے لیے نئے نئے مواقع عطا کیے۔

مسلمانوں کے اس عظیم الشان دورِ حکومت اور ان کے تہذیبی و تمدنی اثرات اس قدر دور رس ہمہ پہلو اور گہرے تھے کہ باوجود صدیاں گزر جانے کے، جب کہ عیسائیوں نے کسی ایک مسلمان کو بھی زندہ نہیں چھوڑا، قتل کر دیا یا بجبر عیسائی بنا لیا اور مسلمانوں کے آثار و نشانات کو منہدم کر دیا۔ آج بھی اس کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں —— علامہ اقبال کے نزدیک سپین اور اس کے باشندوں کی خوشدلی، سادگی اور گرم جوشی نسلی اثرات کا نتیجہ ہے —— سپین اور اس کے باشندوں میں اقبال کو بعض ایسی خصوصیات نظر آئے ہیں جن کا تعلق حجاز و یمن سے ہے اور جنہیں دیکھ کر بے اختیار اسپین کا مسلم دورِ حکومت یاد آ جاتا ہے ——

اندلس میں احیاءِ اسلامی —
اہمیت و امکانات

تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی بھی مسلمان کے لیے اپنے دل کو ہسپانیہ میں احیاءِ اسلامی کی تمنا سے بچانا بہت مشکل ہے۔ خصوصاً اقبال جیسے دردمند مسلمان کے لیے۔ جب وہ مسجد قرطبہ کے ایوانوں میں گھوم رہا ہو

اور دریائے الکبیر اپنی موجوں میں مسلمانوں کی صدیوں کی پُرشکوہ داستانیں سمیٹنے لگا ہوں کے سامنے بہ رہا ہو۔ شاعر کے گوشۂ دل میں احیاءِ اسلامی کے جذبات کا جنم لینا کچھ عجب نہیں۔ اسی کیفیت کے تحت شاعر کا سلسلۂ خیال اندلس میں احیاءِ اسلامی کی طرف مُڑ جاتا ہے۔ یورپ کے متعدد انقلابات کی تاریخ اقبال کے ذہن میں تازہ ہے، وہ اس پس منظر کے ساتھ ہسپانیہ میں اسلامی احیاء کی اہمیت و امکانات پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ یہ سلسلۂ خیال نظم کے آخری دو بندوں میں جاری ہے۔

سلسلۂ خیال کے اس موڑ پر خطاب کا رُخ مسجدِ قرطبہ (جو نظم کا اصلی اور مرکزی موضوع ہے) کی طرف ہے۔ پہلے دو شعر شدید فکر و اضطراب اور بے مثال حسرت بھری تمنّا کا مرقع ہیں۔ ہسپانیہ کی صدیوں سے بے اذاں فضا کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کا جگر کٹ رہا ہے۔ دل الم سے کباب ہے۔ احیاءِ اسلامی کی تمنّا اس سوال کا روپ دھار لیتی ہے۔ "تجدید و احیائے ملت کا قافلہ کن مراحل کو طے کر رہا ہے"؟ دوسرے شعر سے احیاءِ اسلامی کے لئے شاعر کی بے چینی، فکر اور اس کا اضطراب ٹپکا پڑتا ہے۔

ساتھ ہی وہ تجدید و احیاء کے امکانات کا جائزہ لے رہا ہے۔ ممکنات پر غور کرتے ہوئے یورپ کے انقلابات اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔

اقبال سمجھتے ہیں کہ اگر جرمن پادری مارٹن لوتھر کی اصلاحِ مذہب

کی تحریک (   ) کامیاب ہو سکتی ہے[1] انقلاب فرانس، فرانسیسیوں کی کایا پلٹ سکتا ہے اور اٹلی کو مسولینی کی قیادت میں عظمت و برتری حاصل ہو سکتی ہے[2] تو پھر مسلمانوں کے لئے تجدید ملت و احیائے دین بھی ممکن ہے ـــــ اس کے بعد وہ تجدید و احیا کے امکانات

---

[1] عیسائیوں کے مذہبی پیشوا پاپائے روم نے سولھویں صدی میں کلیسا کو ایک ایسا ادارہ بنا دیا تھا جو مذہب کے نام پر ہر طرح کی جائز و ناجائز کارروائیاں کرنے کا عادی تھا کلیسا عقل کا دشمن تھا اور کسی شخص کو اجازت نہیں تھی کہ وہ پوپ کی حماقتوں پر اعتراض کر سکے۔ حتیٰ کہ اس نے نجات کے ایسے پروانے جاری کئے جو قیمتاً فروخت کئے جاتے تھے اور جن جن کے متعلق پوپ کا اعلان تھا کہ انہیں خریدنے والا جنتی ہوگا۔ یہ ایک طرح کی برہمنیت تھی جس کے خلاف سب سے بڑا جرمنی کے ایک عالم اور پادری ڈاکٹر مارٹن لوتھر نے علم احتجاج بلند کیا۔ عوام کے دلوں میں پاپائیت کے خلاف پہلے ہی نفرت موجود تھی۔ چنانچہ لوتھر کی تحریک بہت مقبول ہوئی اور پوپ کے مخالفین کا ایک مستقل فرقہ بن گیا۔ جو پروٹسٹنٹ کہلانے لگے۔ عیسائی دنیا میں ان کی اکثریت ہے۔ پوپ کے پیروکار کیتھولک کہلاتے ہیں۔

[2] مسولینی ۱۸۸۲ء میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ بڑے ہو کر اس نے اٹلی کی ترقی و عروج کے لئے ۱۹۱۹ء میں ایک تحریک چلائی جسے فاشزم کا نام دیا (باقی بر صفحہ ۳۹۸)

کی عملی صورت بھی بتاتے ہیں ــــ یہ عملی صورت اقبالؔ کے طویل غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

تقریب یہ ہے کہ اقبال دریائے وادالکبیر کے کنارے کھڑے احیاءِ اسلامی کی فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ غروب آفتاب کا وقت قریب ہے۔ کوئی دیہاتی لڑکی گیت گاتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا گیت پُر تاثیر اور آواز پُر سوز ہے[2]

---

[1] آٹھویں بند کے پہلے دو شعر پڑھتے ہوئے شکسپیر کی ایک نظم ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔

بقیہ فٹ نوٹ از صــــ گیا۔ فاشسٹ قومی مفاد کے لیے ہر قسم کی فوجی کارروائیوں، جنگ اور تشدد و قوت کے استعمال پر یقین رکھتے تھے مسولینی پہلے اٹلی کا وزیر اعظم بنا، پھر آمرِ مطلق ــــ مسولینی کی تحریک کے بہت سے منفی پہلو بھی تھے۔ مگر اقبال فاشزم کی انقلابی روح سے متاثر تھے، جس کا اظہار انھوں نے "بالِ جبریل" کی نظم "مسولینی" میں کیا ہے۔ یورپ جاتے ہوئے انھوں نے اٹلی اٹلی کی انقلابی تحریک کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو! = جہاز پر سے ہم تمھیں سلام کرتے ہیں

مسولینی نے دوسری جنگِ عظیم میں ہٹلر کا ساتھ دیا۔ مگر شکست کھا کر ۱۹۴۵ء میں خودکشی کر لی۔

(یہاں شاعر نے ضمنی طور پر بتایا ہے۔ کہ عہدِ شباب میں جذبات پر قابو پانا آسان کام نہیں۔ جوانی کے تقاضے، قلبی احساسات کے بلے سیلاب کا درجہ رکھتے ہیں) مسلمانوں کی عظمت و شوکت، ان کا عبرت ناک زوال، یورپ پر مسلمانوں کے احسانات اور یورپ کی احسان فراموشیاں ــــ ان سب چیزوں کی یاد اقبال کے قلب و ذہن کو جذبات کا محشرستان بنائے ہوئے ہے۔

وہ بہر حال مسلمانوں کے روشن مستقبل سے مایوس نہیں ـــــ دریائے وادالکبیر کے کنارے کھڑے ہوئے ہسپانیہ میں ایک بار پھر احیاء اسلامی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ مگر ان کے خیال میں خواب کی تعبیر اُسی وقت سامنے آسکتی ہے جب مسلمان زمانے کے میزان میں اپنے اعمال کا حساب کریں اور کشمکشِ حیات میں اپنے آپ کو اپنے مطلوبہ مرتبے و مقام کا اہل ثابت کریں۔

نظم کے آخری تین اشعار اُن خیالات کی بازگشت ہیں جو نظم کے سب سے پہلے بند میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ نظم کے موضوعات و مطالب کا حاصل ہیں اور اس کے ساتھ ہی فکرِ اقبال کا غالباً اہم ترین نکتہ بھی۔ کہ :۔

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا یہی راز تھا، مسجدِ قرطبہ کے جلال و جمال کی بنیاد بھی یہی ہے اور مسلم نشاۃِ ثانیہ کے امکانات بھی اسی

میں پوشیدہ ہیں ۔

فنی تجزیہ

"مسجدِ قرطبہ" ترکیب بند ہیئت کے آٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ بحر کا نام منسرح مثمن مطوی موقوف مکسوف ہے ۔ اس کا وزن اور ارکان یہ ہیں :-

مفتعلن ۔ فاعلن ۔ مفتعلن ۔ فاعلات

دوسری طویل نظموں کے برعکس "مسجدِ قرطبہ" کی انفرادیت یہ ہے کہ اقبال نے اس نظم میں حسنِ ظاہری اور پابندیٔ روش کی خاطر ہر بند کے اشعار کی تعداد برابر (سات سات) رکھی ہے۔

نظم کا موضوع جس قدر عظیم اور رفیع الشان ہے اس کا فنی پیرایہ بھی اسی قدر حسین و جمیل ہے۔ "مسجد قرطبہ" کا تقدّس، اس کی رفعت و پاکیزگی اور جلال و جمالِ اقبال کی اس نظم کی صورت میں مجسّم ہو کر ہمارے سامنے آگیا ہے۔ اسے پڑھ کر جہاں قاری کے دل و دماغ پر مسجد قرطبہ کی شوکت و سطوت کا نقش دل پر بیٹھتا ہے، وہاں یہ نظم ایک ایسا معجزۂ فن معلوم ہوتی ہے، جس کی تکمیل اقبال نے خونِ جگر کے ذریعے کی ہے۔

ایجاز و بلاغت

"مسجدِ قرطبہ" ۱۹۳۳ء میں لکھی گئی ۔ یہ دورِ اقبال کے فکر و فن کی پختگی کا دور ہے۔

اس لئے نظم اقبال کے فن کا ایک عظیم الشان شاہکار ہے ـــــــ
پوری نظم، نظم کا ہر بند، ہر بند کا ایک ایک شعر اور مصرع اور ایک ایک ترکیب ایجاز و بلاغت اور جامعیت کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ اس نظم میں اقبال نے بہت سے اہم نظریات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ مثلاً نظریہ عشق، نظریہ فن، مردِ کامل وغیرہ۔ مگر کمالِ فن یہ ہے کہ بڑے اختصار کے ساتھ گِنے چُنے الفاظ کے ذریعے متعلقہ موضوع کو اس کی پوری جزئیات و تفصیلات سمیت بیان کر دیا گیا ہے ـــــ کائنات کے ازلی و ابدی حقائق دُنیا کی تاریخی صداقتوں اور زندگی کے نفسیاتی مسائل کو اس بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ کہ کہیں پیچیدگی اور الجھن کا احساس نہیں ہوتا۔

چند مثالیں :-

ـــہ عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

ع ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

ع ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

ع تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل

ع دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں

اسی طرح کعبۂ اربابِ فن، حاملِ خلقِ عظیم، عصمتِ پیرِ کنشت، قافلۂ سخت جاں جیسی ترکیبوں میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے۔

تنوّع موضوع اور لب و لہجہ ــــــ دونوں لحاظ سے "مسجدِ قرطبہ" میں تنوّع پایا جاتا ہے۔

بظاہر نظم کا موضوع قرطبہ کی عالی شان جامع مسجد ہے۔ مگر جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہُوا، نظم میں اقبال نے بہت سے نظریات و موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ مثلاً :-

(ا) نظریاتِ زمان و مکان، عشق، فن اور مردِ کامل۔

(ب) مسجدِ قرطبہ کی عظمت و رفعت اور حسن و پاکیزگی۔

(ج) یورپ کے بعض فکری اور سیاسی انقلابات۔

(د) مُسلم ہسپانیہ کی عظمت اور یورپ پر مسلم تمدّن کے اثرات

(ھ) ملّتِ اسلامیہ کے احیاء کے امکانات

شاعر نے ضمنی طور پر بعض چھوٹے اور غیر اہم موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا ہے ــــ نظم کا لب و لہجہ بھی متنوّع ہے ــــ نظم کے پہلے بند کا لہجہ فلسفیانہ ہے۔ وہ حصّے جن میں شاعر نے مسجد قرطبہ کی عظمت، مسلمانوں کی شوکتِ رفتہ اور اسپین کے مُسلم حکمرانوں کا ذکر کیا ہے، تأسف، درد مندی اور سوز و گداز سے لبریز ہیں ــــ جہاں مردِ مومن کی صفات اور عشق کی تخلیقی قوّت کا بیان ہوا ہے وہاں شاعر نے ایک مفکّر کا حکیمانہ

لہجہ اختیار کیا ہے ـــــ آخری بند کے اس حصے میں، جہاں شاعر مستقبل کا خواب دیکھ رہا ہے، اس کا لہجہ قدرے پُرجوش اور پیغمبرانہ ہے۔

فارسیت

"مسجدِ قرطبہ" ۱۹۳۲ء کی یادگار ہے۔ ایک سال پہلے "جاوید نامہ" منظرِ عام پر آئی تھی۔ اس سے پہلے ۱۹۲۷ء میں "زبورِ عجم" شائع ہوئی تھی ـــ گویا یہ وہ دور تھا جب اقبال اپنے افکار و خیالات کا اظہار زیادہ تر فارسی میں کر رہے تھے۔ اسی لئے "مسجدِ قرطبہ" میں فارسی کا اثر نمایاں ہے۔ انھوں نے "دُعا" کے عنوان سے جو نظم مسجدِ قرطبہ میں بیٹھ کر لکھی (بالِ جبریل ص ۱۲۳) اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے ـــــ "مسجدِ قرطبہ" کے بعض مکمل مصرعے فارسی میں ہیں۔

ع سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ

ع سلسلۂ روز و شب صیرفیٔ کائنات

ع کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مبین

ع ساقیٔ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق

ع خوش دل و گرم اختلاط، سادہ و روشن جبین

٭

ع خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات

اور ایسے مصرعے تو کثرت سے ہیں جن میں حرف، یا امدادی فعل، یا ایک آدھ لفظ کے سوا پورا مصرعہ فارسی میں ہے۔

ع سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں

٭

ع تیرا منارِ بلند، جلوہ گہِ جبرئیل

٭

ع عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

٭

ع ملّتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر

٭

ع روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب

غنائیت

"مسجدِ قرطبہ" میں بعض اشعار اور مصرعوں میں مختلف تراکیب، الفاظ اور حروف کی تکرار، قوافی کے استعمال سے صوتی نغمگی اور خوش آہنگی کا سبب بنے ہیں۔ مثلاً ع:

اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا ــــــ میں "فنا" کی تکرار ــــ
آخر اور ظاہر کے قافیوں اور 'ر' کی آواز سے پیدا ہے

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

اس شعر میں لفظ "حیات" کی تکرار اور "ر" کا صوتی آہنگ پایا ہے؛

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت ــــ

میں رگ، "تارِ حریرِ دو رنگ" میں 'ر' کا صوتی آہنگ ــــ ہے؛
اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب ــــ میں 'زمانے' اور
'فسانے' کے قافیے اور باقی الفاظ کی تکرار ــ
اس ضمن میں جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں! ــ

" اس نظم کا ہر بند غیر مردّف اشعار پر مشتمل ہے اور ٹیپ کا ہر
شعر مردّف ہے خدا جانے یہ محض اتّفاق کی بات ہے یا التزام ہے
جو شاعر کے نغمہ آشنا احساس نے برقرار رکھا ہے۔"

دیگر محسناتِ نظم | (۱) تشبیہات و استعارات

سید عابد علی عابد نے شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن کے حوالے سے لکھا ہے کہ تشبیہ اور استعارہ اگر توضیح مطلب کا فریضہ ادا کرے تو کمال صنعت گری ہے......... اقبال کے کلام میں اکثر بیشتر تشبیہات و استعارات کے استعمال کا مقصد محض آرائش کلام نہیں بلکہ توضیح معانی ہے ــــــــ اقبال نے عشق کو دمِ جبرئیل، دلِ مصطفےٰ، خدا کا رسول، خدا کا کلام، فقیہہ حرم اور امیر جنود قرار دیا ہے ــــــ ظاہر ہے کہ یہ استعارات صنعت گری کے عمدہ نمونے ہی نہیں بلکہ اصلیت و حقیقتِ عشق کو بھی الم نشرح کرتے ہیں۔ ان استعارات کے ذریعے عشق کی ایسی وضاحت ہوتی ہے، جو شاید کسی طویل تقریر یا مضمون سے بھی نہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں دوسرا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ نظم کے پہلے بند میں اقبال نے سلسلۂ روز و شب کے لئے چند استعارے استعمال کئے ہیں مثلاً وہ نقش گرِ حادثات ہے، حیرئی کائنات ہے، سازِ ازل کی فغاں ہے، تارِ حریرِ دو رنگ ہے، زمانے کی رو ہے وغیرہ ــــــــ زمانہ ایک غیر مادی اور تصوراتی چیز ہے۔ مگر اقبال نے ان استعارات کے ذریعے زمانے کو ہمارے محسوسات و مشاہدات کے دائرے میں لے آیا ہے۔ سید عابد علی عابد نے اس پہلو کے بارے میں لکھا ہے "جب وہ (اقبال) دقیق تعقلات باریک تصورات اور لطیف افکار و اسرار کو توضیح کرنا چاہتے ہیں تو

ایسی ایسی خوبصورت تشبیہیں اور استعارے استعمال کرتے ہیں کہ اَن دیکھی چیزیں دیکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں" [۱]

ع عرشِ معلّٰے سے کم سینۂ آدم نہیں

بھی اسی طرح کی ایک عمدہ مثال ہے۔

(ب) صنائع بدائع "مسجد قرطبہ" میں صنعتیں اتنی خوبی اور خوب صورتی سے کھپی ہوئی ہیں کہ اُن کا وُجود بالکل فطری معلوم ہوتا ہے۔ اور اس میں کسی بناوٹ یا تصنع کا شائبہ بھی محسوس نہیں ہوتا۔

۱۔ صنعتِ تلمیح: ع:

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں

ع: چشمِ فرانسیسی بھی دیکھ چکی انقلاب

ع: حاملِ "خُلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقیں

ع: ہاتھ اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

۱۔ "شعرِ اقبال"۔ لاہور ۱۹۶۴ء ص ۵۳۴

ع: ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

⁂

۲۔ صنعتِ ترافق۔ ؎

عشق کے مضراب سے ہے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

⁂

ع: بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

⁂

۳۔ صنعتِ تجنیس لاحق ؎

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

⁂

۴۔ صنعتِ ردالعجز علے الحشو ؎

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

⁂

۴۔ صنعتِ طباق ایجابی سے

اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

ج) **محاکات** (IMAGERY) "مسجدِ قرطبہ" کے بعض اشعار محاکات کی عمدہ مثال ہیں۔ مثلاً

تیری بنا پائیدار تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل

⁂

اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل

⁂

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

⁂

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

⁂

مجموعی قدر و قیمت

جگن ناتھ آزاد نے "اقبال کی شاعری" سے بحث کرتے ہوئے ایک جگہ اُن کی شاعری اور خالص شاعری کے ذکر کو غزل کے بجائے نظم پر ختم کرتے ہوئے "مسجد قرطبہ" کے فن کارانہ اسلوبِ بیان اور اس کے شاعرانہ حُسن و جمال کی جیسی بھرپور داد دی ہے، نقدِ اقبال میں اس کی غالباً کوئی دوسری مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"یہ نظم صرف اقبال ہی کا شاہکار نہیں۔ بلکہ ساری اُردو شاعری کا شاہکار ہے۔" اُردو شاعری میں اس نظم کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا تو بھی ہماری شاعری دُنیا کی صفِ اوّل کی شاعری میں ایک ممتاز مقام حاصل کر سکتی تھی۔ "مسجدِ قرطبہ" شعریت، رومانیت، حقیقت پسندی، رمزیت اور ایمائیت کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے کہ ہماری ساری اُردو شاعری روزِ اوّل سے آج تک اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے ——

مجھے اپنی زندگی میں دو لاکھ بیاسی ہزار نو سو بیس مربع فٹ کے رقبے میں بنی ہوئی اس عظیم الشان مسجد کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہُوا

اور تصور میں اس مسجد کے جلال وجمال کا اندازہ کرنا آسان بھی نہیں ہے .... اگر مجھے ہسپانیہ کی اس مسجد کو دیکھنے کا موقع ملے تو شاید اس وقت بھی میں یہ فیصلہ نہ کرسکوں کہ ہسپانیہ کی مسجدِ قرطبہ زیادہ جلیل وجمیل ہے یا "بالِ جبریل" کی مسجدِ قرطبہ ——!" [1]

---

[1] نگار پاکستان (کراچی) اقبال نمبر، ۱۹۶۲ء، ص ۱۷

اپنے اس اظہارِ خیال کے بعد جگن ناتھ آزاد ہسپانیہ جاکر اس مسجد کی زیارت کر آئے ہیں۔ لہٰذا اردو دنیا اس وقت آزاد صاحب سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ ہسپانیہ کی مسجدِ قرطبہ کے پس منظر میں اقبال کی "مسجدِ قرطبہ" کا فنی جائزہ ایک مقالے کی صورت میں عطا کریں۔

(محمد امین بچھ)

(کتابت: سید نورالدین کاملی)

فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو

(جلدِ دوم)

مرتبہ: جگن ناتھ آزاد

"فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو" کی جلدِ اوّل اِس وقت قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ قارئینِ کرام اس کتاب میں مندرج ابواب کے عنوانات اور ان ابواب کے مصنّفین کے ناموں ہی سے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین ہماری اس کوشش کو پسند فرمائیں گے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد "فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو" کی دوسری جلد بھی مرتب کر چکے ہیں اور وہ اِس وقت کتابت کی منزلوں میں ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہم یہ دوسری جلد جو جلدِ اوّل کا دوسرا حصّہ بھی ہے۔ اور پہلی جلد کی طرح اپنی جگہ پر ایک الگ اور مکمل کتاب بھی ہے۔ بہت جلد قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کر سکیں گے۔

شیخ غلام محمد بک سیلرز اینڈ پبلشرز۔ مائسمہ بازار سرینگر (کشمیر)

ہماری معیاری کتابیں

اقبال کے آخری دو سال ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی	زبان اور کلچر ڈاکٹر شکیل الرحمٰن	غالب کے رومان ڈاکٹر عارف بٹالوی	سماجی شاعری ڈاکٹر عزیز احمد
غالب ادیبوں کی نظر میں ظفر اقبال	دستِ فکر ڈاکٹر شکیل الرحمٰن	ناٹک کتھا صاحبزادہ محمد عمر	اقبال ادیبوں کی نظر میں ظفر اقبال
مناظر قدرت کی عکاسی ڈاکٹر عزیز احمد	سلطان زین العابدین ڈاکٹر شکیل الرحمٰن	لا - انسان ن - م - راشد	طریقہ تعلیم اُردو محمد مظفر
شعور اور تنقیدی شعور ڈاکٹر شکیل الرحمٰن	جدید تنقیدی زاویے ڈاکٹر عزیز احمد	معلم ماضی و حال کے آئینے میں عبدالغنی نسیم	طریقہ تعلیم سائنس محمد مظفر
نفسیات اور اصول تعلیم نورالدین	کشمیر میں آبپاشی عبدالرحمٰن میر	ہماری قومی اور انقلابی شاعری ڈاکٹر عزیز احمد	طریقہ تعلیم حساب محمد مظفر
مجموعہ کلام اقبال مع شرح تصویر درد، شکوہ جواب شکوہ	سماجی تعلیم نورالدین	ہندوستان کی مختصر تاریخ محمود احمد	طریقہ تعلیم سوشل سٹڈی محمد مظفر
جدید شاعری کے نئے چراغ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن		رابندر ناتھ ٹیگور کا رومانوی ذہن ڈاکٹر شکیل الرحمٰن	

شیخ غلام محمد اینڈ سنز بکسیلرز، مائسمہ بازار، سری نگر (کشمیر)